تذکرہ

اسلاف واکابر رحمۃ اللہ علیہم

تالیف

مولانا محمد عبدالقوی
ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

سلسلۂ مطبوعات
برکات بکڈپو Barakaath Book Depot
۶۲

ناشر
برکات بکڈپو Barakaath Book Depot

تفصیلاتِ طباعت

نام کتاب : تذکرۂ اسلاف واکابر رحمۃ اللہ علیہم

تالیف : حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہٗ

صفحات : ۳۰۴

طباعت وسرورق : البلاغ گرافکس، حیدرآباد **9441025508**

قیمت **200/-**

ناشر : برکات بکڈپو، خواجہ باغ کالونی، سعیدآباد، حیدرآباد

ملنے کے پتے

مکتبہ فیض ابرار، نزد مسجد اکبری، اکبرباغ، حیدرآباد۔ ۳۶ **040-65709415**

ادارہ اشرف العلوم خواجہ باغ، سعیدآباد حیدرآباد۔ ۵۹ **040-24070681**

فیضی کتب خانہ، نزد مدرسہ فیض العلوم، سعیدآباد، حیدرآباد **9849766790**

مکتبہ کلیمیہ، یوسفین چوراہا، نام پلی، حیدرآباد، **9885655591**

مدرسہ خیرالمدارس، چودھری نگر، لاتور، مہارشٹرا **09421956690**

فہرست عناوین

	تقدیم	۵

باب اول ــــــــ بعض اسلاف کرام

۱	ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرات حسنین کرام رضی اللہ عنہما	۸
۲	حکیم ھذہ الامۃ حضرت ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ	۱۷
۳	سیدنا الامام الاعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ	۲۵
۴	ناصر اہل السنہ امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ	۳۶
۵	پاسبانِ توحید وسنت، دشمن رسوم وبدعت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ	۴۰
۶	علامہ ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ	۴۶

باب دوم ــــــــ بعض اکابر اہل عصر

۷	حضرت مولانا محمد یوسف بستوی رحمۃ اللہ علیہ	۵۱
۸	حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ	۵۴
۹	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ	۶۶
۱۰	حضرت مولانا یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	۷۲
۱۱	فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ	۷۷
۱۲	ڈاکٹر رفیق احمد بلگرامی کے ساتھ ایک مجلس	۸۲
۱۳	حضرت جی مولانا انعام الحسن رحمۃ اللہ علیہ	۹۱

۱۴	استاذِ محترم حضرت سید قادر معظم شہید رحمۃ اللہ علیہ	۹۵
۱۵	حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ	۱۲۸
۱۶	محترم عابد بھائی صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۴۱
۱۷	حضرت مولانا محمد فاروق مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ	۱۴۴
۱۸	حضرت حاجی عبد الستار صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۴۸
۱۹	محترم نواب باقر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۶۰
۲۰	حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۶۶
۲۱	حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۹۱
۲۲	حضرت سید عشرت جمیل میر صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۲۲۷
۲۳	حضرت قطب الدین ملا صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۲۳۹
۲۴	حضرت حافظ عبد المعز صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۲۴۲
۲۵	حضرت مولانا عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۲۴۵

باب سوم ______ بعض احباب واعزہ

۲۶	جناب الحاج محمود بھائی مرحوم	۲۸۲
۲۷	محترم الحاج رشید بھائی مرحوم	۲۸۵
۲۸	عزیزم مولوی طیب مرحوم	۲۹۷
۲۹	جناب مصطفیٰ شریف صاحب مرحوم	۳۰۰

تقدیم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم امابعد!

اس عاجز پر اللہ کے افضال ونوال میں سے ایک عظیم فضل یہ ہے کہ اس نے اس عاجز کو شعور آنے کے بعد ہی سے سلف صالحین اور اکابرین سے عقیدت ومحبت نصیب فرمائی، انہیں پڑھنے سمجھنے اور ان کا ذکر خیر کہنے اور سننے میں ایسی دلچسپی اور لذت عطا فرمائی کہ بیان سے باہر ہے؛ اُن بزرگوں سے کسبِ فیض اور جذبِ تقویٰ میں تو شائد سب سے پیچھے ہوں مگر اُن سے تعلق ومحبت بفضلہٖ تعالیٰ سچی رکھتا ہوں، اسی وجہ سے مختلف مواقع پر بعض اکابر اسلاف ومعاصر سے متعلق خامہ فرسائی کی توفیق بھی نصیب ہوتی رہی، بالخصوص ادارے کے ترجمان ''اشرف الجرائد'' میں وقتاً فوقتاً اکابر سے متعلق مضامین لکھتا رہا؛ جن میں سے بعض اکابر گذشتہ زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض حالیہ دور سے، پھر ان میں سے بعض کا تذکرہ تاریخ کی روشنی میں کیا ہے اور بعض کا شخصی تعلق اور ذاتی تجربات ومشاہدات کے حوالے سے لکھا ہے۔

عزیز مکرم مولانا خواجہ نصیر الدین سلمہٗ مدرس عربی ادارہ اشرف العلوم میرے مضامین کو ''اشرف الجرائد'' کی فائلوں سے جمع کرنے کا کام کرتے رہتے ہیں، دو جلدیں سابق میں مرتب کرکے شائع کرواچکے ہیں اور اب اس کتاب میں اُن مضامین کو جمع کر دیا ہے جو شخصیات اور سوانح سے متعلق تھے؛ اس طرح متعدد اکابر کے حالات یکجا ہوگئے اور استفادہ میں سہولت ہوگئی ہے؛ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، اور اس کتاب کو ناظرین وقارئین کے حق میں نافع بنائے، اور قیامت کے دن ہم سب کو اپنے نیک بندوں کے ساتھ محشور فرمائے۔ آمین۔ وصلى الله على النبي الكريم۔

محمد عبد القوی غفرلہٗ

شنبہ ۲۹ رشعبان ۱۴۳۶ھ م ۱۵ راگست ۲۰۱۵ء

باب اول

بعض اسلاف کرام

ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سیدنا وسید شباب اہل الجنۃ حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی ولادت باسعادت ۴/ شعبان ۶ ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی (۱) ان کے نانا امام الانبیاء محبوبِ کبریا حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے کانوں میں اذان کہی، اور تحنیک فرمائی، (۲) ان کے والد سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کا اسم گرامی ''حرب'' تجویز کیا تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بدل کر ''حُسین'' رکھا، (۳) (ان کے بڑے بھائی کا نام بھی آپ نے بدل کر حسن رکھا تھا اور چھوٹے بھائی کے لئے محسن تجویز فرمایا تھا) ان مبارک ناموں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ نام اہل جنت کے ہیں، اس سے قبل جاہلیت میں یہ اسماء رائج نہیں تھے۔ نیز ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے بچوں کے وہ نام رکھے جو ہارون علیہ السلام نے اپنے بچوں کے رکھے تھے۔ (۴)—— کہتے ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کے بچوں کے نام شبر، شبیر، اور مبشر تھے انہی کا ترجمہ عربی میں حسن، حُسین، اور محسن ہے۔ (۵)—— حضرت حسین رضی اللہ عنہ بڑے ہی حسین وجمیل تھے، جسامت میں سینہ سے نچلے حصہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ مشابہ تھے۔ (۶) ولادت سے قبل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ام فضل رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم مبارک سے گوشت کا ایک ٹکڑا جدا ہوا اور ان کی گود میں آ گرا، صبح کو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ مبارکہ میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ! آج رات میں نے عجیب حیرت انگیز خواب دیکھا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: کیا دیکھا؟ کہنے لگیں: بیان سے باہر ہے پوچھا آخر کیا؟ اس پر انہوں نے مذکورہ خواب سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اچھا خواب ہے ان شاء اللہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں لڑکا ہوگا اور تمہاری گود میں ڈالا جائیگا، یہ تمہارے

خواب کی تعبیر ہے" فرماتی ہیں کہ جب حضرت فاطمہؓ کے یہاں حضرت حُسینؓ کی ولادت ہوئی تو وہ میرے گود میں ڈالے گئے، یعنی بعینہٖ تعبیر سامنے آئی۔ ایک دن وہ حضرت حُسینؓ کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوئیں تو ان کو اپنی گود میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گود میں ڈال دیا، کچھ دیر کے بعد جب انہوں نے آپ کی طرف توجہ کی تو کیا دیکھتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چشم ہائے مُبارک آنسو بہار ہے ہیں، یہ دیکھ کر کہنے لگیں: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ ارشاد فرمایا: جبرئیلؑ میرے پاس آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بہت جلد میری اُمت میرے اس بچہ کو قتل کر دے گی، میں نے حیرت سے پوچھا: اس بچے کو؟ کہا: ہاں۔ (۷)

حدیثِ مذکور سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت حسینؓ سے کس قدر تعلقِ خاطر تھا، ایک تو ان کے وجود ہی کو جسمِ مبارک کے ایک قطعہ سے تعبیر کیا گیا، پھر ان پر آنے والی مصیبت کی اطلاع آپ کے لئے اس قدر تکلیف کا سبب ہوئی کہ دل بھر آیا، آنکھیں بہہ پڑیں۔ سبحان اللہ!

اسی تعلقِ خاطر کا اظہار آپ نے مختلف موقعوں پر مختلف عنوانات سے کیا ہے چنانچہ ایک دفعہ ارشاد فرمایا: "حسین مجھ سے ہے میں حُسین سے ہوں، اللہ اس سے محبت کرے جو حسین سے محبت کرتا ہو" (۸) ایک دفعہ دونوں بھائیوں کو گود میں اٹھا کر فرمایا: "اے اللہ! میں ان بچوں سے محبت کرتا ہوں آپ بھی ان سے محبت کیجئے"۔ (۹) کبھی فرمایا "اے اللہ ان پر رحم فرمائیں بھی ان پر بہت مہربان ہوں" (۱۰) کسی وقت فرمایا: "حسن اور حسین دونوں میری دنیا کے پھول ہیں" (۱۰) اسی طرح جب آیتِ مباہلہ نازل ہوئی آپؐ نے حضرت علیؓ، فاطمہؓ حسن اور حسینؓ کو بلایا اور فرمایا: "اے اللہ! یہ لوگ میرے گھر والے ہیں: (۱۱) اسی طرح کا واقعہ آیتِ تطہیر کے نزول کے وقت بھی احادیث میں مروی ہے (۱۲) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کو اپنے اہل بیت میں سب سے زیادہ محبت کس سے ہے؟ فرمایا: "حسن اور حُسین" سے۔ (۱۳) جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان حضرات کی محبت زبانِ مبارک سے بیان فرمائی ہے، اسی طرح تعلق وتعامل سے بھی واضح

فرمایا ہے، چنانچہ اکثر حضرت فاطمہؓ سے فرماتے میرے بچوں کو بلاؤ پھر انہیں گود میں لے کر پیار سے سونگھتے اور فرطِ محبت سے چمٹا لیتے تھے(۱۴) حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم لوگوں سے خطاب فرمارہے تھے، دریں اثنا کیا دیکھتے ہیں کہ حضراتِ حسنینؓ سرخ دھاری دار جبّے پہنے ہوئے ادھر نکل آئے، یہ جبّے ان کی کمسنی کی وجہ سے سنبھل نہیں پارہے تھے اس لئے لٹک رہے تھے آپ کو خیال ہوا کہ یہ لوگ کہیں گر نہ جاویں، فوراً منبر پر سے اترے اور انہیں گود میں اٹھا کر لائے، اپنے سامنے بٹھالیا اس کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا ہے ''بلاشبہ تمہارے اموال واولاد آزمائش (کا ذریعہ) ہیں'' میں نے ان بچوں کو دیکھا کہ دوڑ رہے ہیں اور کپڑا لٹک رہا ہے مجھ سے رہا نہ گیا تو اپنی بات ادھوری چھوڑ کر انہیں اٹھالا یا کہ کہیں گر نہ پڑیں"۔(۱۵)

حضرت اُسامہ ابن زیدؓ سے مروی ہے کہ میں کسی ضرورت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکان پر رات کے وقت حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے تو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی چیز اپنے کپڑے میں چھپائے ہوئے ہیں، مجھے نہیں معلوم ہو پارہا تھا کہ کیا ہے، جب میرے آنے کی غرض پوری ہوگئی تو میں نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ آپ کی چادر میں کیا ہے؟ آپ نے چادر کھول کر دکھایا تو اس میں حسن اور حسین آپ سے لپٹے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ میرے نواسے ہیں اور فاطمہ کے بیٹے ہیں، اے اللہ! میں ان کو پسند کرتا ہوں آپ بھی انہیں پسند فرمائے اور جو ان سے محبت رکھے انہیں بھی پسند فرمائے"(۱۶)

حضرت زید ابن ارقمؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ حسنین کرام اور ان کے والدینِ ذی احترام (علیؓ وفاطمہؓ) کے حق میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:" جو ان سے لڑے میں اُن سے لڑوں گا اور جو ان سے صلح کرلے میں اس سے صلح کرلوں گا"۔(۱۷) ان کے علاوہ بھی بہت سے فضائل ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی نسبت ونسب کے کمال و بزرگی اور شرافت وکرامت کیلئے یہی کیا کم ہے کہ وہ جگر گوشۂ رسول فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا کے صاحبزادۂ محترم ہیں۔

مگر اسلام میں چونکہ کسی کے لئے بھی نسبتِ ظاہری بغیر صفاتِ باطنی اور اتصافِ ایمانی کے باعثِ فضیلت ہرگز نہیں سمجھی جاتی کہ۔

اندریں رہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ (۱۸)

قرآن مجید میں ہے اور لا فضل لعربی علی عجمی و لا لابیض علی اسود الا بالتقویٰ (۱۹) خود شارع علیہ السلام کا اعلان ہے، چنانچہ سیدنا نوح علیہ السلام کے صاحبزادے کنعان کو نبیٔ برحق سے نسبت پدری رکھنے کے باوجود حق جل مجدہٗ نے لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۚ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ کہہ کر رد فرمادیا تھا (۲۰) اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ اور عزیز ترین پھوپی حضرت صفیہؓ سے انقذا انفسکما من النار انی لا اغنی عنکما من اللہ شیئاً فرما کر اس بات سے خبردار کردیا تھا کہ آخرت میں محض قرابت نسبی سے کام نہیں چلے گا۔ (۲۰) اس لئے اب ہم سیدنا حضرت حُسینؓ کے سیرت و کردار کی طرف چلتے ہیں، آیئے! دیکھیں دنیائے حسب ونسب اور اقلیم کمال و جمال کا یہ تاجدار سیرت وکردار، اخلاق واقدار، ایمان واعمال اور ورع وتقویٰ میں کس قدر بلند مقام کا حامل ہے۔

فضائل ومناقب

✷ حضرت حذیفہؓ ایک طویل واقعہ کے ذیل میں فرماتے ہیں: پھر مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یہ ایک فرشتہ ہے جو زمین پر پہلی دفعہ آیا ہے اس سے قبل کبھی نہیں آیا تھا، اس نے پروردگار سے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملوں اور انکو یہ خوشخبری سناؤں کہ آپ کی بیٹی فاطمہ خواتینِ جنت کی سیدہ اور آپ کے نواسے حسن وحسین نوجوانانِ بہشت کے سردار ہیں۔ (۲۱)

فائدہ: مرقاۃ المفاتیح میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعدد مطلب بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ اس وقت جتنے نوجوان جنتی ہیں یہ دونوں ان سب کے سردار ہیں، دوسرے یہ

کہ اللہ کے راستے میں جتنے نوجوان شہید ہوئے ہیں یہ ان سب میں افضل ہیں، تیسرے یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام خلفاء راشدینؓ کے علاوہ تمام جنتیوں کے سردار ہیں۔ واللہ اعلم (۲۲)

٭ محمد بن علی بن حسینؒ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسن و حضرت حسین، حضرت ابن عباس، اور حضرت ابن جعفر رضی اللہ عنہم سے ایسے وقت بیعت لی جب کہ وہ ابھی بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے، (۲۳) ان کے چہروں پر داڑھی بھی نہیں نکلی تھی، ان کے علاوہ کسی صحابی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ حق پرست پر اس قدر کم سنی میں بیعت کی ہو۔ (۲۴)

٭ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک روز کعبۃ اللہ کے سایہ بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں حضرت حسینؓ تشریف لے آئے۔ انھیں دیکھ کر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: یہ شخص اہل آسمان کے نزدیک اس زمانہ کے تمام اہلِ زمین سے افضل ہے (۲۵)

٭ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے، جب آیت قرآن: "قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط" نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے سوال کیا: یارسول اللہ! آپ کے اہلِ قرابت سے مراد کون لوگ ہیں جن کی مودت ہم سے طلب کی گئی ہے، اور اسے ہم پر لازم قرار دیا گیا ہے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "علیؓ، فاطمہؓ اور ان کے بچے (حسن اور حسین)(۲۷)

٭ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے مجھ سے محبت کی اور ان دونوں (حضرات حسنینؓ) اور ان کے والدین (حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ) سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا (۲۷)

٭ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ سے فرمایا: میں اور تم حسنؓ اور حسینؓ اور یہ سونے والا (حضرت علیؓ جو اس وقت وہاں سو رہے تھے) قیامت کے دن ایک ہی مقام پر ہوں گے۔ (۲۹)

شمائل وخصائل

★ مصعب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پاپیادہ پچیس حج کئے۔
فائدہ: ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ یہ حج عراق منتقلی سے قبل اور وہاں سے مدینہ منورہ واپسی کے بعد کئے ہوں، اس لئے کہ قیام عراق کے زمانہ میں آپ نے کوئی سفر حج نہیں کیا (۳۰)

★ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے نانا جان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پڑوس میں دفن کئے جاویں اس کے لئے انھوں نے اپنے مرض الوفات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھیج کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت لی تھی، انھوں نے نعم وکرامۃً کہہ کر بخوشی اجازت دے دی، لیکن حالات کے مدنظر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی کہ اگر میرے مرنے کے بعد بنوامیہ میری اس تمنا کی راہ میں رکاوٹ بنیں تو ان سے قتل وقتال اور جھگڑا وفساد قائم کرنے کے بجائے تم لوگ مجھے بقیع غرقد میں عام مسلمانوں کے ساتھ دفن کر دینا، چنانچہ جب آپ کا انتقال ہوا تو وہ اندیشہ پیش آیا، بنوامیہ نے کہا کہ ہرگز یہ نہ ہونے دیں گے کہ حسن رضی اللہ عنہ حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں دفن ہوں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی تو خفا ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلح ہو کر مقابلہ کا ارادہ فرمالیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سب حالات کا پتہ چلا تو تشریف لائے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ بے شک بنوامیہ کی یہ حرکت ظلم وزیادتی ہے، مگر آپ کے سامنے آپ کے بھائی کی وصیت موجود ہے، اس پر عمل کرو اور صبر کرو، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ بقیع قبرستان لے جایا گیا ان کے جنازہ میں بنوامیہ کا کوئی فرد شریک نہوا، سوائے سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے اور وہ بھی اس لئے کہ وہ اس وقت مدینہ کے گورنر تھے، جب نماز جنازہ کا وقت ہوا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے سعید ابن عاص رضی اللہ عنہ ہی سے امامت کی درخواست کی، اور یہ فرمایا: لو لا انها السنة لما قدمتک یعنی اگر یہ مسنون طریقہ نہ ہوتا تو میں آپ کو ہرگز آگے نہ بڑھاتا، سبحان اللہ! اگر یہ اسوۂ حسینی آج بھی ہمارے سامنے ہوتا تو ہمارے اختلافات نفرتوں میں تبدیل نہ ہوتے۔

★ لیث نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے درزی سے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ

کیلئے قمیص کاٹ رہا تھا، لمبائی کے بارے میں میں نے دریافت کیا کہ پیروں تک رکھدوں؟ آپ نے فرمایا نہیں! پھر میں نے پوچھا ٹخنوں تک رکھدوں؟ آپ نے فرمایا نہیں کیوں کہ ٹخنوں سے نیچے کا جتنا حصہ کپڑے سے ڈھک جائے وہ جہنم میں ہے۔

فائدہ: اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نانا محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وسنن کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے۔

✷ حضرت حسینؓ نے مکہ مکرمہ سے بصرہ کے رئیسوں کے نام ایک خط لکھا، جس میں دینِ حنیف سے لوگوں کی لاپرواہی وغفلت کا ذکر کرتے ہوئے دردانگیز لہجہ میں تحریر فرمایا:

"آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں مٹ رہی ہیں اور بدعتیں پھیلائی جارہی ہیں میں آپ لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی حفاظت میں لگیں، اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں کوشاں ہوجائیں۔"

✷ کوفہ کے سفر کے دوران آپ کی ملاقات فرزدق شاعر سے ہوئی جو کوفہ سے آرہے تھے، آپ نے ان سے وہاں کے لوگوں کے احوال پوچھے، انھوں نے جواب میں کہا: ان کے دل تو آپ کے ساتھ ہیں مگر تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: تم نے صحیح کہا ہے، تمام کام اللہ کے قبضے میں ہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، ہمارا رب ہر روز نئی شان میں ہے، اگر تقدیر ہمارے مراد کے موافق ہوئی تو اللہ کا شکر کریں گے، شکر کی توفیق بھی اسی سے مانگتے ہیں اور اگر تقدیر الٰہی ہمارے خلاف ہوئی تو وہ شخص خطا پر نہیں ہوسکتا جس کی نیت حمایت حق ہو اور جس کا دل خوفِ خدا رکھتا ہو۔

✷ کربلا میں نویں محرم کو جب دشمنان اہل بیت نے حضرت حسینؓ کو دعوت قتال دی اور جنگ کیلئے اُبھارا تو آپ نے یہ کہہ کر ان سے ایک رات کی مہلت مانگی کہ میں ذرا اطمینان سے وصیت نماز و دعا اور استغفار کرسکوں۔ دسویں محرم کی نماز ظہر کا وقت ہوا تو آپ نے دشمن سے فرمایا کہ لڑائی تھوڑی دیر کے لئے بند کرو کہ ہم نماز ظہر ادا کرلیں، لیکن جب دیکھا کہ کوئی سُننے والا نہیں تو آپ نے چند ساتھیوں کو لے کر خود ہی نماز ظہر بصورتِ

صلوٰۃ الخوف ادا فرمائی اور قضا ہونے نہ دی۔

✷ میدانِ جنگ میں آپ بڑی بہادری کا مظاہرہ فرمارہے تھے، بھوک و پیاس اور خاندان کے لٹ جانے کے غم کے باوجود آپ ایسا دلیرانہ حملہ فرمارہے تھے کہ جس طرف جاتے ادھر لوگ خوف سے بھاگتے تھے۔ اہل تاریخ نے اسے ایک بے نظیر واقعہ قرار دیا ہے کہ جس شخص کی اولاد اور اہل بیت قتل کردیئے گئے ہوں خود اس کو شدید زخم لگے ہوں اور پانی کے ایک قطرہ سے محروم ہو وہ اس قدر قوت و ثابت قدمی سے دشمن کا مقابلہ کرے کہ جس طرف رخ کرے مسلح سپاہی بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگنے لگیں۔

✷ ایک دن حرم مکہ میں حجر اسود کو تھام کر یہ دعا فرمارہے تھے "یا اللہ! آپ نے مجھے نعمتیں عطا فرمائیں لیکن مجھ سے شکر گذاری نہ ہوسکی، آپ نے مجھے آزمائش میں ڈالا تو مجھ سے صبر نہ ہوسکا، اس پر بھی آپ نے نہ مجھ پر اپنی نعمت کا دروازہ بند فرمایا نہ مصیبتوں میں اضافہ کیا، یا اللہ! کریم سے تو کرم ہی ہوا کرتا ہے"۔ اندازہ کیجئے کہ یہ بندگی کا کس قدر اعلیٰ مقام ہے

✷ آپ بہت ہی سخی مزاج واقع ہوئے تھے، مظلوموں کی فریاد سننا اور اہل حاجت خصوصاً مقروضوں کے قرضے چکانا آپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ضرورت مندوں کو بڑی فیاضی سے عطا فرماتے اور دل کھول کر مدد کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ کسی کی ضرورت پوری کرنا ایک مہینے کے اعتکاف سے افضل سمجھتا ہوں، اور فرماتے تھے کہ لوگو! کوئی تمہارے پاس فریاد لائے تو ملول و رنجیدہ مت ہو کیوں کہ اہلِ حاجت کا تمہارے پاس آنا اللہ کی نعمت ہے، اگر تم اس کو برا سمجھوگے اور ناپسند کروگے تو یہ نعمت قہر میں تبدیل کردی جائے گی، یعنی خود تمہارے اُوپر محتاجی آئے گی۔

شہادت

جمعہ کے دن ۱۰ رمحرم الحرام ۶۱ھ کو میدان کربلا میں اپنے خاندان کے تینتیس محترم افراد کے ساتھ شمر ذی الجوشن بن ابی انس کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا ان للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ و کل عندہ باجل مسمی آپ کے سانحۂ عظیم پر تمام اہلِ ایمان کے

قلوب کانپ اُٹھے اور غمگین ہوگئے حتیٰ کہ جنات میں تک نوحہ وغم کیا گیا۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کو کسی نے یہ المناک خبر پہونچائی تو فرمایا۔ اللہ ان کے قاتلین پر لعنت فرمائے اور انہیں تباہ وبرباد کرے۔

جنگ کے دوران بھی بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں، جنھیں اہل تاریخ نے مفصلاً بیان کیا ہے جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے قتل میں شرکت تو کجا ان کی ادنیٰ توہین کرنے والا بھی اللہ کی طرف سے اسی دنیا میں اپنے کیفر کردار کو عبرت ناک انداز میں پہونچایا گیا۔

نوٹ: تمام حوالوں کیلئے ملاحظہ ہوں۔ مشکوٰۃ ص: ۵۶۷ تا ۵۷۲، مرقاۃ المفاتیح ۱/ ۳۶۹ تا ۳۹۹، التعلیق الصبیح: ۷/ ۳۸۲ تا ۴۰۴، اُسد الغابہ: ۱/ ۴۹۵ تا ۵۰۰، شہید کربلا مصنفہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ص: ۲۸ تا ۹۹، اور معجم کبیر طبرانی: ۳/ ۹۴ تا ۱۲۶۔

حکیم ھذہ الامۃ
ابو مسلم الخولانی رحمۃ اللہ علیہ

محبت کے لئے کچھ دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا

حضرت ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی مخصوص لوگوں میں سے تھے جن کے قلب کو باری تعالیٰ نے اپنی محبت صادقہ کیلئے چن لیا تھا، ان کا نام عبداللہ بن ثوب ہے، یمن کے رہنے والے تھے بعد میں روم کے مقام "داریا" میں سکونت پذیر رہے، کہتے ہیں کہ یوم الحنین میں ان کی پیدائش ہوئی اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں مسلمان ہوگئے تھے، مگر مدینہ منورہ حاضر ہونے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوچکی تھی اسلئے شرفِ صحابیت سے محروم رہے، کبارِ تابعین میں ان کا شمار ہوتا تھا وہ صاحبِ فضائل کثیرہ وکمالات عدیدہ تھے، چنانچہ امام جزری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"وہ بڑے صاحبِ فضیلت عبادت گذار بزرگ تھے، ان کی خوبیاں بہت ہیں، انہیں کبارِ تابعین میں شمار کیا گیا ہے، انکی کرامات اور کمالات بھی بہت ہیں۔" (۱)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کعبِ احبار کا قول نقل کیا ہے:

"اس امت کے دانا اور حقیقت شناس ابو مسلم خولانی ہیں، حکامِ وقت ان سے برکت حاصل کرتے تھے اس لئے ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ابو مسلم مجاہدین کی صفِ اول میں رہا کریں، تاکہ ان کی برکت سے فتح حاصل ہوجائے"۔ (۲)

(۱) اسد الغابہ: ۵۸۸۲، (۲) الزھد للامام احمدؒ

وہ حضرت معاویہ ؓ کی حمایت کرتے ہوئے صفین کی جنگ میں ان کے ساتھ شریک رہے۔ اسود بن قیس عنسی نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس نے ابومسلم خولانی کو طلب کیا اور ان سے اپنی نبوت ماننے کا تقاضہ کیا، آپ نے فرمایا: میں تجھے ہرگز نہیں مانتا، اس نے پوچھا کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مانتے ہو؟ انھوں نے فرمایا: ہاں! ضرور مانتا ہوں، اسی طرح متعدد مرتبہ سوال وجواب ہوئے، پھر اس نے ایندھن تیار کرنے کا حکم دیا، جب ایندھن تیار ہوگیا اور آگ دہکنے لگی تو اس نے ابومسلم کو اس میں ڈالدینے کا حکم دیا، جب ابومسلم اس میں ڈالے گئے تو سارے لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ ابومسلم اس میں زندہ ومطمئن ہیں اور آگ انہیں جلانے سے قاصر ہے، اسود کے ماننے والوں نے اسے مشورہ دیا کہ اس شخص کو فوراً شہر بدر کر، ورنہ اس کی وجہ سے بہت سے لوگ تجھ سے برگشتہ ہوجائیں گے، چنانچہ آپ شہر بدر کردیئے گئے، وہاں سے نکل کر آپ مدینہ منورہ کی طرف چلدیئے جب مدینہ منورہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاچکے ہیں، سیدھے مسجد نبوی میں آئے، اپنی سواری کو مسجد کے دروازہ پر بٹھا کر اندر تشریف لائے، وضو فرمایا اور ایک ستون کی آڑ میں نماز پڑھنے کے ارادہ سے جاکر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ حضرت عمر ؓ کی نگاہ ان پر پڑی، حضرت عمر ؓ نے ان سے دریافت کیا کہ کس علاقہ سے تمہارا تعلق ہے؟ انھوں نے جواب دیا: یمن سے، حضرت عمر ؓ نے پوچھا: اس شخص کو جانتے ہو جسے اسود عنسی کی آگ جلا نہ سکی؟ انھوں نے کہا: کیا آپ عبداللہ بن ثوب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ حضرت عمر ؓ نے فرما: یا آپ کو اللہ کی قسم! وہ آپ ہی تو نہیں ہیں؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں میں ہی ہوں!۔ بس کیا تھا حضرت عمر ؓ فوراً ان سے بغل گیر ہوکر بہت روئے، پھر فرمایا شکر ہے اللہ کا اس نے مجھے اس وقت تک زندہ رکھا کہ میں نے اس امت کے ایسے فرد کو دیکھ لیا جسکے ساتھ اللہ پاک نے وہ معاملہ فرمایا جو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ فرمایا تھا۔ (۴)

(۴) ترجمان السنۃ: ۴/ ۳۴۲

✷ ابو مسلم بڑے عبادت گذار اور زاہد و مجاہد مزاج کے حامل تھے، ایک مرتبہ دو شخص ان سے ملاقات کیلئے گئے، گھر پہونچے تو معلوم ہوا کہ مسجد میں ہیں، جب مسجد آئے تو دیکھا کہ نماز میں مصروف ہیں یہ لوگ ذرا ہٹ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے، تقریباً تین سو رکعتیں پڑھنے تک انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی ان کا منتظر ہے، اس کے بعد جب وہ متوجہ ہوئے تو ان لوگوں نے کہا حضرت! ہم بہت دیر سے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ میرے منتظر ہو تو میں تمہاری طرف متوجہ ہی نہ ہوتا۔ (۴) یعنی ان کی مخصوص طبیعت مخلوق سے ملنے کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی اور چاہتے تھے کہ ہمیشہ مشغول بحق رہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ خود فرماتے تھے کہ اگر میں جہنم کو دہکتا ہوا دیکھ لوں تو بھی اپنی عبادت میں اضافہ نہ کرسکوں گا یعنی جس قدر ممکن ہے اس قدر عبادت میں اب بھی مصروف ہوں۔

آپ اعلیٰ درجہ کا توکل رکھتے تھے، غیر اللہ سے کسی قسم کی امید رکھتے تھے نہ خوف کرتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ سے لینے اور مانگنے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ نجی ضرورت کی معمولی معمولی چیزوں کی حاجت بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھتے تھے، چنانچہ ان کا معمول تھا کہ گھر میں کسی چیز کی ضرورت کا علم ہوتا تو دو رکعت نفل پڑھتے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے، اس سلسلہ میں بقول محمد بن شعیب لوگوں نے یہاں تک دیکھا کہ وہ ایندھن، تیل، آٹا ایسی چیزوں کا سوال بھی اللہ تعالیٰ سے کر رہے ہیں۔ (۵)

صحابہ کرامؓ سے ان کو نہایت عقیدت اور انتہائی محبت تھی وہ ان کے حق میں کوئی برائی سننا تو درکنار سوچنا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے، دوسرے لوگوں کو بھی علی الاعلان اس معاملہ کی نزاکت کی طرف متوجہ اور خبردار کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا: مسلمانو! صحابہ کرامؓ سے بدگمانی سے بچو کیونکہ اللہ پاک نے ان کے زبان و دل پر حق کو جاری کیا ہوا ہے۔ (۶)

(۴) احمد۔الزھد: ۵۴۳، (۵) احمد۔الزھد: ۵۴۲، (۶) احمد۔الزھد: ۵۴۴

وہ دنیا کی حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھے ان کی چشم بینا ہر حادثہ اور ہر واقعہ سے خوب عبرت پکڑا کرتی تھی، خصوصاً دنیا کی بے ثباتی اور بے وقعتی کو وہ اچھی طرح ہر جگہ محسوس کرتے اور اس کو اپنے نفس کی درستی اور ذہن کی صفائی کا ذریعہ بناتے، ویرانوں اور کھنڈروں سے گذرنا ہوتا تو تھوڑی دیر کیلئے توقف فرماتے اور پھر یوں گویا ہوتے "اے ویرانے! تو کیونکر بے آباد ہو گیا لوگ مر کر اس دنیا کو سدھار گئے مگر ان کے اعمال باقی رہ گئے، شہوتیں تو ختم ہو گئیں مگر ان سے کمائی ہوئی مصیبتیں قائم ہیں"۔

کبھی بنی نوع انسانیت سے مخاطب ہوتے اور فرماتے "گناہوں کو چھوڑو، نافرمانیاں ختم کرو، اے ابن آدم! گناہ کا ترک کرنا توبہ کو طلب کرنے سے آسان ہے۔" (۷)

توبہ کے مشکل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو اُسے توبہ کی توفیق ہو، پھر توبہ اپنی تمام شرائط کے ساتھ کی جائے، پھر حق تعالیٰ کی طرف سے قبولیت بھی ہو وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ میں خود گناہ چھوڑ دینا زیادہ آسان ہے۔

احقاقِ حق میں انھیں ملکۂ راسخہ اور یدِ طولیٰ حاصل تھا وہ حق کے معاملے میں کسی بڑے سے بڑے کی پرواہ نہ کرتے تھے، انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ کا طویل دور پایا ہے، امیر کو نصیحت و موعظت اپنا حق سمجھتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ وہ حضرت معاویہؓ کے پاس آئے اور اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے: "اے معاویہؓ! اگر تم اچھے کام کرو گے تو اچھا بدلہ پاؤ گے، اگر برے عمل کرو گے تو اس کی سزا پاؤ گے، اور یاد رکھو اگر تم سے کسی پر ظلم و زیادتی ہو گئی تو تمہارا ایک ظلم اپنے انجام و اثر کے لحاظ سے ان کروڑوں مہربانیوں اور عدل گستریوں پر غالب رہے گا۔

ایک اور دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت معاویہؓ دمشق کی جامع مسجد میں منبر پر رونق افروز ہو کر مسلمانوں سے مخاطب تھے، ابو مسلم خولانی وہاں پہونچ گئے، حضرت معاویہؓ کو مخاطب کر کے فرمانے لگے: "اے معاویہؓ! دیکھو خلافت کو دولت اکھٹی کرنے اور حسب مرضی صرف

(۷) احمد۔ الزھد: ۵۴۵

کرنے کا ذریعہ نہ سمجھنا، خلافت تو حق کے مطابق عمل کرنے، عدل ومساوات قائم کرنے اور خالص رضائے الٰہی کی خاطر مخلوق کی دارو گیر کرنے کے واسطے ہوتی ہے، اے معاویہؓ! یاد رکھو اگر تم نے کسی پر ظلم کیا تو تمہارا یہ فعل تمہارے اعتماد کو مجروح اور تمہارے مقام کو کمزور کردیگا"۔ جب ابو مسلم یہ بات کہہ چکے تو حضرت امیر معاویہؓ! منبر سے اتر کے ان کے قریب تشریف لائے اور ان سے فرمایا: ابو مسلم! اللہ تم پر رحم فرمائے، اللہ تم پر رحم فرمائے، اللہ تم پر رحم فرمائے۔ (۸) اس واقعہ میں جہاں ابو مسلم کا جذبۂ اظہارِ حق کا اندازہ ہوتا ہے وہیں سیدنا حضرت معاویہؓ کے حلم ووقار، اور تسلیم حق، احترام صالحین بھی خوب عیاں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں فہم وتدبر اور حکمت ودانائی بھی بہت فراوانی سے عطا فرمائی تھی، ان کی گفتگو بڑی حکیمانہ ہوتی تھی، جس میں ان کی تدبیر وفہم جھلکتی اور ان کی فراست وسیاست عیاں ہوتی تھی، اوپر کی سطروں میں خلیفۂ وقت سیدنا حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ انکی گفتگو آپ نے ملاحظہ فرمائی کہ انکا خلیفہ کو نصیحت کرنے میں کیسا حوصلہ اور کس درجے کی فہم و فراست سے کام لیا ہے، اس عنوان کے تحت بھی ایک واقعہ ملاحظہ فرمالیجئے۔

ایک صاحب نے ان کے پاس حاضر ہوکر شکایت کی کہ لوگ اپنی حرکات اور طرز عمل سے مجھے بہت تکلیف پہونچاتے ہیں، اور معلوم کیا کہ میں ان کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے بچنے کے لئے کیا کروں؟ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: "تم ان لوگوں سے پیچھا کیوں چھڑانا چاہتے ہو، عوام کا حال یہ ہے کہ اگر ان کو نشانۂ تنقید بناؤ گے تو وہ تم پر تنقید کریں گے اور اگر تم انھیں ان کے حال پر چھوڑے رکھو گے تب بھی وہ اپنی حرکات سے باز نہیں آئیں گے، حتی کہ اگر تم انھیں بستیوں میں چھوڑ کر جنگلوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تو بھی وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہونچ جائیں گے۔ غرض ان سے رستگاری کی کوئی صورت نہیں۔ (۹) حاصل یہ ہے کہ لوگوں کے قبول وانکار اور ان کی طرف سے راحت رسانی یا ایذادہانی پر نظر نہ رکھو بلکہ اپنے کام سے کام رکھو، ورنہ پھر اس دنیا میں جینا مشکل ہوجائیگا البتہ اس پر نظر رہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ راضی ہیں یا نہیں۔

(۸) احمد۔الزھد: ۱۴۵، (۹) ایضاً

ان کی باطنی وروحانی نسبت بہت عالی تھی اوران کے ہاتھوں بیشمار واقعات ایسے رونما ہوئے جنہیں اصطلاح میں کرامات کہا جاتا ہے، مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ واقعہ ابن کثیر کی "البدایہ والنھایہ" کے حوالہ سے اپنی کتاب "ترجمان السنہ" میں نقل کیا ہے کہ:

ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ غزوہ روم کیلئے روانہ ہوئے، ان کا ایک نہر پر گذر ہوا تو اپنے لشکر سے مخاطب ہو کر فرمایا: چلو دریا پار چلو، لوگ جب دریا پر سے گذرنے لگے تو پانی ان کے گھوڑوں سے تھوڑا نزدیک رہا، جب سب پار اتر گئے تو انہوں نے فوج سے پوچھا کہ کسی کی کوئی چیز گم تو نہیں ہوگئی، راوی کہتے ہیں کہ یہ سن کر ایک شخص نے قصداً اپنا توبرا پانی میں ڈالدیا اور کہا میرا توبرا نہیں مل رہا ہے، اس پر ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میرے ساتھ آؤ، دریا کے قریب جا کر دیکھا تو وہ توبرا دریا کے کنارے جھاڑیوں میں لٹکا ہوا پایا۔

ایک دفعہ اور ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ دریائے دجلہ کے پاس تشریف لائے دریا پر جوار آجانے کی وجہ سے لکڑیاں بہہ کر آرہی تھیں ابو مسلم دریا کی سطح پر چل کر پار ہو گئے اور ساتھیوں سے پوچھا تمہاری کوئی چیز دریا میں گر گئی ہو تو بتلاؤ، ہم اللہ پاک سے دعا کر کے دلوادیں گے۔ اس واقعہ کی اسناد صحیح ہے۔ (۱۰)

اسی طرح ان کا ایک اور عجیب واقعہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ

ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ جس وقت روم میں تھے، وہاں کے گورنر نے ایک دستہ جنگ کیلئے بھیجا اور واپسی کا وقت مقرر کر دیا لیکن وہ لوگ وقت مقررہ پر واپس نہیں ہوئے، حضرت ابو مسلم کو بڑی فکر لاحق ہوئی کہ کیا بات ہوگئی وہ اسی فکر میں وضو کرنے کیلئے نہر کے کنارے بیٹھے دل ہی دل میں باتیں کر رہے تھے کہ نہ معلوم کیا حالت پیش آئی ہوگی کہ وہ لوگ وقت پر نہیں لوٹ سکے، اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے درخت پر ایک پرندہ آکر بیٹھا اور ابو مسلم سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا ابو مسلم! کیا تم سریہ کے بارے میں فکر مند ہو؟ انھوں نے فرمایا: ہاں! کہنے لگا بفکر نہیں کرو وہ لوگ فتحیاب ہو گئے ہیں، اور غنائم لے کر بحفاظت لوٹ رہے ہیں

(۱۰) ترجمان السنۃ: ۴/ ۲۴۳

فلاں وقت تک یہاں پہونچ جائیں گے، ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا: اللہ تمہارا بھلا کرے، یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو؟ پرندے نے کہا: میرا نام ''ارتیائیل'' ہے میں اہل ایمان کے قلوب کو خوش و مطمئن رکھنے پر منجانب اللہ مامور ہوں۔ چنانچہ ٹھیک اس کے بتلائے ہوئے وقت پر لشکر اس مقام پر پہونچ گیا۔(۱۱)

انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر بہت ناز تھا، ان کی محبت و تعلق کا مرکز اللہ پاک کی ذات ہی تھی، حدیث پاک میں آیا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر اً پراگندہ حال بکھرے بال نظر آتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے ان کے تعلق و محبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر اس کے بھروسہ پر کسی بات کی قسم کھا بیٹھیں تو وہ ضرور پوری کرتا ہے۔ چنانچہ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کچھ اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ہی نے ان کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں سخت قحط پڑا، لوگ پریشان ہوگئے، حضرت معاویہؓ نے عام اعلان فرمادیا کہ سب لوگ نمازِ استسقاء کیلئے عیدگاہ میں جمع ہوجائیں، خود بھی تشریف لائے اور ایک نظر لوگوں پر ڈالی تو ان کی نگہ ابو مسلم خولانی پر پڑی، حضرت معاویہؓ نے ان سے فرمایا: ابو مسلم! دیکھتے نہیں کہ مخلوق خدا کس حال میں ہے اور کس قدر پریشان ہے، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ یہ ابتلاء رفع ہوجائے اور بارش ہونے لگے۔ انہوں نے عرض کیا: حضرت! میں ضرور دعا کروں گا، اگرچہ بہت گنہگار ہوں، پھر قبلہ رو متوجہ ہوئے، اس وقت وہ عربی ٹوپی زیب سر کئے ہوئے تھے اسے سر سے ہٹادیا، برہنہ سر ہوکر دعا والتجا میں مشغول ہوگئے۔ کہنے لگے ''اے اللہ! ہم سب آپ کی بارگاہ میں بارش مانگنے کیلئے آئے ہیں، ہمیں پانی سے سیراب فرمادیجئے، اے اللہ! میں آپ کے سامنے عاجزی کے ساتھ حاضر ہوں، اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کا بوجھ ساتھ لایا ہوں۔ اے اللہ! مجھے رسوا و نامراد نہ فرمایئے'' اسی طرح لجاجت و عجز کے ساتھ دیر تک دعا کرتے رہے، اس کے بعد لوگ آبادی کی طرف لوٹنے لگے، ابھی اپنے گھروں کو واپس نہیں ہونے پائے کہ بارش ہونا شروع ہوگئی

(۱۱) احمد-الزھد:۱۴۵

اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ سیراب ہو گئے۔ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملہ کو دیکھا تو خود وہیں ٹھیر گئے، اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہو کر کہنے لگے، "بارِالٰہا! معاویہؓ نے مجھے مقام ریاوسمعہ پر لا کھڑا کیا ہے یعنی آپ سے میرے تعلق اور آپ کی مجھ پر عنایاتِ خاصہ معاویہؓ کی وجہ سے لوگوں پر ظاہر ہو گئی، اور اب لوگوں کی زبانوں پر اس کا چرچا ہوگا، اندیشہ ہے کہ نفس کیلئے یہ صورتحال نقصان دہ اور مہلک ثابت ہو، اسلئے التجاء ہے کہ اگر میری موجودہ حالت آپ کے علم میں اچھی اور بہتر ہو تو قبل اس کے کہ میرا نفس کسی فتنہ کا شکار ہو جائے آپ مجھے دنیا سے اٹھا کر اپنے پاس بلا لیجئے۔" راوی کہتے ہیں کہ وہ دن جمعرات کا تھا، اگلی جمعرات کو حضرت ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ (۱۲)

محمد بن شعیب اپنے علاقہ کے بڑوں بزرگوں سے نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ روم سے دمشق لوٹ رہے تھے، راستے میں بمقام حمص ہمارا ایک گرجا گھر سے گذر ہوا، رات کا وقت تھا، قافلہ کی آہٹ محسوس کر کے ایک راھب اس گرجا سے برآمد ہوا اور ہمیں مخاطب کر کے پوچھنے لگا: تم لوگ کہاں کے باشندے ہو؟ ہم نے کہا کہ ہم اہل دمشق ہیں، کہنے لگا ابو مسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ کو جانتے ہو؟ ہم نے کہا: خوب جانتے ہیں، تو اس نے کہا: تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ہمارا اسلام کہنا اور کہنا کہ ان کا ذکر ہماری کتابوں میں "رفیق عیسیٰؑ بن مریمؑ" کے عنوان سے پایا جاتا ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے پہونچنے تک وہ وفات پاچکے ہونگے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارا قافلہ ابھی مقام "غوطہ" ہی تک پہونچ پایا تھا کہ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر رنج اثر ہمیں مل گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ (۱۳)

یہ حضرت معاویہؓ کا دور خلافت تھا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دمشق میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ واللہ اعلم۔ (۱۴)

---

(۱۲) احمد-الزھد: ۲۴۵، (۱۳) احمد-الزھد: ۲۴۵، (۱۴) اسد الغابہ: ۸۸/۳

سیدنا الامام الاعظم
ابوحنیفہ نعمان بن ثابت علیہ رحمۃ اللہ ورضوانہ

اسم گرامی:

آپ کا اسم گرامی نعمان، کنیت ابوحنیفہ، لقب امام اعظم ہے۔آپ نسلاً فارسی ہیں، آپ کے آباواجداد فارس کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، بعضوں نے آپ کو غلام خاندان سے منسوب کیا ہے، لیکن اولاً تو یہ خلافِ تحقیق بات ہے، ثانیاً اگر ایسا ہے بھی تو کسی کی فضیلت وبزرگی میں یہ چیز رکاوٹ ہرگز نہیں ہے۔چنانچہ صحابہؓ وتابعین رحمۃ اللہ علیہ میں بھی ایسے لوگ ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی صحابیت وتابعیت پر غلامی جب اثر انداز نہیں ہوتی تو الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ ہی کے لئے یہ چیز خاندانی شرافت ونجابت کے حق میں نقصان دہ کیسے ہوجائے گی؟ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے:"میرے مقرب متقی لوگ ہیں، جو ہوں، جہاں ہوں"۔

ولادت، جائے ولادت:

الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت عالمِ اسلام کے مایہ ناز وتاریخ ساز شہر کوفہ میں سنہ ۸۰ ھ میں ہوئی، وہی کوفہ جس کی علمی وفقہی تعمیر کی خشتِ اول حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ ہیں (جنھیں حضرت عمرؓ نے باوجود اپنے پاس ان کی سخت ضرورت ہونے کے بھی وہاں بھیج دیا تھا) وہی کوفہ جس میں چار ہزار علماء ومحدثین پیدا ہوئے، جس کو پندرہ سو صحابہ کرامؓ کے مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے، جسے باب العلم حضرت علیؓ نے علم سے بھرپور شہر قرار دیا،

جہاں کے علماء ومحدثین کے حافظہ وذہانت اور علمی انہماک پر ابن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ نے رشک فرمایا تھا، جہاں احادیث الرسول کا اس قدر ذخیرہ تھا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ فرماتے ہیں: ”اگر ہم کوفہ میں حدیث جمع کرنے کا اہتمام کرتے تو ایک لاکھ احادیث جمع کر لیتے“۔ جہاں سے علمی فائدہ اٹھانے والوں میں بخاری رحمۃ اللہ علیہ وترمذی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدثین بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مولد اپنے زمانہ کا سب سے بڑا علمی مرکز ومحدثین کا مخزن تھا؛ یہی وجہ ہے کہ رواۃِ حدیث کی بہت بڑی تعداد کوفہ سے تعلق رکھتی ہے؛ کوفہ کی بات آئی تو ہم نے اس کا ذکر تفصیل سے اس لئے کیا کہ ماحول کے پس منظر میں اندازہ کیا جاسکے کہ رجالِ علم وجبالِ فہم اکابر صحابہؓ وتابعین رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک ومنور ماحول میں محدثین کبار کے آگے تحصیل علم کے لئے زانوائے ادب تہہ کرنے والے الامام الاعظم کا علم، فقہ وفہم، طرزِ استدلال، طریقۂ اخذ احکام اور اس معاملہ میں ورع وتقویٰ، اہتمام واحتیاط کس درجہ ہوگا اور اس کے مقابلے میں چند حاسدین ومعاندین آپ کو علم سے بے بہرہ قرار دے کر آپ کے فقہی مسلک کو ضعیف ومشکوک ثابت کرنے کے لئے تارِ عنکبوت جیسے جو اعتراضات کر رہے ہیں تو وہ کس حد تک مبنی بر صداقت ودیانت ہوں گے!

شرفِ تابعیت:

الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے حضراتِ صحابہؓ کا زمانہ پایا ہے۔ بعضوں نے ستر صحابہؓ سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس کی تحقیق نہیں، البتہ ۲۲ صحابہ کرامؓ کے سنین وفات کو سامنے رکھ کر ان سب سے الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات کے قوی امکانات کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ تاریخی شواہد کے ساتھ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انسؓ، حضرت عبداللہؓ ابن ابی اوفیٰ، حضرت سہل بن سعدؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت راشد بن الاسقعؓ، حضرت معقل بن یسارؓ، حضرت ابوطفیلؓ، حضرت عبداللہ بن اُنیسؓ، حضرت عبداللہ بن جزءؓ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے تو بہرحال ملاقات فرمائی ہی تھی، تابعیت کا شرف حاصل کرنے کے لئے ایک صحابیؓ کی ملاقات ہی کافی تھی، چہ جائیکہ اتنی بڑی تعداد

سے ملاقات کا موقع مل جائے ، بلکہ بقول حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد بار ملاقات فرمائی ہے، علماء حدیث نے اس پر اتفاق فرمایا ہے کہ آپ نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایات بیان کی ہیں۔

کسبِ حلال:

الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا آبائی پیشہ تجارت تھا، آپ نے بھی اسی کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنایا، اس لائن میں آپ نے کافی ترقی فرمائی، کاروبار کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ کوفہ کے علاوہ ایران، عراق، شام وعرب کے ملکوں کو آپ کے ہاں سے مال سپلائی کیا جاتا تھا، تجارت میں صفات دیانت وامانت کے اعتبار سے آپ کا کاروبار ممتاز شمار ہوتا تھا، اسی لیئے بعض اہل قلم نے آپ کی تجارت کے طرز کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تجارت سے مشابہ قرار دیا ہے، وسیع تر کاروبار نے آپ کو غیر معمولی طور پر مصروف کر لیا تھا، ہر وقت اسی کی دیکھ بھال اور حساب وکتاب میں لگے رہتے تھے، ایک دن اسی سلسلہ میں کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ پر علم وفہم، دانائی وہوشیاری، ذہانت وذکاوت، ورع وتقویٰ کے مہر تاباں کو دیکھ کر ان سے ارشاد فرمایا:

" صاحبزادے کہاں گھومتے رہتے ہو؟ آپ نے فرمایا کہ حضرت تجارت کے سلسلہ میں سوداگروں کے پاس آمد ورفت رہتی ہے، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "علماء کے پاس بھی آتے جاتے ہو؟" فرمایا حضرت بہت کم۔ فرمایا: "ان کے پاس بکثرت جایا کرو"۔

تحصیلِ علم:

الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ: "اس کے بعد میرے دل میں حصولِ علم کا ذوق پیدا ہوگیا" چنانچہ آپ نے اس جانب توجہ فرمائی اور وقت کے مروجہ علوم حاصل کئے، خصوصاً علم کلام میں آپ نے کافی درک ومہارت حاصل کی اور مختلف موضوعات پر مناظرے ہونے لگے، اسی سلسلہ میں آپ نے بصرہ —— جو کہ فرق باطلہ اور گمراہ مناظروں کا گڑھ تھا —— کی جانب بیس مرتبہ سفر فرمایا اور بڑے بڑے مناظروں میں حصہ لیا، یوں تو آپ اس میں

کافی مشہور اور مقبول ہوتے جا رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ سے کسی عظیم وکریم کام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا، چنانچہ کچھ مدت میں آپ کا رجحان علم فقہ کی طرف ہو گیا۔

واقعہ اس کی تحریک کا یہ بتایا جاتا ہے کہ الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی عورت نے آپ سے ایک مسئلہ دریافت کیا جس سے آپ واقف نہ تھے، آپ نے امام حماد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا اور کہا: "واپسی میں ہمیں بھی بتا جانا" وہ عورت واپس آئی اور مسئلہ بتا کر چلی گئی، لیکن اس باب میں اپنی لاعلمی کا آپ کو بے حد افسوس رہا اور اسی وقت سے آپ نے مشہور محدث اور معروف استاد امام حماد رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں شرکت شروع فرمادی، امام حماد حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے براہ راست سماعت فرمائے ہوئے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقہ کی سند مانے جاتے تھے، اولاً آپ کو بائیں جانب مبتدیوں کی صف میں بٹھایا گیا لیکن بہت جلد امام حماد رحمۃ اللہ علیہ نے تاڑ لیا کہ ذہانت اور فقاہت میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درجہ کا ایک بھی طالب علم نہیں، اسی لئے آپ کو صف اول میں بٹھایا جانے لگا، دو ہی برس میں آپ نے اس نازک ترین فن میں اس قدر مہارت حاصل فرمائی کہ خود آپ کا بیان ہے: ''دو برس کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں خود درس شروع کردوں'' مگر استاذ کا ادب مانع ہوا، اس لئے آپ استفادہ ہی فرماتے رہے، دوران طالبعلمی ہی سے آپ کا اندازِ فکر اور طرزِ استدلال مجتہدانہ تھا، چنانچہ ایک مرتبہ امام حماد رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آپ کسی سفر میں تشریف لے گئے، اثناءِ راہ میں نمازِ عصر کا وقت ہو گیا، پانی موجود نہیں تھا، اس لئے امام حماد رحمۃ اللہ علیہ نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی، مگر آپ نے نماز نہیں ادا کی، آپ کا خیال تھا کہ آخر وقت مستحب تک پانی کے انتظار میں نماز کو مؤخر کرنا چاہئے، آگے چل کر پانی مل گیا اور آپ نے وضو کر کے نماز پڑھی، استاذِ محترم نے شاگرد کے اس فقہی وفکری پرواز کی داد دی اور خوشنودی کا اظہار فرمایا، اسکے باوجود آپ اپنے اساتذہ کا بڑا اکرام فرماتے تھے، ان کی شان میں ادنیٰ گستاخی کو بھی روا نہیں رکھتے تھے، ساری زندگی میں کبھی ان کے گھر کی طرف پیر نہیں پھیلایا، خود فرماتے تھے: "میں نے کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی جس کے بعد والدین اور اساتذہ کیلئے دعاءِ مغفرت نہ کی ہو"۔

فقہ میں ویسے تو آپ خصوصی طور پر امام حماد رحمۃ اللہ علیہ ہی کے شاگرد تھے لیکن عموماً آپ نے بہت سے اساتذہ علم وفن سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ آپ کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب بتائی گئی ہے، خود یہی بات آپ کے مقامِ علم کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔

تدوینِ فقہ:

بلاشبہ الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ ہی وہ شخصیت ہیں جنھیں فقہ اسلامی کے قوانین کے مدون ومرتب کرنے کا شرف سب سے پہلے حاصل ہوا، دوسری صدی ہجری کا ربع اول مذہبی اعتبار سے بڑے انتشار واختلاف کا زمانہ ہے، خشیت وانابت تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جارہی تھی، احکامِ شریعت کو اہل ہوا وہوس نے کھیل بنا رکھا تھا، اہل علم حضرات کے مابین بھی شدید وکثیر اختلافات پیدا ہوگئے تھے، بعض حضرات صرف ظاہر حدیث پر عمل کو ضروری اور قیاس واجتہاد کو حرام قرار دیتے تھے، ایک جماعت ان حضرات کی تھی جو روایت ودرایت کو یکجا کرنے کے قائل تھے، ان ہی خوش قسمت نفوس میں الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شمار ہوتا ہے، ان اختلافات کا سب سے زیادہ نقصان عوام الناس کو ہوا۔ قاضیوں کے متضاد فتاویٰ وفیصلوں سے عوام میں عجیب طرح کی بے چینی پھیلی ہوئی تھی، الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ ان پریشان حالات کو بچشم خود ملاحظہ فرمارہے تھے، ان حالات کے ازالہ اور خاتمہ کیلئے آپ شدت سے ضرورت محسوس فرماتے رہتے تھے کہ فقہ اسلامی کی باضابطہ اور باقاعدہ تدوین ہونی چاہئے تاکہ ایک طرف عوام الناس کو مسائل کے جاننے اور عمل کرنے میں دشواری نہ ہو تو دوسری طرف قاضیوں اور مفتیوں کو مسائل کے سمجھنے اور فتاویٰ وفیصلوں کے جاری کرنے میں دقت اور اشتباہ واختلاف نہ پیدا ہو، اُمت کی اس اہم ضرورت کی تکمیل کیلئے آپ نے تدوینِ فقہ کی جانب توجہ فرمائی۔ پہلے اس کام کے لئے کئی مقامات کے بارے میں سوچا گیا لیکن بہت سی مصلحتوں اور سہولتوں کے پیش نظر کوفہ ہی کو اس کیلئے ترجیح دی گئی، پھر آپ نے اپنے ہزاروں شاگردوں میں سے ذی لیاقت وباصلاحیت چالیس علماء کا انتخاب فرمایا جن میں ماہرین حدیث، ماہرینِ قیاس واجتہاد، ماہرین لغت وعربیت اُونچے درجہ کے اصحاب زہد

وتقویٰ تھے اور اپنے اپنے فن میں ممتاز مقام کے حامل تھے، پھر اس میں سے بارہ خصوصی حضرات پر مشتمل مجلس خصوصی بنائی۔ یہ حضرات ایک جگہ جمع ہوتے تھے، آپ ایک ایک جزیہ کو پیش کرتے اور اس پر بحث شروع ہوجاتی جب سب متفق ہوجاتے تو اس مسئلہ کو لکھ لیا جاتا بعض مرتبہ ہفتوں، مہینوں بحث چلتی اور کسی نتیجہ پر نہ پہونچتے تو خود الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ اس پر جامع ومانع تقریر فرماتے جس کو سب ہی قبول کر لیتے، پھر بھی اگر کسی کو اپنی رائے ہی پر اصرار ہوتا تو اسے بھی قلمبند کرلیا جاتا، اسی طرح بائیس سال کی طویل مدت میں تراسی ہزار دفعات پر مشتمل ایک کتاب فقہ تیار ہوگئی، یہ کام اگر چہ کہ ۱۴۴ھ سے قبل ہی ختم ہوگیا تھا تاہم اس کا سلسلہ چلتا ہی رہا، تا آنکہ آپ گرفتار کر کے جیل بھیج دیے گئے اور اس مبارک کام کا سلسلہ وہاں بھی قائم رہا، پوری امت کا فرض ہے کہ اس عظیم کارنامہ کی تکمیل پر خراجِ عقیدت ومحبت پیش کرتے ہوئے الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں دست بہ دعا رہے۔ الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس فقہی کارنامہ کی عنداللہ مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آج ایک محتاط اندازے کے موافق عالمِ اسلام کا دوتہائی حصہ اسی فقہ کی تقلید کرتا ہے۔

اوصافِ حمیدہ:

اسلام کے اس سوادِ اعظم کی ذاتی خوبیوں اور محاسن اور کمالات کے تذکرے کے لئے دفاتر وذخائر درکار ہیں، لیکن بات ختم کرنے سے قبل جی چاہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ تذکرہ ان خوبیوں کا بھی آجائے جو الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں قدرت کے فیاض ہاتھوں نے ودیعت فرمائے تھے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ فطرۃً حسین وجمیل تھے، حسن وجمال کے ساتھ نزاکت ونظافت کا علاقہ تو ہمیشہ ہی سے قائم ہے، لیکن حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی جمع ہوجائے یہ کمیاب ہے، الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ میں اللہ تعالیٰ نے دونوں خوبیاں جمع فرمادی تھیں، آپ نہایت ملنسار، خوش گفتار اور باوقار تھے، خودداری کی زندگی گذارتے تھے، دولت تو آپ کے گھر کی چیز تھی، لیکن نخوت وکبر کی بو بھی آپ میں نہ تھی، غریبوں کے مددگار اور بے سہاروں کا سہارا تھے، خصوصاً طلبہ کی دیکھ بھال اور ان کی حوائج وضروریات کی برابر فکر

فرماتے رہتے تھے، جن خوش نصیبوں کو آپ کے زیر کفالت علم حاصل کرنے کا موقع ملا ان میں آپ کے مایۂ ناز شاگرد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں وہی امام محمد جن کی "سیر کبیر" کو پڑھ کر ایک غیر مسلم اسکالر اتنا متاثر ہوئے کہ مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ مسلمانوں کے چھوٹے محمد کا علم وفضل میں یہ حال ہے تو ان کے بڑے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال ہوگا؟ اور راقم کو کہنے دیجئے کہ شاگرد کے علم وفضل کا یہ عالم ہو کہ ایک غیر مسلم اس کی تحریروں کے ذریعہ نورِ ایمان سے منور ہو جائے تو استاذ کے علم وفضل کا کیا حال ہوگا؟ آپ کی صفاتِ حسنہ میں امانت ودیانت، پڑوسیوں سے حسن سلوک، والدین اور اساتذہ کے احترام کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح شب بیداری اور تہجد گذاری، کثرتِ تلاوت، کثرتِ صوم، تدبر فی القرآن، مراقبۂ موت وفکر آخرت، باوضو رہنے کا اہتمام اور زہد وتقویٰ جیسی صفات میں بھی آپ کی مثال کم ہی ملے گی۔

ایامِ آخریں:

دنیا میں نہ کوئی ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہے نہ رہے گا، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دُنیا سے ایک مدت کے بعد پردہ پوش ہو گئے تو اوروں کا کیا شمار؟ الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے لئے بھی ایک وقت مقرر تھا۔ ادھر اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے سے جو کام لینا منظور تھا اس کی تکمیل ہو چکی تھی۔ موت کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیئے، ۱۴۹ھ میں جب خلیفہ منصور نے الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے قضاۃ کا عہدہ پیش کیا تو آپ نے انکار کر دیا، اس انکار کی وجہ یہی تھی کہ اس زمانے میں ظالم بادشاہ نے عدلیہ پر اپنا کنٹرول کر رکھا تھا اور قاضیوں کو فیصلہ کی آزادی حاصل نہیں تھی، انھیں ظالم ومظلوم، حق دار یا غیر مستحق کی تمیز کے بغیر حکام کے اشاروں پر فیصلے کرنے ہوتے تھے، جب آپ نے انکار فرمادیا تو منصور کو بہانہ ہاتھ آگیا اور اس نے آپ کو گرفتار کروا کے جیل بھیج دیا، آپ کی گرفتاری کی شہرت ہوئی تو تلامذہ وہیں جمع ہونا شروع ہو گئے اور جیل خانہ ہی میں افادہ واستفادہ کا سلسلہ چل پڑا، چار سال الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ اس ظلم واستبداد کا شکار رہے، روزانہ آپ کو کوڑے لگا کر عہدۂ قضاۃ کی قبولیت پر

مجبور کیا جاتا، مگر اس سلسلہ میں آپ قوی العزم تھے، تمام حالات کا سامنا کرنے مگر عہدہ قبول نہ کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ادھر دن بہ دن الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت جیل میں مقید ہونے کے باوجود بڑھتی جارہی تھی، اس واقعہ نے آپ کی عظمت واکرام، عقیدت واحترام کو مزید تر کردیا، اس لئے منصور کو کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا، بالآخر اس نے الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کو زہر دلوادیا، آپ کو جب اس کا علم ہوا تو سجدہ شکر بجالائے اور جان جانِ آفریں کے سپرد فرمادی۔

وفات:

یہ حادثۂ فاجعہ ۱۵۰ھ بروز جمعہ کو پیش آیا، الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر دیکھتے دیکھتے سارے شہر میں پھیل گئی لوگ جوق در جوق جمع ہونے لگے، آپ کے استاذ نے باچشم نم آپ کو غسل دیا اور انھوں نے ہی آپ کی پہلی نماز جنازہ پڑھائی جس میں پچاس ہزار آدمی شریک تھے، اس کے بعد پانچ مرتبہ اور نماز پڑھی گئی، آپ کی قبر شریف آپ ہی کی وصیت کے موافق خیزران کے مقبرہ میں بنائی گئی، تین دن تک مسلسل جنات کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں، آپ کے مزار پر بعد میں سلاطینِ وقت نے مقبرہ تعمیر کیا!

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ محدثین کی نظر میں

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک عظیم نشانی اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علومِ مبارکہ کے امین لاثانی ہیں، جن لوگوں نے عدل وانصاف اور دیانت وامانت سے کام لیا انہوں نے اس حقیقت کا برملا اظہار بھی کیا —— یہ اور بات ہے کہ ناانصافوں اور حاسدوں نے بے دلیل اس سے انکار کیا —— تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ بڑے بڑے علماء وائمہ نے اس امامِ عالی مقام کے مراتبِ عالیہ اور مقاماتِ فاضلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور بصد احترام خراجِ تحسین پیش کیا ہے —— چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ جیسے ناقد ومورخ رجال نے ان کا ذکر ابوحنیفۃ الامام الاعظم کے عنوان سے شروع کیا ہے، اور انھیں "متقی، عالم باعمل، عابد وزاہد اور بڑے مرتبہ کا حامل امام" قرار دیا ہے۔ اور چونکہ ان کی کتاب "تذکرۃ الحفاظ" باوجود

خاصی ضخیم ہونے کے بھی امام اعظم کے مناقب کثیرہ درج کرنے کی گنجائش نہ رکھتی تھی اس لئے" مناقب هذه الامام قد افردتها فی جزء" فرما کر اس کے لئے مستقل رسالہ لکھنے کی اپنی سعادت پر مطلع کیا ہے۔ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ انہیں" افقہ الناس، امام المسلمین اور بلاد علم کی زینت" سمجھتے تھے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تمام علماء کو دین کے علم میں" ان کی اولاد" قرار دیتے تھے۔یزید بن ہارون رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دور میں" ورع وتقویٰ" میں ان سے بڑھ کر کوئی شخص نظر نہ آیا تھا۔ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں" امام" فرمایا۔امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی فقہ میں باقاعدہ جستجو کے بعد بھی" کوئی بات خلافِ قرآن وسنت نظر نہ آئی"۔ابراہیم ابن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ" ان کی محبت کو اہل سنت میں سے ہونے کی علامت" قرار دیتے تھے۔ابنِ حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک" عظیم بشارت کا مصداق" سمجھتے تھے۔امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روایات ازبر کر رکھی تھیں اور ان کے اقوال پر پورے اعتماد سے فتویٰ دیا کرتے تھے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ان کی" پرہیزگاری اور مہارتِ علم" کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو" ان کی پرہیزگاری وتقویٰ شعاری" پر فخر تھا۔مکی بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا فرمانا تھا کہ" وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم" ہیں۔شعبہ ابنِ حجاج رحمۃ اللہ علیہ ان کے علم وفضل، فہم وفراست اور قوتِ حافظہ سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کیلئے دعائے خیر کو اپنا معمول بنالیا تھا۔سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ" انہیں روئے زمین کا سب سے بڑا عالم مانتے تھے"۔سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کو" دنیا میں ان کی نظیر نظر نہ آئی تھی"۔یحییٰ ابن معین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک" وہ علم دین میں لاجواب شخصیت کے حامل" تھے۔ابوبکر اعمش رحمۃ اللہ علیہ کے خیال میں" ان کے علم میں خصوصی برکت" رکھی گئی تھی۔یحییٰ ابن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک" فہم دین میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا"۔حماد ابنِ سلمہ کے نزدیک وہ" بلند پایہ متقی" تھے——وغیرہ وغیرہ

یہ چند اقوال ہیں جو تاریخ کے چند بلند پایہ محدثین وعلماء کے ہیں ورنہ دنیا بھر کے ہزاروں لاکھوں علماء اعلام وائمہ اسلام کی ان کے بارے میں تحقیقات وتائیدات جمع کی جاویں تو" سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کیلئے"۔چنانچہ" مناقبِ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ" کے عنوان پر

چھوٹی بڑی درجنوں محققانہ، فاضلانہ تصنیفات نے تاریخِ اسلام کے ذخیرہ کو جو رونق بخشی ہوئی ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ طبقاتِ احناف کی کتب میں صرف "جواھر المضیئہ" کو لیجئے جس میں دو ہزار سے زائد علماء احناف کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب علماء اعلام امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل کے معترف اور شاہد ہیں، وکفی بہ تسلیماً۔

پھر یہ حقیقت بھی ہر صاحبِ سمجھ کو معلوم ہے کہ دنیا میں جہاں ایسے نیک خصال وحق شناس حضرات موجود ہیں جو کسی کے فضل وکمال کو دیکھ کر خوش ہوتے اور صمیمِ قلب سے اس کا اعتراف کرتے ہیں، وہیں ایسے کم ظرف وبے ہمت افراد بھی ہیں جن سے کسی کی بزرگی وفضل دیکھا نہیں جاتا اور وہ اسے برداشت نہیں کرسکتے۔ اور حسد کی خباثت میں مبتلاء ہوجاتے ہیں۔ یہی معاملہ الامام الاعظم علیہ الرحمہ کے ساتھ پیش آیا۔ چنانچہ ان تمام واضح اور بین شہادتوں کے باوجود (جو اہل علم وکمال کی زبان وقلم نے ثبت کیں) کچھ حاسدین بعض غیر معتبر مورخوں کی حاسدانہ تنقیدوں یا بعض معتبر علماء کی غلط فہمیوں کا سہارا لیکر انہیں "قلیل البضاعۃ فی العلم" اور "قلیل الروایۃ بالحدیث" ثابت کرنے کی ناکام کوشش ہر زمانے میں بالخصوص اس دورِ فتن میں کررہے ہیں۔ ماضی میں بھی وقتاً فوقتاً اس مزاج کے لوگ وجود میں آتے اور اپنی موت مرتے رہے، ان کا نام ونشان بھی مٹ گیا مگر الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اب بھی بے مثال اور ان کا علم بفضلہٖ تعالیٰ لازوال ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

خلاصہ یہ ہے کہ حقائقِ تاریخیہ اور وقائعِ صادقہ کی روشنی میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ عالم، راسخ فی العلم فقیہ اور بابصیرت محدث تھے، ان کی تحقیقاتِ علمیہ اور مسائلِ فقہیہ کو جو عالمی ودائمی قبولیت حاصل ہوئی وہ مطابقتِ کتاب وسنت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، اس کا انکار ضد وتعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

حقیقت اعتراضات:

یوں تو اہل دُنیا کے اعتراضات سے حضرات انبیاءؑ کے نفوس قدسیہ وذوات عالیہ بھی

محفوظ نہ رہ سکیں، اوروں کا کیا شمار وقطار؟ اس لئے یہ مسئلہ کچھ بہت قابل اعتناء نہیں، تاہم اگر ہم الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ناقدین ومعترضین کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں اکثر تو وہ ہیں کہ جن کے اعتراضات کی حقیقت الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی سبقت واولیت، ان کے فقہ کی اہمیت، ان کے لئے امامت عظمیٰ کی خصوصیت، عالم اسلام کے ایک بڑے حصہ میں ان کے مسلک کی ترویج وقبولیت پر حسدا من عند انفسھم سے زیادہ نہیں، البتہ ان میں ایک چھوٹی سی تعداد ایسے ناقدین کی بھی ہے جن کے اعتراض وتنقید سے اعراض نہیں کیا جا سکتا، لیکن علمائے احناف کے متقدمین ومتاخرین بلکہ غیر حنفی مصنفین ومحقق مورخین نے بھی ان بزرگوں کے اعتراضات کو تحقیق وانصاف کی میزان میں رکھ کر بدلائل واضحہ ثابت کر دیا کہ اس کا سبب صرف الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی جلالتِ علمی ومنصبِ دینی سے ان کی بے خبری، ہم کنیت وہم نام معاصرین کی زیادتی، اعداء وحاسدین کی قلمی ولسانی بے باکی تھی جو ان حضرات کی الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں غلط فہمی وبدظنی کا باعث ہوا۔

ھذا ما اعرف وافھم واللہ تعالیٰ اعلم واحکم

ناصر اہل السُّنہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

امام کا اسم گرامی احمد بن حنبل، کنیت ابوعبداللہ اور القاب امام الائمہ ناصر السنۃ وغیرہ ہیں، حضرت الامام نسلاً شیبانی اور وطناً بغدادی ہے، قبیلۂ شیبان صبر واستقامت، ہمت وجواں مردی میں تاریخی حیثیت کا حامل ہے، ان کے آباء واجداد تعلیم یافتہ، باحوصلہ لوگوں میں سے تھے، دادا حنبل کبھی سرخس کے حکمران بھی تھے، بغداد میں ان کے والد مرو سے تشریف لائے تھے، اس وقت امام اپنی والدہ کے بطن ہی میں تھے، ربیع الاول ۱۶۴ھ میں بغداد میں امام کی ولادت ہوئی، ولادت سے قبل ہی والد محترم وفات پاچکے تھے، ماں نے بڑے حوصلے اور ہمت سے ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کو نبایا، یتیمی، بے مائیگی اور معاشی تنگ حالی میں نشوونما پانے اور مصائب وشدائد میں زندگی گذارنے کا ایک فائدہ الامام کو یہ ہوا کہ تحمل، جفاکشی، عزم واستقلال اور خوداعتمادی وخودداری جیسی جامع صفات ان کے اندر پختگی اختیار کرگئیں، بہرحال والدہ محترمہ کے سایۂ عاطفت میں ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے انھوں نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، اور بہت کم سنی میں اس کی تکمیل کرلی۔

پھر تحریر وانشاء کا فن اچھی طرح حاصل کیا، علوم دینیہ میں آپ نے اپنی توجہ علم حدیث کی طرف مبذول کی اور بڑے ہی شوق وذوق اور صبر واستقامت کے ساتھ اس راہ کی (خصوصاً اُس زمانہ میں) جو صعوبتیں تھیں انہیں جھیلا اور اس علم میں کمال حاصل کیا، اس کے لئے امام نے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، شام، یمن، کوفہ، بصرہ اور جزیرہ وغیرہ کے طویل اور پُرمشقت اسفار کئے؛ اور اپنے وقت کے نامی گرامی فخر زمانہ اور کبار اساتذہ سے کسب فیض کیا

ان میں سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید القطان، وکیع، عبدالرزاق اور ابن علیہ وغیرہ اکابر محدثین شامل ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے وضاحت فرمائی ہے کہ امام میں بچپن ہی سے طبعی شرافت ونجابت اور فکری پاکیزگی وطہارت پائی جاتی تھی، اخلاق وکردار میں اونچے مقام کے حامل تھے، تحصیلِ علم کے بعد امام نے علم حدیث کی تدریس وتبلیغ کو اپنا مشغلہ بنایا، امام کا علم حدیث میں مقام کس قدر اونچا تھا اس کے اندازہ کیلئے صرف ان کے تلامذہ کے نام جان لینا بھی کافی ہے، امام کے سینکڑوں مایۂ ناز شاگرد ہوئے ہیں، ان میں ان کے صاحبزادگان کے علاوہ، علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ، بخاری رحمۃ اللہ علیہ، مسلم رحمۃ اللہ علیہ، ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، اور ابوزرعہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اسماء گرامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کے درس میں کم از کم ۵ ہزار آدمی شریک رہتے تھے، ان میں سے پانچ سو قلم و دوات والے ہوتے تھے، یعنی امام کی تقریر کو کتابت کے ذریعہ محفوظ کیا کرتے تھے، ان کے علاوہ بہت سے وہ حضرات ہوتے جو ان کے صحبتِ مبارکہ اور مجالس شریفہ میں محض حسنِ ادب وحسنِ اخلاق سیکھنے کے لئے اکٹھا ہوتے تھے۔

بہرحال قدرت کے فیاض ہاتھوں نے امام کے اندر بے شمار خصوصیتیں اور شمائل وخصائل ودیعت رکھی تھیں جن کو تفصیلاً امام کے تذکروں میں دیکھا جاسکتا ہے اس مختصر تعارفی خاکہ میں ان کی گنجائش کہاں؟ یہاں صرف امام کے معاصرین اور تلامذہ کے چند تاثرات اور خراجہائے عقیدت نمونہ کے طور پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، ان سے امام کے علم وفضل کی رفعتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سیدنا الامام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: بغداد سے نکلتے وقت میں نے علم وفضل، تقویٰ وپرہیزگاری میں کسی کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھا ہوا نہیں چھوڑا۔

حافظ الحدیث ابوزرعہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام کو دس لاکھ احادیث ازبر تھیں، اور بغداد کا پُل عبور کرکے آنے والوں میں ان سے زیادہ فضل وبزرگی والا کوئی شخص نہیں ہے۔

شارحِ بخاری ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی احاطہ نہ کر سکا سوائے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اور یہ وہ شرافت ہے جس نے امام کو ساری دنیا کے سلف و خلف میں ممتاز کر دیا ہے۔

ابراھیم حربی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: میں نے دنیا کی عظیم ورئیس شخصیتوں سے ملاقات کی ہے مگر عظمت ووقار میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔

استاذ بخاری علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس امت کی اللہ پاک نے دو عظیم شخصیتوں کے ذریعہ عزت افزائی فرمائی۔ ایک یوم الردۃ میں صدیقِ اکبرؓ کے عزم وحوصلہ کے ذریعہ دوسرے یوم المحنۃ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے استقامت وتحمل کے ذریعہ۔

اسحاق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ زمین پر اللہ اور اس کے بندول کے درمیان حجت ہیں، میں نے بہ یک وقت علم وفضل، زہد وتقویٰ، معرفت واحسان، اور اخلاقِ حسنہ کا جامع ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا۔

ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے کم از کم سو علماء ومشائخ محدثین سے ملاقات کی ہے مگر وفورِ علم اور شدت وقار میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا، لوگوں کی گفتگو میں بلا وجہ دخل نہ دیتے اور اکثر خاموش رہتے۔

امام قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اُنہیں امام الدنیا قرار دیا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اپنے وقت کے کبارِ علماء ومحدثین کی نظر میں ان کا بہت اونچا مقام تھا اور ان سب کی زبانیں امام کی تعریف وتوصیف میں ایک تھیں، ان کی زندگی کا سب سے تابناک اور ایمان افروز واقعہ فتنہ خلق قرآن کے موقعہ پر ان کا اپنے عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا اور تمام آنے والے مصائب کا خندہ پیشانی اور بلند ہمتی سے مقابلہ فرمانا ہے، حتیٰ کہ سلطان وقت کے جبر وستم کے آگے بھی ہتھیار نہیں ڈالا، اسی ثبات واستقامت اور تمسک بالحق اور اعتصام بالسنۃ کو دیکھ کر کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے محبت رکھنا اہلسنت ہونے کی علامت ہے، اور ان سے بغض رکھنے والوں کا اسلام مشکوک ہے۔

بغداد میں جمعہ کے دن ۱۲ / ربیع الاول ۲۴۱ھ کی شب بعمر ۷۷ سال اس دار فانی سے رحلت فرمائی، ان کی نمازِ جنازہ بھی تاریخِ اسلام میں ایک کرامت سے کم نہیں ہے، قلوبِ انسانی پر ان کی محبت وتعلق کے غلبہ وحکومت کا یہ عالم تھا کہ اس بوریہ نشین کے جنازہ کی مشایعت کے لئے بلا لحاظ مذہب وملت جو جمِ غفیر اکٹھا ہوا تھا اندازہ کرنے والوں نے اندازہ کیا کہ وہ تیرہ تا اٹھارہ لاکھ افراد پر مشتمل ہوگا۔ تقریباً ساٹھ ہزار عورتیں اسکے علاوہ تھیں۔ عبد الوہاب وراق کے بقول تاریخ میں کسی کے جنازہ میں جمع ہونے والوں کی اتنی تعداد جو امام کے جنازہ میں شریک تھی کہیں نہیں ملتی۔ نہ عہدِ جاہلیت میں نہ دورِ اسلام میں۔ **سبحان اللہ العظیم وبحمدہ**۔ یہ بھی مورخین نے لکھا ہے کہ صاحبزادہ سے ایک دفعہ فرمایا تھا، بدعتیوں (خلق قرآن کی مدعیوں) سے کہدو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کا دن میرے جنازہ کا دن ہوگا۔ اور اس سے بڑھ کر ان کے اہل حق ومقبول عند اللہ ہونے کا محکم فیصلہ کیا ہوگا، اسی پر بس نہیں یہ بات بھی تاریخ کے سینہ میں محفوظ ہے کہ کم از کم بیس ہزار غیر مسلم اس دن مشرف بہ اسلام ہوئے۔ **رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ**

امام جسمانی طور پر اس دُنیا سے اگر چہ پردہ فرما گئے مگر اپنی خدماتِ دینیہ کے ذریعہ سینکڑوں نامور محدثین وفقہاء کو پیدا کر کے قیامت تک کے لئے اپنے وجود روحانی اور فیضان علم کو درخشاں وتابندہ چھوڑ گئے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شُد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

پاسبانِ توحید وسنت دشمنِ رسوم وبدعت

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخِ اسلام کی ان نامی گرامی شخصیتوں میں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے معاشرہ کی اسلامی صلاح وفلاح اور اس کی درستگی واصلاح کے لئے بطور خاص ظاہر فرمایا تھا، حضرت شیخ المشائخ عارفِ کبیر، داعی توحید وسنت، ماحی شرک وبدعت السید عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ کا اسمِ گرامی صفِ اول میں نظر آتا ہے، عالمِ اسلام کا بچہ بچہ کم از کم ان کے نام سے تو ضرور واقف ہے، مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ہر جگہ ایسی مل جائے گی جو ان کی ولایت وبزرگی کو بھی تسلیم کرتی ہے مگر جہاں تک ان کی شخصیت وخدمت کا تعلق ہے کم ہی لوگ اس سے صحیح طور پر باخبر ہوں گے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اہل اللہ اور بزرگانِ دین —— جنھیں مشائخ وصوفیاء سے تعبیر کیا جاتا ہے —— کی حسین وبے غبار زندگیوں اور عظیم المرتبت وبے مثال کارناموں پر غالی عقیدت مندوں نے من گھڑت قصوں اور بے سروپا کہانیوں کا کثیف وغلیظ پردہ ڈالدیا ہے جس کے نتیجہ میں عام مسلمان ان شخصیتوں کو ہندوؤں کی طرح کوئی مافوق البشر ہستی اور کوئی عجیب الخلقت شئی سمجھنے لگے یا یہود ونصاریٰ کی طرح خدا کا جزو یا اس کی ہستی کا مظہر تصور کرنے لگے، اس وجہ سے ان کی زندگی کا مشن اور ان کی محنتوں اور دعوتوں کا پیغام مسلمانانِ عالم تک صحیح معنوں میں پہونچ نہ سکا، بہت کم مشائخ ہوں گے جن کا تذکرہ رطب ویابس اور لغو ولایعنی روایات وحکایات سے پاک ہو یہی حال سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکروں اور سوانحی خاکوں کا ہے۔

عصر حاضر کے عظیم مفکر ومورخ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ دعوت وعزیمت کے نام سے پانچ ضخیم مجلدات میں جن اکابرین اور مصلحین ومجددین کا تذکرہ کیا ہے اور بڑی عرق ریزی اور برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد نہایت ہی مستند ومعتبر طریقے پر مرتب فرمایا ہے ان میں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مبارک تذکرہ بھی شامل ہے۔

اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آج جس مبارک ومسعود وفخر انسانیت ہستی کے نام پر ——خصوصاً ہمارے علاقوں میں—— شرک وبدعات اور من گھڑت رسوم والتزامات کی گرم بازاری ہے اس مبارک ہستی کا اصل مشن، روح دعوت اور حاصلِ زندگی توحید وسنت کے احترام اور اس کی حفاظت واشاعت کے علاوہ کچھ نہیں تھا، خدا بُرا کرے جہالت اور اندھی تقلید کا کہ اس نے حضرت کی زندگی کی حقیقی تصویر کو کس طرح مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور ان کے پیغام عام کو کس طرح یکسر تبدیل کر دیا ہے، ممکن ہے بعض طبیعتوں کو ہماری یہ سطریں گراں گذریں لیکن روشنیٔ علم کے ذریعہ ظلمتِ جہل کو چھانٹنا اور تاریخ کے حقائق پر دروغ کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں انہیں اٹھانا بھی ایک فریضہ ہے، اس فریضے کی ادائیگی سے عقیدے کے مریضوں اور شرک کے جراثیم سے متاثر لوگوں کو کچھ تکلیف ہو تو ہو لیکن انصاف کے متوالوں اور حق کے متلاشیوں کو بہت خوشی ہوگی، اور اس عظیم المرتبت داعیٔ اسلام وشیخِ طریقت کی بابت پھیلی ہوئی یا پھیلائی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔ ذیل میں تاریخ کے مستند حوالوں سے شیخ کے چند ملفوظات پیش کئے جا رہے ہیں جو اربابِ علم وعمل کیلئے انشاء اللہ چشم کشا اور روح افزا ثابت ہوں گے۔

توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

ایک ایسی فضا میں کہ جس میں ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع وضرر کا مالک سمجھ لیا تھا اسباب کو ارباب کا درجہ دے دیا گیا تھا اور قضاء وقدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں کے متعلق سمجھ لیا گیا تھا حضرت شیخ فرماتے ہیں: ”کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے—— جس کا مالک

بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب وادب دل ہلا دینے والا ہے ـــــ ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست پاٹ بہت بڑا اور بہاؤ بہت زوروں پر ہے لٹکا دیا ہے اور خود نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے تشریف فرما ہے اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹا کے اور اس سے خوف و امید ترک کر کے، لٹکے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے؟ کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل، بے ادراک دیوانہ چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے؟ خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی اور وصول کے بعد جدائی، قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی ایمان کے بعد کفر سے۔''

توحید و اخلاص اور ماسوا اللہ سے انقطاع کی تعلیم

''اس پر نظر رکھو کہ اس کے سامنے ہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا اور ہلاکتوں سے بچائے گا نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا، تم کو تمہارے سڑاہنڈ اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار اور رفیقانِ گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین خواہشیں اور جاہل دوست ہیں وہ خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفیس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے ہیں۔ کب تک عادت، کب تک مخلوق، کب تک خواہش، کب تک رعونت اور کب تک ماسوائے حق کے پیچھے رہو گے؟ کہاں چلے تم اس خدا کو چھوڑ کر جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور بنانے والا ہے اول ہے آخر ہے ظاہر ہے باطن ہے، دلوں کی محبت روحوں کا اطمینان گرانیوں سے سبکدوشی، بخشش و احسان ان سب کا رجوع اسی کی طرف ہے اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے۔''

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح واشگاف فرمایا

"ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، حق تعالیٰ اس کو ان کے ہاتھوں کرادیتا ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ جو موحد اور نیکوکار ہیں وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے خالی ہیں گو دولت مند ہیں مگر حق تعالیٰ ان کے اندروں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں جو صاف ہیں، جس کو یہ مقام مل گیا اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی وہی بہادر پہلوان ہے، بہادر ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوا اللہ سے پاک بنایا اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہوگیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا اور اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہے۔"

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز وہ جس پر تو اعتماد کرے وہ تیرا معبود ہے اور ہر وہ شخص جس سے تو خوف کرے یا توقع رکھے وہ تیرا معبود ہے اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ اسی کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے تو وہ تیرا معبود ہے۔

خدا کی غیرت، شرکاء سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہوجانے کی حکمت

"تم اکثر کہتے ہوگے اور کہو گے کہ میں جس سے محبت کرتا ہوں اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی اور رخنہ پڑتا ہے یا تو جدائی ہوجاتی ہے یا وہ مرجاتا ہے یا اس سے کوئی رنجش ہوجاتی ہے، اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہوجاتا ہے اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے

ایسے وقت تم سے کہا جائیگا کہ اے خدا کے محبوب اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے، اے وہ کہ جو خدا کا منظورِ نظر ہے، اے وہ کہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے، اس نے تم کو اپنے لئے پیدا کیا ہے اور تم غیر کے ہو کر رہنا چاہتے ہو؟ کیا تم نے خدا کا ارشاد نہیں سنا کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے؟ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے مبتلا کرتا ہے پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے عرض کیا گیا یا رسول اللہ! رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اس کے مال واولاد کو باقی نہیں رکھتا اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال واولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی اور خدا سے جو محبت اسے ہے وہ متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی خدا شریک کو قبول نہیں کرتا وہ غیور ہے اور ہر چیز پر غالب اور زبردست ہے وہ اپنے شریک کو ہلاک ومعدوم کر دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے بندے کے دل کو خالص کر لے خاص اپنے لئے بغیر شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ اسے یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل وعیال دولت ولذت اور خواہشیں نیز ولایت وریاست، کرامات وحالات، منازل ومقامات، جنتوں اور درجات اور قرب ونزدیکی کی طلب سے پاک وصاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی اور وہ سوراخ دار برتن کی طرح ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے تب اس کے دل کے اطراف عظمت وجبروت وہیبت کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور اسکے گرداگرد کبریائی اور سطوت کی خندقیں کھود دی جاتی ہیں کہ دل میں کسی اور چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل وعیال واصحاب اور کرامات وبیانات کچھ مضر نہیں ہوتے کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ ان سے غیرت نہیں کرتا بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کیلئے بطور لطف وکرامت اور رزق ونعمت کے ہوتی ہیں اور جو لوگ اس

کے پاس آتے ہیں انہیں نفع پہونچانے کے لئے کام دیتی ہیں۔(دعوت وعزیمت)

دیکھا آپ نے! یہ ہے شیخ کا خالص توحید وسنت کی دعوت پر مبنی مشن، اسے دیکھئے اور موجودہ زمانہ میں ان کے اہل سلسلہ لوگوں کا طرز عمل دیکھئے، آج مسلمانوں کی ایک جماعت انہی کو حاجت روا، مشکل کشا اور دستگیر ومددگار نہ معلوم کیا کیا سمجھتی ہے، بلکہ بعض رسالوں میں ایسے واقعات نقل کردیئے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی انہوں نے مدد کی ہے۔(**والعیاذ باللہ من ھذا الجھل والالحاد**)

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ سب مسلمانوں کو ان داعیانِ حق کی صحیح اتباع کی توفیق نصیب فرمائے۔آمین

علامہ ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ [1]

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ محقق، مفسر ومحدث، ادیب ومورخ، فقیہ ومصنف، زاہد ومتقی بزرگ تھے، ان کے والد کا نام لطیف احمد تھا، نسباً عثمانی، وطناً تھانوی تھے۔ ۱۳/ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو بمقام دیوبند پیدا ہوئے، جب تین برس کے تھے تب ہی والدہ (جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی حقیقی بہن تھیں) انتقال کر گئیں، آپ کی نانی ــــــ جو نہایت ہی صالحہ اور حاجہ تھیں ــــــ نے ان کی پرورش کی اور اپنی خداداد صلاحیت وصالحیت کے ذریعہ نہایت ہی عمدہ تربیت کی، پانچ برس کی عمر میں قرآن کریم کی تعلیم شروع ہوئی، دیوبند کے نامور قراء کے پاس ناظرہ قرآن پڑھا، جن میں حافظ نامدار، حافظ غلام رسول، حافظ نذیر احمد صاحب رحمہم اللہ (جو دارالعلوم میں اس وقت کے اساتذہ تھے) شامل ہیں، اردو، ہندی، فارسی اور ریاضی کی ابتدائی تعلیم فقیہ اعظم مفتی محمد شفیع صاحب کے والد گرامی حضرت مولانا یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاصل کی انہوں نے گلستاں اور بوستاں تک پڑھایا، مولانا کے والد گرامی کی خواہش عصری تعلیم پڑھانے کی تھی مگر آپ کو اس سے بالکل مناسبت نہ تھی بلکہ طبعی دوری تھی، اس لئے دیوبند سے اپنے ماموں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں منتقل کر دیئے گئے جہاں آپ نے باقاعدہ درسِ نظامی کا سلسلہ شروع کیا۔

اس وقت آپ مولانا عبد اللہ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر درس وتربیت تھے، حضرت حکیم الامتؒ سے بھی تجوید وتلخیصات اور مثنوی شریف کا کچھ حصہ پڑھا، جب آپ ابتدائی تعلیم

[1] یہ مضمون شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جو مدیر اشرف الجرائد نے اردو میں ترجمہ کر کے قارئین کے نذر کیا تھا۔

سے فارغ ہوئے اس وقت حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر "بیان القرآن" کی تالیف میں مشغول تھے، اس لئے پڑھانے کا سلسلہ جاری نہ تھا تو آپ کو جامع العلوم کانپور بھیج دیا گیا، جو حکیم الامت ہی کا قائم کردہ مدرسہ تھا، وہاں پر آپ نے ان کو اپنے خاص شاگردانِ گرامی مولانا محمد اسحاق بردوانی، اور مولانا رشید احمد کانپوری کے سپرد فرمایا، چنانچہ ان ہی حضرات سے آپ نے دورۂ حدیث شریف کی تکمیل فرمائی جس میں سے صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف کو درساً پڑھا اس کے علاوہ کتبِ فقہ وتفسیر، کتبِ معقولات، اور کتب اصولِ فقہ وحدیث بھی انہی حضرات سے پڑھیں اور ممتاز نمبرات سے کامیابی حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور پہونچ کر اپنے وقت کے عظیم المرتبت عالم وعارف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مزید علم کی پیاس بجھانے لگے، قابلِ لحاظ مدت قیام واستفادہ کے بعد ان کو حضرت سہارنپوریؒ نے اپنی جانب سے حدیث شریف اور تمام علوم نقلیہ وعقلیہ میں اجازت وسند عطا فرمائی؛ ان کے علاوہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا یحیٰی صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سندِ حدیث سے مشرف فرمایا، اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، ظاہر ہے کہ اس عمر میں ان علوم میں درک و مہارت اور سندِ اجازت کا ملنا عادۃً آسان نہیں، یہ کسی عبقری اور نابغہ روزگار شخصیت کے لئے ہی ممکن ہے، چنانچہ اسی علمی کمال اور فہم ووجدان کی پختگی کے مدنظر آپ کے اساتذہ نے آپ کو مدرسہ مظاہر علوم کی تدریس کا کام سپرد کیا یہاں آپ نے فقہ اصولِ فقہ، منطق وفلسفہ اور متعدد فنون میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

۱۳۳۸ھ میں جب جامعہ مظاہر علوم کے اکثر اساتذہ حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو آپ نے بھی ان کے ساتھ رختِ سفر باندھا، روانگی سے قبل حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث مسلسل باجازت دعا فی الملتزم کی اجازت حاصل کی، قیام سہارنپور کے دوران مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبد الرحمن

صاحب کیمل پوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی آپ سے استفادہ علم کیا، پھر مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون منتقل ہوگئے۔

جہاں اپنے ماموں و مربی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت وسرپرستی میں صحاح ستہ کی تدریس اور فتاویٰ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے اور باحسنِ وجوہ کام کیا، درسِ ترمذی میں ایک بڑی جماعت نے آپ کے چشمۂ علوم سے سیرابی حاصل کی اور آپ کے علم کی روشنی اقطاعِ عالم میں پہونچنے لگی اور جو فتاویٰ اور تحقیقاتِ فقہیہ اس زمانہ میں آپ کے قلمِ فیض رقم سے جاری ہوئے وہ بعد میں سات ضخیم جلدوں میں "امداد الاحکام" کے نام سے شائع ہوئے، جو آپ کے علم وتحقیق کے بلند پائیگی کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہیں، پھر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے جب انہیں علم وتحقیق ورع واحتیاط میں اپنا ہم مزاج ومذاق بنالیا اور ان کے ذریعہ سے حسبِ منشاء فیض عام اور نفعِ تام ہوتا ہوا دیکھ لیا تو ان کے ذمہ اپنی ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل کا کام بھی کردیا، یعنی احادیث شریفہ کی فقہ حنفی کے مطابق تدوین چنانچہ آپ نے بیس برس کی محنتِ شاقہ اور سعی مسلسل سے اٹھارہ ضخیم مجلدات میں اس کام کو بہتر طریقہ پر بفضلہٖ تعالیٰ تکمیل فرمایا، جو "اعلاء السنن" کے نام سے علماء وفقہاء کیلئے سرمہ بصیرت بنی ہوئی ہیں، اس کام کے ہوجانے کے بعد انھوں نے دو جلدوں میں ایک محققانہ وفاضلانہ مقدمہ بھی رقم فرمایا جس کے بابت کہنا چاہئے کہ وہ فن "قواعد الحدیث" اور فن "قواعد الفقہ" پر مستقل تصنیفات ہیں جس کی تبویب اور تحقیق پر اپنے وقت کی بڑی بڑی علمی شخصیات داد دیے بغیر نہ رہ سکیں۔

جب یہ کام بھی ہوگیا تو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں احکام القرآن للجصاص رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر فقہ حنفی کی روشنی میں کام کرنے کا حکم دیا، جس کا نام "دلائل القرآن علی مسائل النعمان" خود ہی تجویز فرمایا، الحمد للہ اس کے ایک حصہ کی تکمیل بھی آپ کے ذریعہ دو جلدوں میں وجود میں آچکی "احکام القرآن" ہی کے نام سے مطبوع مجموعہ میں شامل ہے، ان تین علمی کارناموں (۱) دلائل القرآن فی مسائل النعمان (۲) اعلاء السنن اور

(۳)انھا إلسکن الی من یطالع اعلاء السنن کے علاوہ مندرجہ ذیل تصنیفات بھی آپ کے قلم کی یادگار ہیں، (۴)انجاء الوطن عن الازدراء بامام الزمن اس میں آپ نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اوران کے تلامذہ کے احوال نہایت مستند ومعتمد طریقہ پر جمع فرمائے ہیں (۵)القول المتین فی الاخفاء بآمین بزبانِ اردو(۶)شق الغین عن من رفع الیدین اردو(۷)رحمۃ القدوس فی ترجمۃ بھجۃ النفوس اردو(۸)فاتحۃ الکلام فی قرأۃ خلف الامام (۹) کشف الدجیٰ عن وجہ الربا اردو(۱۰)امداد الاحکام عن مسائل الحلال والحرام وغیرہ کل ۳۶ تصنیفات۔

آپ دوسال کیلئے برما میں مقیم رہے اوروعظ وتذکیر کے ذریعہ عام اصلاحی خدمات وہاں کے مخصوص احوال وضرورت کے تحت انجام دیتے رہے، پھر واپس تھانہ بھون آگئے اور حسبِ معمول تالیف وافتاء کے کام میں مشغول ہوگئے، بعدازاں ڈھاکہ تشریف لے گئے وہاں مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں صدرالمدرسین کے عہدہ پر فائز رہے، آٹھ سال وہیں قیام رہا یہاں قیام کے دوران ایک مدرسہ جامعۃ القرآن والعربیۃ قائم فرمایا پھر ٹنڈو الہ یار حیدرآباد سندھ منتقل ہوگئے اوروہاں شیخ الحدیث کے بابرکت عہدہ پر تادم واپسیں قائم رہے اور حدیثِ رسول کی خدمات دیتے ہوئے ۲۳/ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ یکشنبہ کی صبح بہ عمر ۹۰/سال اس دنیائے فانی کو خیرباد فرما کر عالمِ جاودانی منتقل ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

پیرانہ سالی اورضعف وبیماری کے باوجود حدیث شریف کی تدریس، نماز باجماعت کا اہتمام اوراوراد ووظائف کی پابندی ترک نہیں فرمائی تھی، فرماتے تھے کہ جب بیماری شدت اختیار کرتی ہے تو بخاری کا درس بڑھا دیتا ہوں، اس کی برکت سے قوت آجاتی ہے؛ ان کی تاریخ وفات ان کے صاحبزادے نے انہ لفی روح وریحان وجنۃ نعیم سے نکالی ہے(۱۳۹۴)۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین

بابِ دوم
بعض اکابرِ اہلِ عصر

آہ! حضرت مولانا محمد یوسف بستوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ——خلیفہ محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ——۵/۶ رمئی کی درمیانی شب ایک حادثہ کے ظاہری سبب میں انتقال ہوگیا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا وطنی تعلق اتر پردیش کے مشہور ومردم خیز ضلع "بستی" سے تھا، مولانا کی ابتدائی تعلیم غالباً وطن ہی میں ہوئی۔ اور علومِ اسلامیہ کی تکمیل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے ہوئی۔ فراغت کے بعد دہلی، تھانہ بھون اور الٰہ آباد وغیرہ میں ایک عرصہ تک درسی ودعوتی خدمات میں مخلصانہ طور پر لگے رہے۔ آخر میں جب اپنے ہی وطن "بستی" میں مستقل قیام اور دینی خدمات کا ارادہ ہوا تو وہاں پہنچ کر انٹر کالج کے احاطہ میں واقع "مسجد خیر" میں اہل طلب کی تعلیم اور عمومی دعوت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا، پھر وہیں باقاعدہ ایک دینی درسگاہ کی بناء "جامعہ خیر العلوم" کے نام سے ڈالی، اور مدت العمر اسکی توسیع وترقی واستحکام وانتظام میں لگے رہے۔ مولانا مستند عالمِ دین ہونے کے علاوہ صاحبِ ارشاد شیخ طریقت بھی تھے اور سلوک وتصوف کی ابتدائی منزلیں خانقاہِ وصی اللّٰہی میں مصلح الامۃ حضرت شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ سے طے کی تھیں۔ ان کے وصال کے بعد "بزم اشرف" ہی کے ایک اور "روشن چراغ" محی السنہ حضرت مولانا شاہ محمد ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا۔ کچھ ہی مدت میں تزکیہ وتصفیہ کے اس مقام پر پہونچے جہاں مشائخ کو سالکین کی حالت قابلِ اطمینان اور لائق اعتماد نظر آیا کرتی ہے —— چنانچہ بارگاہ محی السنہ سے خلافت واجازتِ بیعت سے سرفراز فرمائے گئے —— اور ساری زندگی مختلف علاقوں

میں موجود اہل تعلق کو باطنی وروحانی فیوض سے مستفید فرماتے رہے۔ ادھر چند سالوں سے عارضۂ قلب، بلیڈ پریشر وغیرہ امراض کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اس خصوص میں تبدیلی آب وہوا کی خاطر احباب اور اطباء کے مشورہ سے سال میں ایک دو دفعہ کلکتہ، بھونیشور، بمبئی، بھٹکل اور حیدرآباد کے سفر فرماتے رہے۔ انہیں ان اسفار میں آرام تو کیا ملتا تھا ہوگا البتہ ہر جگہ کے محبین مخلصین اور اہل تعلق کو علمی وروحانی فیض ضرور حاصل ہوجاتا تھا۔

حیدرآباد میں ان کا قیام عموماً جناب جنت حسین صاحب کمشنر راشننگ کے مکان پر رہتا مگر زیادہ وقت مدرسہ فیض العلوم، ادارہ اشرف العلوم میں گذارتے، درخواست پر وعظ بھی فرمایا کرتے۔ اور عمومی مجالس میں بہت ہی بے تکلفی سے ہم اصاغر کے سامنے اکابر کے حالات وواقعات یا اپنے نعتیہ کلام سنا کر محظوظ فرماتے۔

فرماتے تھے کہ حضرت شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے ایک دفعہ فرمایا: مولانا یوسف! اپنا ایک ذاتی مکان ضرور بنالو، یہ بدعتی لوگ مسجد سے نکال دیں اور پریشان کرنے لگیں تو سر چھپانے کو اپنا کوئی ٹھکانہ تو ہونا چاہیئے، چوں کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وطن میں ان حالات سے گذر چکے تھے اس لئے مجھے اس طرف خصوصیت سے توجہ فرمایا، اور ہے بھی واقعی بہت کام کی بات۔

ایک اور واقعہ اکثر سناتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ مجلس میں اچانک کسی کو بھی کھڑا کر کے کوئی سوال فرماتے تھے، جس کا جواب دینا ہی پڑتا تھا، اکثر اس کے جواب میں پھر ان کا عتاب بھی ہوجایا کرتا تھا؛ ایک دن مجھ سے فرمایا: مولوی یوسف! تم اتنے دنوں سے یہاں پڑے ہوئے ہو، یہاں رہنے سے تمہیں کیا ملتا ہے؟ کیوں یہاں پڑے رہتے ہو؟ میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا: حضرت! مجھے یہاں آکر ایمان کی حقیقت اور اس کی قدر وقیمت سمجھ میں آگئی ہے؟ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بار بار فرمایا دیکھو انھیں یہاں ایمان مل رہا ہے۔

ایک دفعہ حیدرآباد میں ایک ایسی مسجد میں بیان طے ہوا جہاں کے بعض نوجوان

غیر مقلد بن گئے تھے، اثناءِ بیان فرمایا: آج ہمارا حال یہ ہے کہ نائی اُسترہ لئے کھڑا ہے اس پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اپنی گردن جھکائے بیٹھ جاتے ہیں مگر فقہاء وائمہ جو خدا کے مخلص ومتقی بندے ہیں، دین کے معاملے میں ان پر اعتماد کرنے تیار نہیں؛ طرح طـرح کی بد گمانیوں میں مبتلاء ہیں۔

اکثر بیان کے آغاز پر خطبۂ مسنونہ کے بعد اقبال مرحوم کی یہ مناجات ضرور پڑھتے تھے۔

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو گرما دے جو قلب کو تڑپا دے

اور اس قدر حزین وغمگین لہجے میں پڑھتے تھے کہ واقعی روح گرما جاتی تھی اور دل تڑپ اٹھتا تھا۔

راقم السطور پر بھی خاص شفقت تھی، اس کی شد بد دینی خدمات کو پسند فرماتے تھے۔ خصوصاً اس کی تحریرات کے لئے یہ فرما کر کہ "کوئی نیا مضمون لکھا نہیں" اور "مجھے آپ کی تحریر پسند ہے" حوصلہ افزائی فرماتے۔ آخری سفر میں میری شکایت پر فرمایا تھا کہ اب کی دفعہ تمہیں زیادہ وقت دوں گا۔

مگر افسوس! کسے معلوم تھا کہ اسکے بعد بجائے حضرت کے تشریف لانے کے ان کی وفات حسرت کی آیات کی اطلاع آئیگی۔ **"انا للہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل عندہ باجل مسمی"**۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرما کر درجات کو بلند فرمائے، پسماندگان کو جزا واجر اور نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ

انسان اپنے مزاج ومذاق کے اعتبار سے "مدنی الطبع" ہے، اطراف واکناف اور ماحول کے اچھے برے اثرات، نیک وبد اعمال واخلاق، اور صالح وغیر صالح شخصیات کا اپنی زندگی میں گہرا اور انقلاب انگیز اثر قبول کرتا ہے، وہ جہاں اپنی منزل اور اس کی راہ متعین کرنے کے واسطے "عقل وفہم اور سوجھ بوجھ" کا استعمال کرتا ہے وہیں مشاہدات وتجربات، پیشروؤں کے تذکار وواقعات اور ماحول میں بکھری ہوئی بینات وآیات سے بھی بھرپور استفادہ کرتا ہے، اس حقیقت کا ہم لوگ صبح وشام، لحہ بہ لحہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، آپ غور کیجئے کہ دنیا نے آج تک جس قدر ترقی کی ہے کیا یہ سب ماحول میں غور وفکر اور تدبر کا نتیجہ نہیں ہے؟ نادان بچے اپنے بزرگوں کو دیکھ کر اور سن کر کس طرح دانا اور سمجھدار بنتے ہیں، اپنے لئے منافع کا حصول اور مضرات سے اجتناب وفرار کا سبق وہ اپنے اطراف سے نہیں تو کہاں سے سیکھتے ہیں؟ کتنے کم عقل وبے علم بھی واقعات کی اس دنیا میں بسا اوقات تجربات ومشاہدات ہی کی مدد سے ساحل مراد کو پہونچتے رہتے ہیں، یہ دوسروں کو دیکھ کر چلنے اور اگلوں سے سبق لینے کا فطری مزاج ہی تو ہے جو بے شمار شریف زادوں کے عقل وعلم اور نسبی شرافت کے باوجود فاسق وفاجر اور کتنے ہی گنواروں اور بے ہنروں کے شریف وصالح بننے کا سبب ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ شانہ نے بھی اپنے کلام مجید میں ایک بڑا حصہ اس مضمون (واقعات وقصص) کیلئے مختص فرمادیا ہے۔

ہر انسان کے سامنے ایک تو اس کی یہ دنیا ہے جسے دار العمل اور امتحان گاہ کہا جاتا ہے دوسرے وہ آخرت ہے جس کو دار الجزاء اور وطن اصلی ومسکن حقیقی قرار دیا جاتا ہے، وہ اس دنیا

میں درحقیقت اپنی آخرت کی تیاری واستواری کیلئے ہی پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے کامیابی ونا کامی کا اعتبار اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے، جولوگ حیات مستعار کی مہلت میں ابدی سکون وآرام کا سامان کر لیتے ہیں انہیں کامیاب کہا جاتا ہے اور جو نادان اس جہانِ رنگ وبو کی دل فریبیوں اور دسیسہ کاریوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں انہیں نا کام ونامراد کہا جاتا ہے، قرآن مجید کی جامع اصطلاحات میں اسی کو سعادت وشقاوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ اور وَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ۔ پھر اس سعادت دارین کے حصول اور شقاوت سے حفاظت کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آسمانی ہدایت اور قرآنی تعلیمات کی پوری اتباع کی جائے، فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝۳۸۔ اس تفصیل کو سامنے رکھ کر آپ تاریخِ انسانیت پر ایک نظر ڈالیں۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک ہر دور میں دنیا سعادت وشقاوت کے حیرت انگیز وعبرت خیز مناظر سے بھری نظر آئے گی۔

قرآن کریم —— جو معاشرۂ انسانی کی ہدایت ورہنمائی کا سب سے اہم اور سب سے آخری وسیلہ ہے —— انسان کے اسی مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اسے اپنے ماحول سے سبق سیکھنے اور اگلوں کی زندگیوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت پر بہت زور دیتا ہے، اس کا مطالبہ ہے کہ جویائے حق اور طالب ہدایت کو چاہیے کہ وہ کائنات ارضی کا دورہ اور مشاہدہ کرے کہ نیکی کا انجام اور بدی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، مثال کے طور پر فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ۔ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلُ۔ جیسی آیات سامنے رکھئے۔ اسی طرح اپنے اندر جوش عمل اور ذوق طاعت پیدا کرنے کے لئے یہ ہدایت دیتا ہے کہ اپنے پیشرووں کی تاریخ پر نظر رکھی جائے، اسے بیان کیا جائے۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا، فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ، فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ، لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ وغیر ذالک من الآیات الکثیرۃ اس کی شاہد

ہیں۔خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانیت کی—انبیاء کے بعد—سب سے مہتم بالشان جماعت یعنی حضرات صحابہ کرامؓ کی اخلاقی واعمالی تعمیر میں انسانی مزاج کی اس خصوصیت کا خوب خوب استعمال فرمایا ہے،جس کے ثبوت میں سارا ذخیرۂ حدیث موجود ہے

چونکہ ہم مسلمانوں کا مقصد حیات اصلا سعادت ابدی کی تحصیل ہے،اسلئے ہمارے لئے حصول سعادت کی جدوجہد میں کامیابی سے ہمکنار ہونے والے خوش نصیبوں اور سعادتمندوں کے احوال اوراخلاق واعمال کا تذکرہ بہت بڑی دولت اورزبردست سرمایہ ہے،اس لئے اسلام اورمسلمانوں کی تاریخ میں ایسی مبارک ہستیوں اورقابل فخر شخصیتوں کی زندگیوں کو محفوظ رکھنے کا ہمیشہ اہتمام کیا گیا ہے۔

قرآن وحدیث میں انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعت اورسابقہ امتوں کے صالحین کے تذکرے سے لیکر صحابہ کرامؓ،اولیاءعظام،علماءوفقہاء،محدثین ومجاہدین،داعیین اوراہل اللہ کی سوانح عمریوں اورتذکروں تک،تاریخ اسلام کا غیر منقطع اورشاندار سلسلہ ہمارے سامنے موجود ہے،جس نے انسانی زندگیوں اوراسلامی سماج میں اخلاق وکرداراوراعمال کے سدھار کی فکر کرنے میں ایسا مؤثر ترین رول ادا کیا ہے جس کی نظیر کسی اورقوم میں ملنی مشکل ہے،اورآج بھی بفضلہ تعالیٰ یہ سلسلہ برقرار ہے،کہ جب بھی کسی مثالی شخصیت اورعلم وعمل کی جامع ہستی سے جدائی کا صدمہ پیش آتا ہے تو اصحاب علم وقلم اپنے اپنے انداز واسلوب میں ان کی زندگی کے متاثر کن اورقابل تعریف اورقابل تقلید پہلوؤں کو قید تحریر میں لاکر آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کردیتے ہیں۔

(الف)رجلان تحابا فی اللہ

احقر کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اورپہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ احقر اشرف المدارس ہردوئی میں زیر تعلیم تھا،مرشدی حضرت محی السنہ مدظلہم العالی کی ملاقات کیلئے حضرت مولانا ہردوئی تشریف لائے تھے،حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دارالاہتمام میں مصروف کار تھے اوراحقر کسی ضرورت سے وہیں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اندر

داخل ہوئے آنے جانے والوں کی کمی نہ تھی، اورسب آنے والے عموماً ایک ہی جیسی وضع قطع کے ہوتے تھے، پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی سادگی اور حد درجہ انکساری وفروتنی الگ رہی، احقر کو اس وقت کم سنی کی وجہ سے فرق مراتب کی کچھ تمیز نہ تھی ـــــ اور اب بھی کیا آئی ـــــ بس اتنا دیکھا کہ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھ کر بڑے تپاک سے استقبال فرمایا اور گلے لگایا، ابتدائی گفتگو ہوئی پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جھولے میں سے چند عدد دیسی مرغی کے انڈے اور ایک لنگی نکال کر بڑی سادگی ومحبت سے یہ کہتے ہوئے پیش فرمایا کہ "حضرت! یہ آپ کے لئے ہدیہ ہے" حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو قبول فرما کر رکھ لیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ مہمان خانہ تشریف لے گئے، اور میں نے معمول کے مطابق اس ہدیہ کو اٹھا کر اندر لیجانا چاہا تو اشارہ سے روکدیا گیا، پھر حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ خود ہی اٹھے اور اس تحفہ کو لے کر گھر میں تشریف لے گئے ـــــ احقر اس وقت کم سنی کی وجہ سے اندر ہی رہا کرتا تھا اسلئے ساتھ ہی چلا گیا ـــــ اور محترمہ امی جان صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا سے فرمایا "یہ قاری صدیق صاحب کا تحفہ ہے آپ بھی کھایئے مجھے بھی کھلایئے" یہ کہہ کر انڈے دیدیئے اور لنگی ـــ جب اکر اچھی طرح یاد ہے کہ ـــــ اپنی مخصوص الماری میں محفوظ کرلی، سارا ماجرا دیکھنے کے بعد دل نے فیصلہ کرلیا کہ یہ صاحب کوئی بہت بڑے بزرگ ہیں۔

وہ دن تھا اور آج کا دن ہے، الحمدللہ تعالیٰ وقت گذرنے اور عمر ومعلومات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ حضرت کی عقیدت واحترام میں اضافہ ہی ہوتا رہا، ـــــ کاش! اس وقت اس مبتدی طالب علم کو ذرا پتہ ہوتا کہ پچیس چھبیس سال بعد اس رجلِ عظیم اور مردِ کریم کے بارے میں اُسے بھی قلم اُٹھانا اور کچھ لکھنا پڑے گا ـــــ خیر اس کے بعد حضرت کی وہاں کیا مصروفیت رہی باوجود سوچنے کے کچھ یاد نہیں پڑتا، مگر اس کے چند سال بعد جب راقم تکمیل حفظ کر چکا اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا تو دوبارہ حضرت کی تشریف آوری ہوئی، اور اس وقت غالباً ہردوئی کے نواح میں کہیں کوئی جلسہ منعقد تھا، جس میں دونوں اکابر کی شرکت تجویز تھی، نظام یہ تھا کہ حضرت ہتورا سے ہردوئی پہونچ جائیں، یہاں سے بذریعہ جیپ

دونوں حضرات جلسہ گاہ پہونچ جائیں گے، چنانچہ حسب نظام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہردوئی پہونچ گئے، اور مہمان خانہ میں تشریف فرما ہوئے، حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی تیاری سفر بڑے اہتمام سے ہوتی ہے، تیاری ہوئی اور جیب کار نکالی گئی، سامان رکھا گیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنا جھولا لے کر چپکے سے جیپ کے پچھلے حصے میں ایک کونہ میں بیٹھ گئے، جب حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ باہر تشریف لائے تو دونوں میں دلچسپ اور سبق آموز مکالمہ ہوا، آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

حضرت محی السنہ: قاری صاحب کہاں ہے؟

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ: میں یہاں بیٹھ گیا ہوں حضرت!

حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ: آگے تشریف لائیں،

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ: مجھے یہاں بہت آرام ہے، (دونوں ایک دوسرے کے آرام کو مدنظر رکھے ہوئے ہیں)

حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ: آپ خادم ہیں یا مخدوم؟

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ: تھوڑی دیر کیلئے مخدوم ہی سمجھ لیجئے۔

حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ: پھر مخدوم ہیں تو مخدوموں کی جگہ آگے ہوتی ہے، آپ آجایئے، پیچھے تکلیف ہوگی، اس کے بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اتر کر آگے بیٹھ گئے۔

سفر سے واپسی کے بعد غالباً شب کو قیام ہردوئی ہی رہا، حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے احقر سے فرمایا "وہ جو آم فلاں جگہ سے آئے ہوئے ہیں عمدہ دیکھ کر بالٹی میں بھگا دو" حکم کی تعمیل کی گئی، شب کو کھانا کھایا جا رہا تھا، میں نے آموں کی یاددہانی کرائی، جواب ملا "ابھی نہیں" سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کب کھائیں گے، خیر ہمیں کیا ضرورت؟۔ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کا بعد نماز عشاء معمول ہے کہ باہر صحن میں چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں، اس وقت طلباء کرام، اساتذہ اور مہمانان کرام جن کا جی چاہے جمع ہوجاتے ہیں، کچھ خدمت کا موقع بھی مل جاتا ہے، اور دن بھر کی بہ نسبت اس وقت ذرا بے تکلفی سے گفتگو بھی ہوجاتی ہے،

دس ساڑھے دس بجے کے بعد اندر تشریف لے جاتے ہیں، اس اثناء میں حاضرین ایک ایک کر کے جا چکے ہوتے ہیں؛ راقم کے ذمہ ایک خدمت یہ بھی تھی کہ حضرت کے قیام گاہ تشریف لے جانے کے بعد گھر کا صدر دروازہ بند کر دیا جائے، آج جو حضرت اندر آئے تو فرمایا" وہ آم والی بالٹی چھری اور پلیٹ لے جا کر باہر چبوترے پر رکھ دو اور قاری صاحب کو مہمان خانے سے بلا لاؤ، چنانچہ ان امور کی تکمیل کر کے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع کی گئی وہ فوراً ہی تشریف لے آئے؛ پھر حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ بھی باہر آ گئے اور اپنے دستِ مبارک سے خود ہی آم کی شاخیں بناتے اور پلیٹ میں رکھتے جاتے اور حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرماتے کہ کھائیے، انھوں نے دو ایک کھائی ہونگی کہ عذر معذرت شروع فرمادی کہ" بس حضرت بہت کھالیا" اصرار و انکار کے درمیان دو چار اور شاخیں کھالیں، اور اب سختی سے منع فرمانے لگے، کہنے لگے کہ" حضرت ایسا لگتا ہے ہر دوئی بس کھانے ہی کیلئے آتا ہوں"، مگر حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً یہ سوچا ہوگا کہ اللہ کے اس بندے کو اور تو کوئی زبردستی کھلانے کی جرأت نہیں کر سکتا اور خود کبھی دھیان نہیں دیتے کھانے پینے کی طرف، لہذا یہاں کچھ تو کھلا ہی دینا چاہیے —— اب ان باتوں کی طرف کسی کوشش اور میلان محسوس ہو یا نہ ہو، اس عاجز کو اس وقت بھی بڑا لطف آیا تھا اور آج بھی سونچتا ہوں تو محظوظ ہوتا ہوں —— اکابر و اصاغر کے مابین خلوص کے تعلقات تو بہت دیکھنے کو ملیں گے، مگر معاصر کا ایک دوسرے کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور مومنانہ تعامل اغراض و نفسانیت کی اس دنیا میں اب خال خال ہی دکھائی دیتا ہے، حالانکہ یہ صفت ایمان کو مکمل کرنے والی صفت ہے؛ معلمِ انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے"ای عری الایمان اوثق "کے جواب میں جو " الحب فی اللہ "بھی تو فرمایا تھا، یاد رکھئے کہ ہمارے اکابر کا وصفِ امتیازی یہی حب فی اللہ اور اخلاص عمل ہے، یہاں مسلک و مشرب اور مزاج میں توافق کی وجوہ اختلاف کی وجوہ سے بہت زیادہ تھیں، مگر ہمارے وہ اکابر جن کے درمیان شدید نظری اور فکری اختلاف پایا جاتا تھا وہ بھی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کی بہترین مثال تھے۔ آج ہم نے اکابر سے نسبت، صرف نسبت پر فخر

کرنے کیلئے کر رکھی ہے، اخلاق واعمال کا حال تو بس اللہ ہی رحم فرمائے، اکابر کے بعض جاہل مریدوں کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ انہیں اللہ والوں سے ملا ولا تو کچھ نہیں محض اپنی ارادت کے ڈھونگ رچا کر ان بزرگوں کے درمیان تقابل وتفاضل اور ترجیح وبرتری کی مذموم حرکات میں لگے ہوئے ہیں، اور اللہ رحم فرمائے عقل وعلم کے ان مفلسوں نے اس حماقت کا نام "توحیدِ مطلب" رکھا ہوا ہے، افسوس! کیسا بے تکا اور ظالمانہ استعمال کیا ہے تصوف کی اس دقیق اور اہم اصطلاح کا۔

کچھ دن پہلے ہتورا کے بعض دیہات کٹر ہندوؤں کی شرارت سے متاثر ہوئے اور اندیشہ تھا فتنہ ارتداد کے عود کر آنے کا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر ان دنوں جو گذر رہی تھی ہر باخبر کو معلوم ہے، کسی طرح اس صورتحال کی اطلاع حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کو ہوگئی (جو ان دنوں ناسازی صحت کی بناء بنگلور میں مقیم تھے) راقم نے دیکھا کہ جب سے اطلاع پہونچی حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کو برابر اسی کی فکر لگی رہی، دعائیں کرتے رہے، کرواتے رہے، اور اس تاریخ کی عافیت سے گذر جانے کا انتظار فرماتے رہے جو ہندوؤں نے مقرر کر رکھی تھی، اور جب وہ تاریخ بعافیت نکل گئی تو بہت مسرور ہوئے، یہ تعلق خاطر تو حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے تھا؛ اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمایئے کہ ہندوستان کے ایک علاقہ میں ایک معزز عالم دین نے ـــــ جن کا عقیدت ومحبت کا تعلق حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھا ـــــ کسی معاملہ میں غلط فہمی یا نفسانیت کا شکار ہوکر حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ پر بے جا تنقیدوں کا سلسلہ شروع کر دیا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع ہوئی تو ایک ثقہ عالم دین کا بیان ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "اس شخص سے کہہ دو کہ اب میرا ان کا کوئی تعلق نہیں" اور یہی نہیں اس لاتعلقی کی خبر اکتفاء فرمالیا، اس واقعہ کے دو سال بعد اس علاقہ کے بعض مخلصین نے اپنے علاقے میں تشریف لانے کے لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی تو ان حضرات کی دعوت کو منظوری دیتے ہوئے انہیں یہ تاکید فرمائی "میرے گذرنے کا فلاں شہر کے باہر باہر سے نظام بنانا، میں اس جگہ سے بھی نہیں گذروں گا جہاں ہمارے بزرگوں کو

بُرا بھلا کہا جاتا ہو"۔ اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے اس دین ودیانت کا اور باہمی مودت ومحبت کا۔

اور دو استاذ بھائیوں کی تاریخ محبت کا اختتام بھی اس طرح ہوتا ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری دن ہردوئی ہی کے سفر کیلئے تجویز تھا، بیماری سے قبل تیاری بھی بڑے اہتمام سے فرمائی تھی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مجاز مولانا احمد عبداللہ طیب صاحب مدظلہٗ کے بقول حضرت نے اپنے خادم سے فرمایا" ہردوئی جانے کیلئے سامان تیار کرو، اٹیچی کی ضرورت ہو تو بڑی والی لے لو، کپڑے صاف اور عمدہ والے رکھ دینا، عرض کیا گیا چپل بھی بدل لیں، فرمایا ہاں چپل بھی دوسری اچھی والی پہنیں گے" حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سفروں کی حالت جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ اہتمام معمولی نہیں ہے، بلکہ یہ اہتمام اس سفر پر حضرت کے قلبی انبساط ونشاط اور تعلقِ باہمی کی خصوصیت کا عکاس وغماز ہے، ادھر حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ صوفی عبدالرحمٰن صاحب مدظلہٗ کا بیان ہے کہ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ بہت مسرت اور خوشی سے فرما رہے تھے کہ قاری صاحب نے آنے کا وعدہ کرلیا ہے اور ایک دن قبل کی اطلاع کے مطابق صبح ہی سے جلسے کا انتظام وانصرام خود اپنی نگرانی میں فرما رہے تھے۔ یہ تھے ان حضرات کے مابین مخلصانہ ومحبانہ تعلقات۔ اولئک آبائی فجئنی بمثلھم۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی فہم سلیم اور قلب سلیم نصیب فرمائے۔ آمین

(ب) دل بدست آر کہ کسے باشی

کہتے ہیں کہ رابعہ بصریہؒ سے کسی بزرگ نے نصیحت طلب کی تو فرمایا" انسانوں کی دلداری کرنا ہی انسانیت ہے" خود حدیث پاک میں صدقہ کی مختلف شکلیں بیان کرتے ہوئے کسی سے بھلی بات کہنے اور خندہ پیشانی سے ملنے کو بھی ایک طرح کا صدقہ قرار دیا گیا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اہم صفت یہ بھی تھی کہ ہجوم مشاغل اور افکار کے باوجود جس سے ملتے کشادہ جبینی اور خندہ روئی سے ملتے، اور ہر ایک کی دلداری کا بھرپور خیال فرماتے تھے

ایک مرتبہ سفر حیدرآباد کے موقعہ پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ برادر محترم مفتی عبدالمغنی صاحب زید مجدہٗ کے گھر پر مدعو تھے، احقر بھی حاضر ہوا، دسترخوان پر میں نے داعی ومنتظم سفر

برادر محترم مولانا احمد عبداللہ طیب صاحب سے عرض کیا کہ حضرت کو تھوڑی دیر کے لئے اشرف العلوم لے چلیں، مگر مولانا نے وقت کی تنگی بتا کر انکار فرمادیا، صورتحال کے مدنظر احقر نے اصرار بھی مناسب نہیں سمجھا، حضرت مولانا سر جھکائے ناشتہ تناول فرمارہے تھے، غالباً کان میں آواز پڑگئی، جب سر اٹھایا تو احقر سامنے تھا، بڑی شفقت ورحمت کے لہجہ میں فرمایا "تمہارے ہاں چلیں گے ضرور چلیں گے" پھر جب سواری میں تشریف فرما ہوئے تو احقر جلدی سے مدرسہ پہونچ گیا حضرت نے یاد رکھ کر گاڑی ادھر مڑوالی اور مدرسہ پہونچے، اور فرمایا جلدی بتاؤ کہاں دعا کروں؟ احقر نے ایک ہال میں پہونچادیا کرسی ڈلوادی گئی، بس بیٹھ کر دو تین منٹ دعا فرمائی اور تیزی سے کار پر پہونچ گئے، احقر سونچتا ہی رہ گیا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذرہ نوازی اور شفقت ودلداری کا کیا مقام ہے؛ ایک ہی واقعہ نہیں سفروں میں اکثر یہ ضمنی توسیعات ہوتی رہتی تھیں، لیکن اس کا خیال رہتا کہ جو اصل نظام ہیں وہ متاثر نہ ہوں، یوں سمجھئے کہ یہ زائد پروگرام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی راحت وآرام کا ایثار کرکے بنا لیتے تھے، اور کسی بندہ خدا کا جی خوش کردینے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

اسی سفر میں فیض العلوم سے واپس ہورہے تھے تو برادر محترم سے فرمایا "مفتی! تم ہمارے ہاں چلے آؤ، کام کے آدمی نہیں ملتے ہیں، حضرت کو تو بہت مل جاتے ہیں، تم آجاؤ ایک علاقہ دیدیں گے" یہ کیا بات ہوئی؟ کیا چلتے چلتے کی گئی اس پیش کش سے فی الواقع ایسا ہو جاتا، کیا یہ ممکن ہے کہ کسی جگہ دینی خدمت کرنے والے کو حضرت برگشتہ فرمانا چاہتے ہیں، کیا بالفرض وہ تیار ہو جاتے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس کو پسند فرماتے؟ کچھ نہیں، پھر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اپنے شاگرد جنہیں وہ اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، چاہا جارہا تھا کہ کسی طرح ان کا جی خوش کردیں؛ کسی عزت افزائی کے بول سے، کسی ادا سے، کسی شان سے، اپنے چھوٹوں کے قلوب کو باغ وبہار بنادیتے تھے، ادھر مسلمانوں کا جی خوش کرنے کا ثواب الگ مل جاتا تھا۔

(ج) بلائے زیں جہاں آشوب تر نیست

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دنیا اور اس کی نعمتوں سے بالکل دلچسپی نہیں تھی، اس معاملہ میں آپ رحمۃ اللہ علیہ بوذری اور اویسی مزاج کے حامل تھے، طالبعلموں کے لئے جس شخص نے کروڑوں کی جائیداد تیار کردی، جس نے خانہ خدا کی قابل دید خوبصورت تعمیر کروائی، جس نے وارثین علم کے لئے لاکھوں کا صرفہ کر کے مولوی گنج بنا دیا، جس نے مہمانوں کے لئے اکرام وآرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس نے حیرت ہوتی ہے کہ اپنے لئے ساری زندگی ایک کچے کمرے سے زیادہ کی ضرورت نہ محسوس کی، دستر خوان پر جس کے مہمانوں کے لئے انواع واقسام کے کھانے موجود ہوتے تھے اپنے کھانے پینے میں اکلات یقمن صلبه سے زیادہ رغبت نہ کی۔۔۔۔۔لباس جو مل گیا ضرورت کی تکمیل کے واسطے کافی سمجھا، اسباب واشیاء کی کثرت کو ہمیشہ بار گراں محسوس فرمایا، ہدایا اور تحائف کو بھی داد ودہش کی نذر فرما دیا، اپنی ذات کے لئے بڑی بڑی پیش کشیں رد فرما دیں؛ محترم مفتی سبیل احمد صاحب کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفر مدراس کے دوران ایک رئیس نے دعوت کی، بعد فراغتِ طعام ایک خطیر رقم——جس کی مقدار سن کر بھی ہم ایسے حریصوں کی رال ٹپکنے لگے——پیش کی حضرت نے فرمایا: یہ کیا؟ عرض کیا گیا تحفہ ہے، فرمایا مجھے اسکی ضرورت نہیں، بڑے اصرار اور انکار کے بعد اس میں سے ایک نوٹ اٹھا لی اور فرمایا یہ بہت ہے؛ راوی کہتے ہیں کہ وہ رئیس حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اس استغناء سے مبہوت رہ گئے، کیونکہ ان کی داد ودہش کی ایک مستقل تاریخ ہے مگر اس تاریخ سخاوت میں ان کے لئے یہ واقعہ ایک حیرت انگیز وعبرت خیز باب تھا۔

انہی کا بیان ہے کہ جس رمضان المبارک میں حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام لندن میں تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حسبِ معمول تراویح میں قرآن کریم سنانے کے لئے وہاں پہونچے؛ دس دن کا قیام تھا مسجد ہی کے ایک گوشے میں معتکف تھے، لوگ بڑے بڑے ناشتہ دانوں میں مختلف نعمتیں لاتے اور چاہتے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سیر ہو کر کھالیں مگر حضرت فرماتے اپنے ناشتہ دان کھول کے رکھ دو پھر کسی میں سے ایک کسی میں سے ایک

لقمہ کھالیتے اور خوش کر کے رخصت فرمادیتے تھے؛ انہی دنوں ایک شاگرد نے ایک قیمتی گھڑی تحفۃً پیش کی، فرمایا "میں کیا کروں یہ کسی ضرورتمند کو دیدو" وہ صاحب کہنے لگے حضرت صبح اٹھنے میں مدد دے گی، تو فرمایا "یہ ضرورت اللہ تعالیٰ اس کے بغیر ہی پوری کردیتے ہیں"، پھر جب دیکھا کہ نہ لینے میں دل شکنی ہوگی تو قبول فرمالیا اور جونہی وہ صاحب خوش ہوکر رخصت ہوگئے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی، کوئی صاحب گذر رہے تھے، جلدی سے بلا کے ان کے حوالے کردی اور فرمایا "اپنے پاس رکھ لو اچھی چیز ہے مگر کسی سے نہ بتانا"۔

یہ ایک آدھ مثال ہے ان کی حطام دنیا سے بے نیازی اور بے رغبتی کی، اور ان واقعات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جو تنگی وسادگی ان میں تھی یہ اضطراری نہیں تھی، بلکہ اختیاری تھی اور اسی میں وہ راحت وآرام محسوس کرتے تھے، اور فی الواقع بھی راحت وآرام اسی میں ہے؛ اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سی صفات حسنہ کا جامع بنایا تھا، گویا وہ گلہائے رنگ برنگ کا ایک حسین گلدستہ تھے، بہت عنوان اور واقعات ہیں جنہیں صفحات کی گنجائش کے مدنظر قلم انداز کیا جاتا ہے۔

(د) نفس کا اژدہا دیکھا ابھی مرا نہیں

برادرم مفتی سہیل احمد صاحب ہی نے لندن کے سفر کا ایک اور واقعہ سنایا تھا کہ جب حضرت دہلی ایرپورٹ پر لندن جانے کے لئے پہونچے تو ہاتھ میں ایک مختصر سا جھولا بھی تھا اس میں دو ایک سیب رکھے ہوئے تھے پانی کا لوٹا اور تہبند تھی، رفیق سفر رئیس آدمی تھے، ان کے دل میں خیال آیا کہ لوگ حضرت مولانا کو اس حال میں دیکھیں گے تو اچھا نہیں لگے گا، اس لئے انہوں نے ایک ایربیاگ خریدا اور حضرت سے خواہش کی کہ یہ سب سامان اس میں رکھ لیں، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے وجہ دریافت کی تو بتلایا کہ ہوائی جہاز کا عملہ بیاگ کو مقفل رکھنے کے لئے کہتا ہے، یہ سن کر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے سیب نکال کر لوٹے میں ڈال لئے اور تہبند جیب میں رکھ لی اور جھولا ان کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا "یہ کسی کو دیدو یا کہیں بازو

رکھدو" یعنی انہوں نے تو ایک بہانے سے یہ سامان جھولے کے بجائے اچھے سے بیاگ میں رکھوانے چاہے تھے اور یہاں نہ رہے بانس نہ بجے بانسری کا قصہ ہوگیا۔ پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اسی طرح سوار ہوگئے، اثناء سفر میں معلوم ہوا کہ اپنا رومال سر پر سے اوڑھ کر اپنے کو ڈھنک لیا تھا تاکہ ایرہوسٹس سے محفوظ رہیں، اسی کے اندر سیب کھالیا اور پانی پی لیا، ایرہوسٹس نے کھانے کی تقسیم کے وقت متوجہ کرنا چاہا تو چہرہ چھپائے ہوئے ہی ہاتھ سے اشارہ کردیا کہ آگے بڑھ جائیں۔ سبحان اللہ! کیا شان تھی کردار کے ان غازیوں کی!

اللہ پاک اپنے فضل سے ہمیں بھی اس تقویٰ کا کچھ حصہ نصیب فرمادیں۔ آمین

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

قارئینِ اشرف الجرائد کو یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہوگا کہ عالمِ ربانی محدثِ جلیل حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ مئی ۷ ۱۹۹۱ء کو دارِ فانی سے دارِ آخرت کی طرف انتقال فرما گئے، اناللہ و انا الیہ راجعون

حضرت مولانا ۸ رشوال ۱۳۲۳ھ کو صوبہ یوپی کے ضلع مراد آباد کے مردم خیز اور تاریخی قصبہ "سنبھل" میں پیدا ہوئے تھے، والد بزرگ وار صوفی احمد حسین صاحب جہاں معاشی اعتبار سے مرفہ الحال اور خاصے اثر ورسوخ کے حامل تھے وہیں مذہبی اعتبار سے شب زندہ دار اور ذاکر وشاغل تھے، دنیائے دنی کے مقابلہ میں دینِ مبین کی جو اہمیت ہے اس پر ایمان وایقان پختہ تھا، دین وعلمِ دین کے دل سے قدر دان تھے، اپنے سب ہی بچوں کو علمِ دین سے آراستہ وپیراستہ کرنے کی تمنا تھی، اس لئے خاندان والوں اور دوست احباب کے تقاضے بلکہ عہدہ ومنصب کا لالچ دلانے کے باوجود پورے عزم واستقلال کے ساتھ اپنے بچوں کو علمِ دین میں مشغول رکھا؛ حضرت مولانا کو بھی آپ نے اس جذبہ کے تحت پہلے سنبھل ہی کے متعدد مدرسوں میں ابتدائی تعلیم دلوائی اس کے بعد مؤ ضلع اعظم گڑھ بھیجا، وہاں سے درسیات فنون کی تکمیل کے مولانا نے اپنے اساتذہ کی برکت سے دل میں پختہ ارادہ کرلیا کہ تکمیلِ حدیث کے لئے دارالعلوم دیوبند ہی جانا ہے، ادھر آپ کے والد صاحب اگر چہ کے مسلکاً مروجہ پیری مریدی کے قائل ومداح اور مسلکِ دارالعلوم سے بدگمان تھے لیکن من جانب اللہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ علم حدیث کی صحیح تعلیم تو دیوبند ہی میں ہوسکتی ہے، اس لئے بلا پس وپیش انہوں نے اپنے صاحبزادہ کو دارالعلوم دیوبند جاکر تکمیلِ حدیث کی اجازت

دیدی، مولانا جب دار العلوم دیو بند پہونچے تو یہ دار العلوم کا دورِ شباب تھا، تاریخ کے نامی گرامی اساتذۂ فن وعباقرۂ علم ستاروں کی طرح دار العلوم کے افق پر جگمگا رہے تھے، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور میاں اصغر حسین دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدثین شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب جیسے ادیب، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مفسر اور علامہ ابراھیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ جسے امام المعقولات مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ جیسے فقیہ اور دیگر اساطین علم وفضل کے وجود اور ان کے دروس سے دار العلوم بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

مولانا نے دار العلوم دیو بند میں داخلہ حاصل کر کے دو سال تک ان اکابر سے استفادہ کیا؛ پہلے سال ہدایہ آخرین وغیرہ پڑھی، دوسرے سال یعنی ۱۳۴۴ھ میں دورۂ حدیث میں امتیازی درجے سے کامیاب ہوئے اور سندِ فراغت حاصل کی؛ نہایت قابل اور ماہر فن اساتذہ کی صحبت وتربیت نے مولانا کو گونا گوں صفات کا حامل اور جوہر قابل بنا دیا تھا، مولانا کے اندر ایک کامیاب مدرس ومعلم، بہترین متکلم ومناظر، تجربہ کار مصنف، ماہر صحافی اور قابلِ قدر مصلح وداعی کی مختلف ومتنوع صلاحیتیں یکجا موجود تھیں اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ہر میدان میں حسبِ قدرت وتوفیق نمایاں خدمات انجام دیں۔ چنانچہ فراغت کے بعد اولاً مدرسہ چلہ امروہہ میں پھر دار المبلغین لکھنؤ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، اسی طرح دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں بھی آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں، دو سال وہاں شیخ الحدیث کے منصبِ جلیل پر بھی فائز رہے، لکھنؤ کی مرکزی مسجد میں تفسیر قرآن کا سلسلہ بھی ایک عرصہ تک بڑی پابندی کے ساتھ چلاتے رہے، پھر آپ نے ہندوستان کی دینی فضاء میں بدعات وخرافات اور رواج ورسومات کی صورتِ حال کو غور کی نگاہ سے دیکھا تو اس صورتِ حال کو مسلمانوں کی مذہبی ترقی کی راہ میں عظیم مانع اور سم قاتل تصور فرمایا اور سب طرف سے یکسو ہو کر بدعات کا قلع قمع کرنے کے لئے کمر کس لی اور اس کام کے لئے ایک طرف زورِ سخن کے ذریعہ مناظروں کا کام شروع کیا تو دوسری طرف زورِ قلم کا استعمال کرتے ہوئے ماہنامہ "الفرقان" کا اِجرا فرمایا؛ مولانا کی نظر اور ہمت پر داد دینی چاہئے کہ اس کام کے لئے آپ

نے کسی اور جگہ کے بجائے اسی شہر بریلی کا انتخاب فرمایا جسے بدعات وخرافات کے لئے شہر پناہ کی حیثیت حاصل تھی، بلکہ یہ مکتبِ فکر اسی شہر کی جانب منسوب ہوکر بریلویت کہلاتا ہے، بہرحال بریلی سے الفرقان کا آغاز فرمایا، ایک عرصہ تک تو اس ماہنامہ کے کلیدی مضامین بدعات وشرکیات کے رد کیلئے وقف تھے، بریلوی فتنہ کے علاوہ فتنہ قادیانیت، فتنۂ شیعیت اور جناب مودودی صاحب کے باطل نظریات وافکار کی آپ نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

تصوف کیا ہے، تبلیغی جماعت اور جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات، بوارق الغیب، مودودی صاحب کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت، فیصلہ کن مناظرہ، ایرانی انقلاب، فرقہ اثناء عشریہ، کفر واسلام کے حدود اور قادیانیت وغیرہ یہ تمام تصانیف باطل کے ساتھ آپ کے جہاد بالقلم کی شاہکار ویادگار ہیں، ان کے علاوہ اور تصانیف بھی ہیں جن میں "معارف الحدیث" قابل ذکر ہے، مولانا باطل کا سر کچلنے کے لئے ہروقت وہرآن تیار رہتے تھے، بڑے نامساعد حالات میں بھی ہمت واستقامت کے کوہِ ہمالیہ تھے، انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں حالات کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور نہ کبھی وہ مایوسی وناکامی کا شکار ہوئے، اس کے اندازہ کے لئے آپ کی "تصنیف ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" کی تالیف سے متعلق ثقہ سند سے سنا ہوا ایک واقعہ کافی ہے کہ علالت وپیرانہ سالی اور سخت ہمت شکن اعذار میں ابتلاء، اور معالجین کی جانب سے نقل وحرکت پر پابندی کے باوجود آپ نے تیمارداروں سے چھپ کر چادر کے اندر ٹارچ جلاکر خمینی لٹریچر کا گہرا مطالعہ فرمایا اور اس کے بعد پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ یہ کتاب تالیف فرما کر امتِ مسلمہ کے سامنے پیش فرمائی، واقعہ یہ ہے کہ عوام الناس تو کجا بعض صاحبِ نظر وخبر علماء نے تک اعتراف کیا کہ خمینی کے مکروہ سازشی چہرہ پر سے انقلاب اسلامی کا سنہرہ نقاب اگر مولانا نہ اٹھاتے تو وہ دھوکہ ہی میں رہ جاتے اور اس یہودی کھیل کا پتہ بھی نہ چل سکتا۔

وہ کسی حال میں ہوں ان کا دل ہروقت اہل اسلام کی ہدایت کیلئے بے چین رہتا تھا اور

ان کی زبان وقلم احقاقِ حق وابطال باطل یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو بجا لانے کیلئے ہر آن مستعد وتیار رہتے تھے، اپنے بڑوں کی فکر ونظر پر بھرپور اعتماد اوران کے مسلک کا مکمل تحفظ دین اسلام کی سرحدوں پر گہری نظر اور کسی بھی گوشہ سے سر اٹھانے والے غیر اسلامی فتنہ کی شناخت اوراس کی سرکوبی کی فکر ان کی زندگی کا مشن تھا، اسی کے لئے وہ جیئے اوراسی پر وہ دارِ فانی سے دارِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے، رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

ان انفرادی خدمات کے علاوہ تحریکی وتنظیمی اعتبار سے اجتماعی خدمات کی مولانا کو بہت فکر تھی اس لئے کہ اجتماعی کام کے منافع وفوائد اپنے اندر ایک اور شان رکھتے ہیں، مولانا نے اس کے لئے سب سے پہلے اپنے آپ کو "جماعتِ اسلامی" سے وابستہ کیا بلکہ حقیقتِ واقعہ کے مطابق اس جماعت کی بنیاد ڈالی اور مودودی صاحب کو اس کا امیر مقرر کیا خود ایک رفیق ومعاون کی حیثیت سے اس جماعت کی تشکیل توسیع اور تعمیر میں پورے اخلاص وانہماک کے ساتھ مشغول رہے؛ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ اس تحریک پر مودودی صاحب کی غیر اسلامی افکار کی چھاپ پڑ رہی ہے اور وہ خلافِ توقع گفتار کے غازی ہی ثابت ہوئے، اسلام کے اپنے مخصوص مزاج اور صحیح اسپرٹ کا ان کی شخصیت اور شب وروز پر کوئی اثر نہیں پایا تو ابتداءً الدین النصیحۃ کے مطابق ان کی اصلاح ودرستگی کی محبانہ ومخلصانہ کوشش کی مگر جب اس سے مایوسی وناامیدی ہوئی تو بلا کسی رعایت کے نہ صرف ان سے اوران کی جماعت سے علاحدگی اختیار کی بلکہ قوم وملت کو اس جماعت کی غلط روش اور فکری ونظری گمراہی سے آگاہ فرمانا اپنا فرض اور قوم کا حق سمجھا۔

الغرض جماعتِ اسلامی سے علاحدہ ہونے کے بعد آپ نے مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی "دعوت وتبلیغ" کے مقاصد ومناہج کو خود مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے براہِ راست سنا، سمجھا، مشاہدہ کیا اوراس سے عملاً وابستہ ہوگئے، چنانچہ ایک عرصہ دراز تک آپ اس جماعت کے مقاصد پر محنت فرماتے رہے، بڑے بڑے اسفار فرمائے بڑی محنتیں اور قربانیاں دیں، لکھنؤ کے اطراف واکناف میں اپنے رفیق وصدیق مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت سے وہ محنت

فرمائی کہ بقول بعضے آج لکھنؤ میں اس کام کی جو شکل نظر آرہی ہے اس میں اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان دونوں حضرات کی پیہم اور مخلصانہ ایثار وقربانی کا ثمرہ ہے، جسمانی عوارض وموانع کے بعد مولانا اگرچہ عملاً اس کام میں شریک نہ رہ سکے لیکن نظراً وفکراً آپ اس کام کے ہمیشہ مؤید ومعاون رہے۔

اکابر دارالعلوم نے آپ کی ہمہ جہتی خدمات، اصلاحِ امت کی تڑپ اور والہانہ جذبات واحساسات، اکابر واسلاف سے بھرپور عقیدت ومحبت، مسلک میں تصلب وپختگی اور اس کے تحفظ کی مساعی کو دیکھ کر ۱۳۶۳ھ میں آپ کو دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کا رکن منتخب فرمایا، جس کی اطلاع ملنے پر آپ کو سخت حیرت ہوئی لیکن جب پتہ چلا کہ یہ انتخاب باتفاقِ مجلسِ شوریٰ ہوا ہے تو آپ نے اپنے لئے سعادت سمجھ کر اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا، نہ صرف قبول فرمایا بلکہ اس کے تقاضوں کی تکمیل میں بلاخوف وتردید وبلالحاظ لومۃ لائم جو مخلصانہ خدمات انجام دیں ہیں وہ وابستگانِ دارالعلوم سے مخفی نہیں ہے۔

اسی طرح مسلمانانِ عالم کی نمائندہ تنظیم "رابطہ عالم اسلامی" نے آپ کی دقتِ نظر، قوتِ فکر اور خدماتِ جلیلہ کے مدنظر آپ کو اپنا رکن منتخب کیا، بفضلہٖ تعالیٰ آپ نے اس ادارہ کی ہمدردی اور بہی خواہی اور صحیح رہبری میں بساط بھر سعی فرمائی اور حق رکنیت ادا کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔

اس سب کے بعد مولانا کی جس صفت کا ذکر کرنا چاہتا تھا افسوس کہ اس کے اظہار کی قابلیت سے اپنی فہم اور قلم دونوں کو عاجز محسوس کر رہا ہوں، وہ صفت روحانی کمالات وباطنی مقامات کی ہے، اس کے لئے کوئی روحانیت ونورانیت اور سلوک وطریقت کا شناور ہی قلم اٹھا سکتا ہے کہ یہ میدان لفظ وبیاں کا میدان نہیں ہے، حقائق وکیفیات کا میدان ہے کاش کہ اس عنوان سے مولانا کے لائق وفائق صاحبزادگان مولانا عتیق الرحمن سنبھلی ومولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی نعمانی مدظلہما میں سے کوئی قلم اٹھائیں تو ہم سب کے لئے باعثِ عبرت ونصیحت اور موجب درس وموعظت ہو؛ مختصراً عرض ہے کہ مولانا نے ان تمام خدماتِ جلیلہ

ومناصبِ عالیہ کے باوصف باطنی ترقی، تکمیلِ سلوک، اور حسنِ خاتمہ کی فکر سے غفلت نہ فرمائی چنانچہ اس کے لئے آپ نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت وارادت کا شرف حاصل فرما کر اس راہ کا سفر شروع کیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں، اخلاص وللٰہیت تسلیم ورضا اور شیخِ کامل کی توجہ کامل کی برکت سے بفضلہٖ تعالیٰ بہت جلد ترقی فرمائی؛ تکمیلِ سلوک کے بعد اجازت وخلافت سے بھی سرفراز فرمائے گئے۔

اس کے باوجود ہمیشہ اپنے نفس سے غیر مطمئن اور سوءِ خاتمہ کے اندیشہ سے لرزاں وترساں رہتے تھے، چھوٹے سے چھوٹے اور عامی سے عامی سے ملاقات ورخصت کے وقت بڑی لجاجت وعاجزی سے فرمایا کرتے تھے "بھائی میرے لئے حسنِ خاتمہ کی دعا کردینا" اور واقعہ یہ ہے کہ "نزدیکاں را بیش بود حیرانی" کے بمصداق اہل اللہ تعالیٰ سے جس قدر قریب ہوتے جاتے ہیں ان کے اندر بےخودی اور فنائیت کے احساسات بڑھتے ہی جاتے ہیں اور درحقیقت یہی وہ مقام ہے جس پر مقامات سلوک کی انتہاء ہوتی ہے اور یہی کیفیات ان کے مرتبہ عالی کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

یہ چند سطریں میں نے حضرت مولانا کی یاد میں قارئین اشرف الجرائد کے سامنے پیش کی ہیں جو نہ مربوط ہیں نہ مکمل، محض اس غرض سے کہ علم وعمل، ذوق ووجدان، جہدِ مسلسل اور قوم کے دردِ محبت کے اس تابناک پیکر کو خراج تحسین پیش کرنیکی سعادت حاصل ہو اور قارئین سے دعائے مغفرت وایصال ثواب کی درخواست کی جائے، حق تعالیٰ شانہ مولانا کی بھرپور مغفرت فرما کر درجاتِ عالیہ سے سرفراز فرمائیں۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه وادخله الجنة مع الابرار وانزله المقعد المقرب عندک یوم القیامة انک لا تخلف المیعاد

ختم نبوت کے محافظ و پاسبان

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

مئی ۲۰۰۰ء کی صبح جب فجر کی نماز پڑھ کے مسجد سے نکلا تو مفتی محمد لقمان صاحب نے ریڈیو نشریات کے حوالہ سے اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع دی کہ "حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کو نامعلوم افراد نے بندوق سے فائر کر کے شہید کر دیا ہے، اور حکومت کا خیال ہے کہ شاید یہ شیعہ سنی فرقہ وارانہ فسادات کی ایک کڑی ہو" میں حیرت زدہ ہو کر سنتا رہا، خیال ہوا کہ وہ نہیں ہونگے کوئی اور مولانا یوسف ہوں گے، اس لئے کہ ضمیر تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اتنے بڑے عالم دین کے ساتھ ایک مسلم ملک میں ایسا بے دردانہ اور وحشیانہ حادثہ پیش آسکتا ہے؟ پھر خیال ہوا کہ پاکستان کی صورتحال کے حوالہ سے سوچا جائے تو ان واقعات کا پیش آنا روزمرہ کی بات ہے، چنداں مشکل نہیں۔

بہرحال حسب معمول صبح کی چہل قدمی کیلئے نکل گیا، مگر ذہن مولانا کی شخصیت کی عظمت، ان کی مخلصانہ خدمات، تدریس و تبلیغ، مسلک اہل حق کی حفاظت و اشاعت، ارشاد واصلاح اور سب سے بڑھ کر قادیانی ارتداد کے مقابلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ خاتمیت کا جرأتمندانہ وغیرتمندانہ دفاع جیسے عالی قدر کارناموں میں گم ہو گیا۔ کبھی "اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم"—— جس کے مطالعہ نے سب سے پہلا نقش عظمت ان کی شخصیت کا قلب میں مرتسم کیا تھا—— کے عادلانہ ومحققانہ کلمات، کبھی مرزا طاہر کے چیلنج مباہلہ کا غیرتمندانہ ایمان افروز و جوش فروز جواب، کبھی گورنر پنجاب کے علماء اہل مدارس پر کئے گئے دلیرانہ و ملحدانہ اعتراضات کا مدلل ومکمل جواب، کبھی جنرل محمد ضیاء الحق کی شہادت پر لکھا گیا "بینات" کا طویل اداریہ وغیرہ مضامین یاد آنے لگے ان منتشر خیالات کے بیچ ان پر بے دردانہ حملہ کی

خبر بجلی بن کر گرتی اور سب خیالات کافور ہوجاتے رہے۔ ضمیر یہی کہتا رہا کہ وہ حادثہ ہوگا مگر شہید ہونے والے مولانا نہیں ہوں گے کوئی اور ہوگا وقفے وقفے سے دعا نکلتی خدا کرے کہ یہ خبر غلط ہو بالکل صحیح نہ ہو۔

مختصر یہ کہ میں نے اپنی چہل قدمی مختصر کی، سیدھے گھر پہونچ کر اخبار منگایا دیکھا تو یہ خبر بالکل صحیح تھی، نمازِ عشاء پڑھ کر مسجد کے باہر ٹھیری اپنی گاڑی میں مولانا بیٹھے تھے یا گاڑی چلنے لگی تھی کہ اچانک موٹر سائکل پر سوار نامعلوم چند شقی القسمت نوجوانوں نے نشانہ بنا کر حضرت مولانا پر اس طرح وار کیا کہ نہ صرف حضرت مولانا بلکہ ان کے صاحبزادہ محترم مولانا محمد یحییٰ بھی شدید زخمی ہوگئے، مولانا نے تو اسی جگہ جان جان آفرین کے سپرد کردی اور صاحبزادہ محترم کے بارے میں معلوم ہوا کہ اگلے روز وہ بھی دواخانہ میں زخموں سے جانبر نہ ہوسکے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمیٰ[۱]

اب تو یقین ہوگیا اور جو غلط فہمی کی گنجائش تھی وہ ختم ہوئی، ذہن نے اب دوسری طرح سوچنا شروع کیا، خیر یہ تو دنیا ہے، یہ نہ دارالقرار ہے نہ ہمیشگی کا مقام، یہاں سے جانا تو ایک دن تھا ہی، دشمنِ اسلام کے ہاتھوں موت آئی شہادت کا مرتبہ عالی بھی نصیب ہوا، جو مقام شکر ہے۔ نہ معلوم مولانا نے خود کتنی دفعہ اللہ سے اس موت کی تمنا کی ہوگی کہ خوب سے خوب خدمتِ دین کا موقعہ بھی ملے اور بالآخر شہادت سے بھی سرفراز ہوں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی موت اور اس کا سبب دونوں اس پروردگار کی تجویز ومشیت سے پیش آئے کہ کوئی بندہ ان کی موت کے لئے نہ اس سے بہتر وقت تجویز کرسکتا تھا نہ اس سے بہتر سبب، ہمیں اس

[۱] بعد میں اس خبر کی تفصیل اس طرح معلوم ہوئی کہ مولاناؒ اپنے رفقاء کار کے ساتھ مدرسے کی کسی وقف املاک کو کرائے پر دینے کے سلسلے میں اسی مقام پر مشورہ کے لئے گئے ہوئے تھے، ایک سیاسی جماعت بھی اپنے دفتر کے لئے اس کی امیدوار تھی، مشورہ میں ان کی درخواست رد کردی گئی تھی، کام سے فارغ ہونے کے بعد واپس ہو رہے تھے کہ جب ان کی گاڑی سگنل پر رکی تو موٹر سائیکل پر سوار نامعلوم لوگوں نے آتش گیر پاؤڈر مولاناؒ کی گاڑی پر چھڑک کر آگ لگادی، کار کے چونکہ دو ہی دروازے تھے اور باڈی فائبر کی تھی اس لئے بآسانی نکل نہیں پائے اور ایک ساتھی کے علاوہ سب ہی جھلس کر رہ گئے۔

صدمہ پر طبعاً گو کتنا ہی رنج ہو، مگر چاہئے یہی کہ عقلاً وعلماً مطمئن وگمن رہیں کیوں کہ ہمارے رب کی سب تجویزات لائق تسلیم اور سب فیصلے قابل تعظیم ہیں۔

مولانا سے راقم کی کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی، اور نہ ہی اُن سے کوئی قریبی واقفیت رکھتا ہے، جو کچھ عقیدت تھی وہ خدماتِ دینیہ کی وجہ سے اور بالخصوص اس وجہ سے کہ اپنے اسلاف کے اتباع پر اور مسلکِ علماء دیوبند کے وصفِ خصوصی "اعتدال واقتصاد" پر پوری پختگی کے ساتھ قائم تھے، ان کی گفتگو میں معرفت کی خوشبو آتی تھی (راقم نے مولانا کی آڈیو کیسٹس سنی ہیں)، ان کی تحریر میں صداقت واخلاص کی چاشنی ملتی تھی، ایمان بڑھتا تھا، یقین بنتا تھا، صحبت کی تاثیر تو وہ باتوفیق حضرات ہی بتلا سکتے ہیں جنہیں ان کے ہمراہ کچھ وقت گذارنے کا موقعہ ملا ہو۔

بہر حال مولانا کی موت ایک بہت بڑا نقصان ہے، عموماً پورے عالم کے مسلمانوں کا خصوصاً مسلمانانِ پاکستان کا پھر خصوصاً جامعۃ العلوم الاسلامیہ کا کہ اس مؤقر ادارہ نے مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار اور ان کے رفقاء کے سانحہ سے پیدا شدہ خلاء کو ابھی پُر بھی نہ کیا تھا کہ ایک اور صدمہ آپہنچا، اللہ ہی اپنے فضل سے امت کے ان نقصانات کے تدارک کا غیبی سامان فرمائیں۔ آمین۔ **وما ذالك على الله بعزيز**

ساتھ ہی ساتھ پاکستانی حکمرانوں کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس قسم کی حکومت کر رہے ہیں، کب تک اسلام اور مسلمانوں کے نام پر اور ہزاروں مسلمان بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی قربانی کے بعد بنے ہوئے اس ملک میں یہی افراتفری طوائف الملوکی اور انارکی چلتی رہے گی کہ عوام تو عوام علماءِ ربانیین بھی امن سے نہ رہ سکیں؛ احقاقِ حق کی پاداش میں اسلام کے دشمنوں اور ختم نبوت کے لٹیروں کے ہاتھوں پٹتے اور مرتے رہیں؟ اس ملک میں ہر باطل فرقہ فروغ پا رہا ہے، مگر اہل حق چن چن کر مارے جا رہے ہیں، اس مسئلہ پر خود مولانا کو بھی تشویش تھی؛ چنانچہ ایک خانقاہ میں تہجد کے وقت سالکین پر فائرنگ ___ اور وہاں کے سن رسیدہ پیر طریقت کے ساتھ کی گئی بدتمیزی وبدسلوکی پر مولانا نے جو اداریہ بینات میں

سپردِ قلم فرمایا تھا وہ اس تشویش پر سے پردہ اٹھاتا ہے

شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت

مولانا کی پیدائش صوبہ پنجاب کے ضلع لدھیانہ میں سنہ ۱۳۵۱ھ میں ہوئی تھی، ابھی ابتدائی تعلیم کا زمانہ ہی چل رہا تھا کہ تقسیم ہند کا مسئلہ پیش آ گیا، آپ کے خاندان کو بھی اپنا علاقہ چھوڑ کر پاکستان منتقل ہو جانا پڑا، کیونکہ اس وقت وہ علاقہ مسلمانوں سے خالی ہوتا جا رہا تھا، وہاں پہونچکر مختلف مدارس میں آپ کی تعلیم کا سلسلہ چلتا رہا، علومِ عربیہ اسلامیہ کی تکمیل مدرسہ خیر المدارس ملتان میں ہوئی، یہیں سے آپ نے سنہ ۱۳۷۵ھ میں دورہ حدیث کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل فرمائی، اس مدرسہ کے ناظم حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ تھے، اساتذہ و مربی ایسے ملے تھے کہ ان کی برکت سے آپ کو علم صحیح کے ساتھ ساتھ عشق و معرفت کی ضرورت کا احساس ہوا، چنانچہ طالب علمی کے دور ہی سے مولانا نے علومِ ظاہرہ کے ساتھ علم باطن یعنی تصوف و سلوک، تزکیہ و تصفیہ کی جانب بھی توجہ دی تھی، اس کیلئے ابتداءً حضرت جالندھری رحمۃ اللہ علیہ ہی سے رجوع ہو کر ان کی نگرانی میں منازلِ سلوک طے کرنا شروع فرما دئے تھے، ان کی وفات کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں داخل ہوئے اور انہی سے خلافت و اجازت حاصل ہوئی، نیز حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب نے بھی انہیں اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا تھا، فراغتِ تعلیمی کے بعد اپنے پیر و مرشد کے مشورہ سے دین کی خدمت اور تدریس کتب کا کام کرتے رہے، مختلف مدارس میں درس نظامی کی تقریباً سب ہی کتابیں پڑھائیں، اخیر میں حضرت مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ و ہدایت کے مطابق جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں استاذِ حدیث بنے اس کے بعد بینات کے مدیر اور کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے سرپرست رہے۔

طالبِ علمی کے دور ہی سے مضمون نگاری کا جذبہ اور اس میں ملکہ حاصل تھا اور خاص ماحول میں تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں مسلک میں پختگی بھی حاصل تھی، جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ

لکھنے پڑھنے کی خداداد صلاحیت کا محور مسلکِ اہلِ حق کی صیانت اور فرقِ باطلہ کی تردید ہوگیا، پھر بالخصوص قادیانیت کا مستقل تعاقب اور اس کی سرکوبی کا کام تو گویا ان کے حق میں تکویناً مقدر تھا؛ چنانچہ اپنے تصنیفی سلسلہ کا سب سے پہلا مضمون اسی عنوان پر سپردِ قلم فرمایا اور دمِ واپسیں تک اس فتنہ کا پیچھا فرماتے رہے کہا جاسکتا ہے کہ اس موضوع پر مولانا سے زیادہ کسی اور کا قلم نہیں چلا ہوگا، اس طرح تحفظ ختمِ نبوت کے صف اول کے خادموں میں آپ کا نام شامل ہوگیا۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو آخر کس نے شہید کیا؟ حقیقتِ واقعہ کا علم تو قاتلوں کی گرفتاری کے بعد ہی ہوسکتا ہے (بشرطیکہ یہ کام دیانتدارانہ طور پر ہو) ویسے باخبر حلقہ کا اندازہ ہے کہ اس حادثہ جانکاہ کے پیش آنے میں اسی روسیاہ فرقہ کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے جو یہودیوں کی مدد سے پورے عالم میں محافظینِ ختمِ نبوت کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ والعلم عند الله

آپ کے نمایاں کارناموں میں تدریس وتصنیف کے علاوہ اخبار "جنگ" کے ہفتہ واری کالم کے ذریعہ مسائلِ دینیہ کا بلا کسی لومۃ لائم کے واضح فرمانا بھی شامل ہے، جس سے بلاشبہ لاکھوں اردو دانوں نے مکمل ۲۲ سال تک استفادہ کیا، نیز قادیانیت سے متعلق ہر موضوع پر مستند جامع تصنیفات آپ کی باقیات صالحات میں ہیں، جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی مسند تدریس بالخصوص درس ترمذی کے ذریعہ کسب فیض کرنے والے تلامذہ اور باطنی فیض کے ذریعہ توبہ وتربیت حاصل کر کے صالحیت وپرہیزگاری کی زندگی گذارنے والے سالکین کی جو جماعت وجود میں آئی وہ خود انکی برکات کا زندہ ثبوت ہے، اور انشاء اللہ رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

غرض ان کی ۶۸ سالہ زندگی ہم پسماندگان کے واسطے نمونۂ عبرت اور وسیلۂ موعظت ہے، اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو اس سے سبق حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقیہ الامت

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

قارئین اشرف الجرائد کو اخبارات کے ذریعہ فقیہ الامت برکۃ العصر، بقیۃ السلف، یادگارِ اکابر، شیخ المشائخ حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے سانحہ ارتحال کی خبر پہونچ چکی ہوگی، اگرچہ اس وقت اداریہ کیلئے ایک اور عنوان ذہن میں تھا لیکن اس حادثہ کی اطلاع کے بعد ذہن کسی اور مضمون کے لئے آمادہ نہیں ہے، جی چاہتا ہے کہ آج کی صحبت میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کا کچھ ذکر کرلیا جائے کہ بفحوائے عند ذکر الصالحین تنزل الرحمۃ ہمیں بھی رحمتِ الٰہی کا کچھ حصہ مل جائے۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت مبارکہ ۱۰ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۵ھ کو یوپی کے اس مشہور و مبارک قصبہ گنگوہ میں ہوئی جہاں شیخ عبدالقدوس اور حضرت الامام رشید احمد علیہما الرحمۃ کے علاوہ سینکڑوں اہل اللہ اور علماء آسودۂ خواب ہیں، اللہ پاک نے آپ کو غیر معمولی ذہانت و فطانت، فراست و ظرافت اور مثالی صلاحیتوں کا حامل بنا کر وجود بخشا تھا، چنانچہ آپ نے کمسنی ہی میں قرآن مجید مکمل حفظ فرمالیا تھا، اور اپنے وطن میں ہی ابتدائی درسیات کی تعلیم حاصل فرمائی، تقریباً سولہ سال کی عمر میں آپ باقاعدہ تعلیم کی غرض سے مدرسہ مظاہر علوم تشریف لائے، سات سال تک یہاں علوم و فنون کی تحصیل فرماتے رہے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند منتقل ہوئے، دو سال مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہیں سے آپ نے سند فراغت حاصل فرمائی، فراغت کے بعد سہارنپور تشریف لائے اور یہاں پھر دورہ

حدیث شریف کا اعادہ فرمایا تا کہ دونوں مراکز علم وعرفان میں موجود نامی گرامی اور مایہ ناز اساتذہ کرام سے سند حدیث کا شرف اوران کے علوم سے حصہ حاصل ہو، چنانچہ آپ کو دیگر نامور علماء وفضلاء کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنی اور قطب عالم حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی علیہما الرحمۃ جیسی نابغہ روزگار ہستیوں سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا۔

جہاں تک تربیت نفس وتزکیہ قلب کا تعلق ہے تو اللہ پاک نے اس کی تکمیل کے لئے آپ کو ایسا سازگار ماحول اور ایسے بے مثال مشائخ عطا فرمائے ہیں کہ کم لوگوں کے نصیب میں آتے ہیں، یہ وہ دور تھا جب کہ جامع شریعت وطریقت اکابر کے وجود سے یوپی کی سر زمین رشک فلک بنی ہوئی تھی، آپ نے عمومی اعتبار سے ان سب ہی بزرگوں سے خوب استفادہ کیا اور بے پناہ فائدہ اٹھایا، لیکن خصوصی طور پر قطب عالم جامع فیوض اسلاف، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ سے اپنے کو وابستہ رکھا، انہی سے بیعت وارادت کا تعلق قائم فرمایا، انہی کی رہبری وسرپرستی میں تصوف وسلوک کی منزلیں طے کرکے باطنی مدارج ومراتب عالیہ سے سرفراز ہوتے رہے، بالآخران ہی کی بارگاہ سے آپ کو اجازت وخلافت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے آپ کے اندر علمی، عملی اور اخلاقی صلاحیتیں بھرپور ودیعت رکھی تھیں، اس کا نتیجہ تھا کہ آپ طالب علمی ہی کے دور سے اپنے اساتذہ واکابر کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک اور امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے، چنانچہ آپ نے فراغت کے فوراً بعد ہی اپنے بڑوں کے مشورہ سے تدریس وتبلیغ اور افتاء کی مشغولیت اختیار فرمالی، مظاہر علوم سہارنپور، جامع العلوم کانپور، اور دارالعلوم دیوبند جیسی تاریخی اور معیاری درسگاہوں میں آپ مدت العمر یہ خدمات باحسنِ وجوہ انجام دیتے رہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ میں جید علماء مخلص دعاۃ، اور کامل مشائخ بے شمار تعداد میں تیار ہوکر عالم کے مختلف علاقوں میں علم وعرفان کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔

آپ کے وفورِ علم، پختگی حافظہ اور عبقری ذہن کا یہ عالم تھا کہ تفسیر، حدیث، ان کی

شروحات، کلام، تاریخ اسلام اور دیگر فنون میں مکمل عبور حاصل تھا اور فقہ تو گیا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، درسی وفقہی کتب کے ادق سے ادق مضامین ازبر تھے، لمبی لمبی عبارتیں زبانی پڑھ جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آخری عمر میں باوجود پیرانہ سالی، متعدد امراض اور غیر معمولی ضعف ونقاہت کے بھی پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ منقطع نہیں فرمایا، بلکہ باقاعدہ طور پر دارالعلوم دیوبند میں خدام کے سہارے تشریف لیجا کر اسباق پڑھایا کرتے تھے، راقم سطور کو گرچہ ان سے شرفِ تلمذ حاصل نہیں ہے، لیکن ٹیپ ریکارڈر میں ان کے آخری زمانے کے ایک درس کو سن کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ طالب علم کے عبارت پڑھ لینے کے بعد جب اس کی تشریح کا سلسلہ شروع فرمایا تو عارضہ تنفس کے دباؤ کا یہ حال تھا کہ بلا مبالغہ ایک جملہ مکمل طور پر تلفظ نہیں فرما سکتے تھے، بلکہ اسے توڑ توڑ کر اس طرح ادا فرماتے کہ سننے والے کو ان کے اس مجاہدہ پر ترس آنے لگتا، تاہم اسی حال میں طلبہ کے سوالات واشکالات کا پوری بیدار مغزی اور وثوق واعتماد کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے، حواشی وشروح کے لطائف ونوادر کی نشاندہی فرماتے اور اس تکلیف ونقاہت کے باوجود تدریس وتعلیم کی مشغولی پر انبساط و انشراح کا اظہار فرماتے رہے۔

حق یہ ہے کہ اس حالت وکیفیت کو دیکھ سُن کر ضمیر پکار اٹھتا ہے کہ یہ ان کی عظیم کرامت اور علوم قرآن وحدیث سے والہانہ شغف اور عاشقانہ تعلق کی علامت ہے؛ اور اسی پر بس نہیں بلکہ آخری وقت تک اپنی قیام گاہ پر — جو مسجد چھتہ کے پڑوس میں تھی، جسے آپ ان کی خانقاہ کہہ لیجئے — معمولات ومجالس کا سلسلہ بھی قائم رکھا، واردین وحاضرین، مریدین وسالکین، طلبہ وعلماء دین کا ایک جم غفیر آپ کی مجالس میں شریک رہتا، اور آپ کبھی خود علم کا دریا بہاتے تو کبھی سائلین کی تشفی کا سامان فرماتے، ذکر کی محفلیں الگ منعقد ہوتیں، سالکینِ راہ طریقت کی راہنمائی کا فرض علاحدہ بجالاتے، مہمانوں کے اکرام وراحت رسانی کے حکم کو بھی نباہتے تھے، بڑے بڑے علماء اور نامور مشائخ آپ کی مجلس میں نیاز مندانہ حاضر رہتے، ان کی خدمات دینیہ کا ذکر جب ان لوگوں سے سنتے تو بہت خوشی کا اظہار فرماتے،

دعائیں دیتے اور ہمت بندھاتے، کبھی اپنی مجبوری ومعذوری کے تصور سے کانپ اٹھتے۔

میرے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں حضرت کے اس ملفوظ کو پڑھ کر جوان کی مجالس میں چھپ چکا ہے کہ جب کسی صاحب نے چند مرتدین کو سمجھا بجھا کر اسلام میں لوٹانے کی اپنی کوشش کا ذکر آپ کے سامنے کیا تو بے ساختہ حضرت والا کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے فرمانے لگے: دیکھو لوگ کیسے کیسے کام کررہے ہیں، ایک میں ہوں کہ بالکل نکما ناکارہ بس جانوروں کی طرح کھاتا پیتا اور پڑا رہتا ہوں۔ اللہ اکبر! یہ اس اللہ والے کا احساس فرض ہے جس نے فرض کی ادائیگی میں اپنی جان تک گھلادی۔

حضرت کی مجالس، علم وعرفان اور شریعت وطریقت کی جامع ہوتی تھیں، جہاں آپ علم وفضل کے حامل تھے وہیں ورع وتقویٰ، عبادت وزہادت اور تصوف وسلوک میں ماہر وکامل تھے، مختصر یہ کہ آپ کا وجود باجود اس دور خزاں رسیدہ کے لئے باد بہاری اور مردہ قلوب کے حق میں مژدہ جاں نوازی تھا؛ آپ کی وفات کیا ہوئی ایک دور کا خاتمہ ہوگیا اور تاریخ کا ایک ورق الٹ گیا، اب آنکھیں ایسے بزرگوں کو ترستی رہیں گی۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت آج ہم میں نہیں رہے لیکن آپ کا فیض ہندوستان کے علاوہ بنگلہ دیش، پاکستان، لندن، افریقہ، اور دیگر عرب وانگلش ممالک میں عام ہوچکا ہے، ہزاروں کی تعداد میں آپ کے تلامذہ اور مریدین اقطاعِ عالم کے مختلف حصوں میں پھیل کر علم وعرفان کی شمعیں جلارہے ہیں، اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم دکھارہے ہیں؛ تلامذہ وخلفاء کے علاوہ آپ کے فیوضِ علمیہ، مواعظ، ملفوظات اور مکتوبات کی شکل میں مرتب ہوکر شائع ہوچکے ہیں، خصوصاً آپ کے فتاویٰ جو "فتاویٰ محمودیہ" کے نام سے اب تک اٹھارہ[1] جلدوں میں جمع ہوچکے ہیں وہ علمی دنیا کے لئے نہ صرف بیش بہا تحفہ ہیں بلکہ انمول خزانہ ہیں۔

غرض آپ کی تصنیفات وتلامذہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ اور پسماندگان کے لئے انشاء اللہ

---

[1] اور اب ۳۱ جلدوں میں ہے

قیامت تک راہنما ثابت ہوں گے، اس طرح آپ جسمانی اعتبار سے ہم سے جدا ہو کر بھی فیض و برکات کے لحاظ سے ہم میں موجود ہیں، ایسی ہی ہستیوں کے بارے میں کہا گیا ہے ۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اور ۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

بلاشبہ ان سطروں کے راقم کا حوصلہ نہیں کہ حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کا صحیح تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کر سکے، کہ

یہ راقم بے بصیرت ہے ان کے رتبہ کو کیا جانے!

محض اپنی سعادت سمجھ کر اور قارئین کا حق سمجھ کر ان سطروں کے لکھنے کی جرأت کیا ہوں آخر میں قارئین سے ادباً ملتجی ہوں کہ سب حضرات حتی المقدور حضرت کے لئے دعائے مغفرت و ایصالِ ثواب کا اہتمام کریں، ساتھ ہی اس دعا کا اہتمام بھی کہ حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے ان جگہوں کو پُر فرمائے جو ماضی قریب میں اکابر امت کے پے بہ پے اٹھ جانے کی وجہ سے خالی ہوتی چلی گئی ہیں۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز وھو حسبنا ونعم الوکیل

ڈاکٹر رفیق احمد بلگرامیؔ کے ساتھ ایک مجلس

ڈاکٹر رفیق بلگرامی کا ذکر راقم السطور بہت پہلے سے سنا ہوا تھا، اور ان کی پڑھی ہوئی حضرت حکیم محمد اختر صاحبؒ کی ایک نعت نے بہت متاثر کیا ہوا تھا، بڑی خواہش تھی کہ وہ حیدرآباد تشریف لاویں، ۲۳/نومبر کو جمعہ کے دن میں برادر مکرم جناب مفتی محمد عبدالمغنی صاحب مدظلہ سے ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ واقع مدرسہ فیض العلوم پہونچا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کی دعوت کو تسلیم کر کے ٹکٹ بنوالیا ہے اگلی اتوار کو حیدرآباد پہونچیں گے اور مقامی مجلس دعوۃ الحق کے ماہانہ اجتماع میں شرکت فرمائیں گے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن اپنے پہلے سے طئے شدہ نظام کے موافق مجھے گلبرگہ کے سفر پر جانا تھا۔ چنانچہ ۲۵/نومبر گلبرگہ اور ۲۶/نومبر تانڈور کے پروگراموں سے فارغ ہو کر جب احقر ان سے ملاقات کے لئے مدرسہ فیض العلوم پہونچا تو وہ نماز صبح ادا کر کے مخصوص احباب کے ساتھ اپنی قیام گاہ میں مجلس شعر وسخن جمائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ملاقات کی، بڑے تپاک سے ملے، ڈاکٹر صاحب کو قریب سے پہچاننے اور ساتھ رہنے کی نوبت پہلی دفعہ آئی، ڈاکٹر صاحب اپنی مخصوص طبیعت سے سب ہی احباب پر چھائے ہوئے تھے۔ راقم السطور سے خاص عنایات کا معاملہ فرماتے رہے، میں نے ڈاکٹر صاحب کی پہلی ہی ملاقات میں پرانوں کی طرح بے تکلفی دیکھی تو ان کی خدمت میں گستاخانہ جرأت کرتے ہوئے یہ شعر گذران دیا

آج یہ ان سے پہلی ملاقات ہے لیکن
ایسا لگتا ہے کہ برسوں کی شناسائی ہے

بہت محظوظ ہوئے، پھر انہوں نے اس کے جواب میں اپنے کلام سے خوب مستفید کیا،

ان سطروں میں جی چاہتا ہے کہ قارئین کو بھی ان کی محافلِ شعروسخن میں کچھ نہ کچھ شریک کروں مگر پہلے آپ ان سے مل لیجئے اس کے لئے میں نے ان سے قیام کے آخری دن جو انٹرویو لیا تھا بعینہٖ نقل کئے دیتا ہوں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ کا مکمل نام؟

جواب: رفیق احمد

سوال: والد بزرگوار کا اسم گرامی کیا ہے؟

جواب: واحد علی مرحوم!

سوال: آپ اپنا تخلص کیا کرتے ہیں؟

جواب: رفیق اور کچھ نہیں البتہ ہندی میں میں اپنا۔۔۔۔۔ تخلص رکھا ہوا ہوں، کوئی سولہ سال سے ہندی میں بھی سخن آزمائی کرتا ہوں اور اردو میں تقریباً ۲۳؍سال سے، ابھی پچھلے سال اُری ضلع جالون میں اتر پردیش ہندی ساہتیہ سنبھیلن نے مجھے ۲۴؍اکتوبر ۱۹۹۴ء کو "عبدالرحیم خانخاناں ایوارڈ" عطا کیا تھا، وہ لوگ زیادہ تر آرایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں۔

سوال: آپ کی پیدائش کہاں کی ہے اور کب کی؟

جواب: بلگرام ہی میں پیدا ہوا، ۱۱؍جون ۱۹۳۹ء کو

سوال: آپ کے اساتذہ فن کون ہیں؟

جواب: میں نے اثرؔ بلگرامی اور جوہرؔ بلگرامی سے استفادہ کیا ہے۔

سوال: ابتدائی تعلیم کے بارے میں کچھ بتلانا چاہیں گے؟

جواب: میری تعلیم بھی عجیب وغریب طرح ہوئی ہے، والد صاحب مرحوم کے انتقال کے وقت میری عمر پانچ چھ برس ہی رہی ہوگی، ابا کے انتقال نے والدہ کے لئے بڑے مسائل کھڑے کردیئے، ہم لوگ معاشی احوال سے بھی دوچار ہوئے، نتیجہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکا، ابتدائی تعلیم ویسے بلگرام ہی میں ہوئی مگر خانگی حالات تسلسل تعلیم کی اجازت

نہ دیتے تھے، مجھے اساتذہ بہت مشفق ومہربان ملے، چنانچہ ان حضرات کی توجہ اور اپنی طلب صادق سے میں باوجود فکر معاش کے تعلیم سے غافل بھی نہیں رہا اور الحمدللہ خارجی طور پر محنت کر کے امتحان میں شرکت کرتا رہا بالآخر روہیل کھنڈ یونیورسٹی الہ آباد سے ایم، اے اردو کا امتحان فرسٹ ڈیویژن سے پاس کرلیا۔

سوال: آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے آپ کو بتلایا میں والد صاحب کے سایہ سے بہت کم سنی میں ہی محروم ہوگیا، جب ہوش وشعور کے قابل ہوا تو ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر تھا، پھر والدہ صاحبہ جو بڑی محنت ومحبت سے ہماری پرورش کررہی تھیں وہ بھی بیمار رہنے لگیں، میں نے طب کے پیشہ کو ترجیح دی، چنانچہ ہومیو پیتھک کا امتحان دیکر اس میں کامیابی حاصل کی اور گھر ہی پر مطب شروع کیا، بس اب بھی وہی ذریعہ معاش ہے، جب گھر رہتا ہوں تو مریضوں کو دیکھ لیا کرتا ہوں۔

سوال: آپ کے پروگرام کہاں کہاں ہوئے؟

جواب: ہندوستان میں تو اتر پردیش کے تقریباً ہر ضلع میں مشاعروں میں شرکت ہوچکی ہے، اور پاکستان بھی جاچکا ہوں، پاکستان میں ''دبستان لوح وقلم'' نام کی ایک ادبی تنظیم ہے اس کا ہر سال مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس میں تین نشستیں ہوتی ہیں، ایک غزل کی، ایک نعت کی، اور ایک منقبت کی۔ منقبت سیدنا حضرت علیؓ کی شان میں کہنا ہوتا ہے، یہ تنظیم بھی مجھے مدعو کرتی رہی۔ اب چونکہ دو تین سال سے تعلقات دونوں ملکوں کے اچھے نہیں ہیں، اسلئے ان دنوں دعوت نامہ تو آیا تھا مگر پھر پروگرام کینسل ہونیکی اطلاع آ گئی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ مستقل طور پر بھی کسی تحریک یا ادارہ سے وابستہ ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں بلگرام میں ایک ادارہ ہے ''فردوسِ ادب'' یہ جامعہ اردو علی گڑھ کی شاخ ہے، ۱۹۷۲ء سے مجھے اسکا مہتمم چنا جاتا رہا، اور میں نے ابھی بتلایا کہ پاکستان میں ایک ادبی تنظیم ''دبستان لوح وقلم'' کے نام سے ہے، اس نے مجھے ''ادبی سیکریٹری فار

انڈیا'' مقرر کیا ہے، باقی میرا ذوق کسی مستقل ذمہ داری قبول کرنے کا نہیں، میں ایک طالب علم ہوں اور مجھے تعلیم میں لگا رہنا ہی زیادہ پسند ہے۔

سوال: تو ڈاکٹر صاحب آپ اب بھی کچھ پڑھ رہے ہیں؟

جواب: ہاں! میں نے ابھی پی، ایچ، ڈی کے لئے کانپور یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے، میرا عنوان ہے ''مسرت کی شاعری میں تحریکِ آزادی کا انعکاس'' شجاعت علی سندیلوی مجھے گائیڈ کر رہے ہیں، اسکے علاوہ ''ساہتیہ رتن'' جو ہندی کی عظیم سند ہے، اس کے لئے ہندو یونیورسٹی بنارس میں میں نے داخلہ حاصل کرلیا ہے، ابھی دسمبر میں اسکے امتحانات ہونے والے ہیں۔

یہ تو تھا ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا خاکہ! اب آیئے ہفتہ بھر یہاں ڈاکٹر صاحب جو اپنا کلام سنا کر سامعین کو محظوظ و مسحور کرتے رہے، اس میں سے کچھ آپ کی خدمت میں بھی پیش کرتا ہوں، ۶ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء کی افواہوں اور اندیشوں کے درمیان حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہو کر مدعائے دل کا اظہار فرما رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو

میرے اللہ پھر ایک بار تو ایسا کردے
ظلمت کفر میں حق کا اجالا کردے
پھر وہی عظمت رفتہ ہمیں حاصل ہو جائے
تو اک اشارہ جو اپنے کرم کا کردے
بھر دے انوار تجلی سے میرے سینے کو
تو اگر چاہے تو قطرے کو دریا کردے
اپنی ہستی کا تو عرفان عطا کر مولا
رحمت خاص کا سر پر مرے سایہ کردے
کبر و نخوت سے بچا شرک کی ظلمت سے بچا

روح کی جملہ عوارض کا مداوا کردے

پھر اپنی خاص تمنا کا اظہار ان الفاظ میں کررہے ہیں۔

ابرہہ وقت کا ہے درپئے توہین حرم
پھر کوئی واقعہ ویسا ہی دوبارہ کردے
اہل دنیا کے لئے ہوں وہ نشان عبرت
شر پسندوں کو تو رسوائے زمانہ کردے

ایک اور مناجات میں وہ اس طرح عرض کناں ہیں۔

خدایا قوم مسلم کو تو احساس خودی دے دے
حضور پاک ؐ کی ہر اک عمل میں پیروی دیدے
شعور زندگی دیدے خلوص بندگی دیدے
جہالت ختم جس سے ہو وہ علم وآگہی دیدے
بنا گفتار کے غازی کو تو پھر کردار کا غازی
اسے حسن عمل کی اے خدا توفیق بھی دیدے
بنیں ہم حامی سنت بنیں ہم ماحی بدعت
ہمیں اصحاب دین سے اس قدر وابستگی دیدے
رفیق اک اک سنت پہ عمل پیرا ہو ہر مسلم
تو اس کے دل میں عظمت اسلام کی دیدے

رفیق صاحب بارگاہِ احدیت میں عرض والتجا سے فارغ ہوتے ہیں تو فوراً دربار نبوی کا رخ کرلیتے ہیں اور ان کے اندر عشق ومحبت، عقیدت واحترام کی موجیں تھپیڑے مارنے لگتی ہیں، وہ کبھی ہجر ودوری کا گلہ کرتے ہیں تو کبھی شوق لقاء کا اظہار، کسی وقت نافرمانی وبے عملی کا اعتراف کرتے تو گاہے اطاعت وفرمانبرداری کا بیان، کبھی وہ اس محبوب ذات کی تعریف

وتوصیف بیان کرنیکی سعی کرتے ہیں اور کبھی اس باب میں اپنی تہی دامنی اور عاجزی و بے بسی کا اقرار۔

غرض وہ ایک خاص کیفیت جو ہر عاشق صادق پر طاری ہوتی ہے ان پر بھی طاری ہوجاتی ہے۔ایک دو نعتیں بھی ان کی سنتے چلئے۔ایک نعت میں انہوں نے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کوسوالات میں پیش کیا ہے ؎

مل گئی حق کی جسے محبوبیت وہ کون ہے؟
بعد از خلق ایسی برتر شخصیت وہ کون ہے؟
ہے سریر آرائے اوج آدمیت کس کی ذات؟
ہر بلندی پر ہے جس کو فوقیت وہ کون ہے؟
نور کا کس کے پرتو انجم وخورشید میں ہے؟
درحقیقت مخزن نورانیت وہ کون ہے؟
آیا ہے سینہ بہ سینہ کس سے علم وآگہی؟
چشم فیضان عشق ومعرفت وہ کون ہے؟
ظلم وسفاکی کس نے مٹائی عالم سے اے رفیقؔ؟
رحمت حق اور محسن انسانیت وہ کون ہے؟

اس نعت میں انہوں نے پہلے تو مدینہ منورہ کی دلربائیوں اور رعنائیوں کا منظر کھینچا پھر اپنے قلب مضطر کی تڑپ وطلب کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں: ؎

بارش انوار کا پرکیف منظر دیکھئے
جاکے طیبہ وہ سرور روح پرور دیکھئے
وہ معطر شام وہ صبح منور دیکھئے
جلوہ رعنائی محبوب داور دیکھئے

چند اشعار کے بعد فرماتے ہیں ؎

اہل دل کو مسجد نبوی میں آتے ہیں نظر
اب بھی صدیق و عمر، عثمان و حیدر دیکھئے
روضۂ اقدس پہ جاؤں میں بھی اک دن اے رفیقؔ
کب دکھاتا ہے مجھ کو وہ دن مقدر دیکھئے

دنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت بہت بگاڑ کا شکار تھی، تہذیب وتمدن کا گویا نام تک نہیں رہا تھا، اہل دل واہل علم بستیوں کو چھوڑ کر بیابانوں میں نکلے جارہے تھے، گویا انسانیت کا گلہ گھٹا جارہا تھا لیکن آقا نے تربیت فرمائی تو یہی بکریوں کے چَرانے والے جہاں بانی کے لائق ہوئے رفیق صاحب اسی کا نقشہ کھینچ رہے ہیں ؎

مصطفیٰ نے عالم کو فرحت وخوشی بخشی
نفرتوں کے جذبوں کو خلق ودوستی بخشی
اس سرائے فانی میں تنگ جن کا جینا تھا
رحمت دو عالم نے ان کو زندگی بخشی
پیکر کرم! تو نے ہم گنہ گاروں کو
کیف زندگی بخشا روح بندگی بخشی
ہے رفیقؔ محزوں پر یہ کرم تیرا
سب کو چین بخشا ہے اس کو بے کلی بخشی

اس نعت کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں، یہ ہر مومن کے دل کی آواز ہے ؎

دل میں طوفان سا موجزن ہے کاش ہم بھی مدینہ کو جائیں
غمزدہ یونہی رہ کر جہاں میں صدمۂ ہجر کب تک اٹھائیں

رشکِ خلد ہے شہرِ طیبہ، نور ساماں وہاں کی فضائیں
کاش ہم بھی مدینہ پہونچ کر وہاں کا ماحول دیکھ آئیں

اس تمنا کے اظہار کے ساتھ ہی ان کی دل کو کچھ آس سی ہو جاتی ہے اور وہ بے ساختہ خوشیاں مناتے ہیں۔

روضۂ پاک پر حاضری کے سیکھ تو اب آداب اے رفیقؔ
کیا پتہ؟ کب ترا وقت بدلے، کب تجھے شاہ طیبہ بلائیں

حمد ونعت کے علاوہ رفیق صاحب نے مختلف مشاعروں میں حصہ لیا ہے، ضرورت محسوس ہوئی تو بر وقت سادگی وانکساری کو چھوڑ کر وہ طنز وتنقید پر آتے ہیں، اور ہونا بھی یہی چاہیے، ایک مشاعرہ میں کانگریسی لیڈر مدعو تھے، فرقہ وارانہ صورتحال پر کوئی بات انہیں غیرت مسلم کے خلاف محسوس ہوئی، فوراً انہوں نے اس کا دندان شکن جواب دیا جو ظاہر ہے کہ کانگریسیوں کے لئے تیر ونشتر سے کم نہیں۔۔۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں ۔

اخلاص کے پیکر ہیں شرارت نہیں کرتے
ہم امن کے ماحول کو غارت نہیں کرتے
ہے حب وطن حالانکہ ایمان ہمارا
لیکن کبھی باطل کی حمایت نہیں کرتے
مذہب کے لئے جاں سے گذر جاتے ہیں لیکن
ہم اپنے اصولوں کی تجارت نہیں کرتے

انہوں نے ثبات واستقلال کے لئے حضرت حسینؓ سے نسبت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے ۔

ہم چاہنے والے ہیں حسینؓ ابن علیؓ کے
ظالم کی کسی طرح حمایت نہیں کرتے

غداری یا پاکستان نوازی کے الزام کو رد کرتے ہوئے کہا ؎

ہم کل بھی رفیق ان کے تھے، اب بھی ہیں لیکن
وہ خود ہی ادا حق رفاقت نہیں کرتے

کسی جگہ صحابہ کرامؓ کی اہانت کا اندازہ کیا تو احتیاط کی تلقین کر رہے ہیں ؎

بہت محتاط ہو کر آپ ان پر تبصرہ کیجئے
صحابہؓ ہیں رسول پاک کی صحبت سے وابستہ
رفیق ان کو امامِ وقت دنیا نے بنایا ہے
ہوئے جو مذہب اسلام کی دعوت سے وابستہ
بوبکرؓ وعمرؓ کا یہ تقرب ہے تعالیٰ اللہ
ہیں بعد مرگ بھی وہ آپ کی قربت سے وابستہ

اس صحبت میں بس مشتے از خروارے کے طور پر ان نمونوں پر اکتفاء کرتا ہوں، ورنہ اس بندۂ خدا کی جھولی میں بہت قیمتی موتیاں ہیں، جن کے پیش کرنے کے لئے جریدہ کے صفحات میں گنجائش نہیں ہے۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ رفیق صاحب کو باعافیت وسلامت رکھیں۔ آمین

حضرت جی مولانا انعام الحسن رحمۃ اللہ علیہ

(۱۳۳۶ھ —— ۱۴۱۶ھ)

۱۰ رمحرم الحرم ۱۶ ہجری (یوم العاشورہ) کی شب کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب حضرت جی مولانا محمد انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صبح ہوتے ہوتے اس حادثہ کی اطلاع ملک کے طول وعرض بلکہ بیرون ممالک تک پہونچ چکی تھی، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو حضرت جی ہی کے نام سے گویا متعارف تھے) نے اپنی زندگی پوری کی پوری دین اسلام کی دعوتی محنتوں میں صرف فرمادی، حضرت مولانا کا وطنی تعلق کاندھلہ کی اسی مردم خیز سرزمین سے تھا جسے ہندوستان کے نامور علماء، محدثین اور صوفیاء کا وطن ہونے کا صدیوں سے شرف حاصل ہے، تعلیم کی تکمیل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے فرمائی تھی، وقت کے نامی گرامی مشائخ واساتذہ کی تعلیم وتربیت نے ان کے اندر امت کا درد اور دین کی تبلیغ کا احساس وفکر کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا، دورانِ تعلیم ہی سے ان کے ذوق کا رجحان حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوتی تحریک کی طرف مائل ہو گیا تھا جو اس وقت ابتدائی مراحل میں تھی، اور اب تبلیغی جماعت کے نام سے پورے عالم میں مشہور ہے، مولانا نے اس کام کو اسی زمانے میں قریب سے جان پہچان اور سیکھ کر اختیار فرمالیا تھا، حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا جب سانحہ ارتحال پیش آیا اور ان کے صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کام کے ذمہ دار وامیر تسلیم کئے گئے تو حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے ہم درس وہم زلف ہونے کے باوجود ان کی قیادت میں پوری یکسوئی اور اخلاص وللہیت کے ساتھ اپنے آپ کو اس کام میں مشغول

کرلیا تھا، اس کے بعد سے حضرت مولانا یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال تک سفر وحضر میں ہر وقت ان کے رفیق کار بلکہ یارِ غار رہے، ۱۳۸۶ھ میں جب مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی انتقال ہوگیا تو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ کے حکم سے ان کو تبلیغی تحریک کا عالمی امیر قرار دیا گیا، اس وقت سے تادم واپسیں مولانا رحمۃ اللہ علیہ مسلسل اس کام کی ذمہ داری نباہتے رہے، ان کے دور میں کام وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا، ملک کے طول وعرض میں اس کا پھیلاؤ تو ہوا ہی عالم کے شرق وغرب میں بھی اس کی شاخیں پھیلتی چلی گئیں؛ کام کی نگرانی، کارکنان کی تربیت، حالات سے آگہی، مسائل کا اندازہ اور ان کا ازالہ ، اجتماعات کا انعقاد اور ان کی سرپرستی، اس کے لئے دور دور علاقوں کے پر مشقت اسفار وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں کہ انکی تکمیل کوئی آسان کام نہیں لیکن اللہ پاک جس سے جو کام لینا چاہتے ہیں اس کو اس کی صلاحیت بھی عطا فرما دیتے ہیں؛ مولانا ان تمام ذمہ داریوں کو اپنی ناسازی صحت اور پیرانہ سالی کے باوجود اخیر دم تک انجام دیتے رہے؛ فجزاہ اللہ عنا وعن سائر المسلمین احسن الجزاء

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اجتماعات میں جو اپنا مختصر سا پیغام امت کو دیا کرتے تھے اس میں اکثر اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ زندگی کو بندگی کی لائن پر ڈالنے کیلئے جان ومال کی قربانی کے ساتھ اللہ کی راہ میں نکلنے کی مشق کریں؛ کام میں لگے ہوئے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ کسی کے اعتراض کی پرواہ کئے بغیر اصولوں کے ساتھ کام میں لگے رہیں، اجتماعات میں نکاح کا خطبہ دیتے تو بڑی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ تلقین فرماتے کہ معاشرہ کو خلافِ سنت رسومات سے پاک کرکے سنت کے انوار سے معمور کرنا بہت ضروری ہے۔

بہرحال! ان کی جدائی دعوت وتبلیغ کے کارکنان کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے ایک نقصانِ عظیم ہے، خصوصاً اس قحط الرجال کے دور میں ـــــ جبکہ جانے والے اکابر کی جگہیں پر ہوتی نظر نہیں آتیں ـــــ اپنے بزرگوں میں سے ایک ایک کا اٹھ جانا ہم جیسے ضعیف الایمان اور کمزور اعتقاد لوگوں کے دل میں ایک قسم کی مایوسی اور تاریکی پیدا

کردیتا ہے۔اللھم لا تحرمنا اجرھم و لا تفتنا بعدھم ؛ پھر بھی اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کو سوچ کر —— کہ جب تک یہ کائنات قائم ہے اللہ کے محبوب ومقبول بندوں کی ایک جماعت بھی قائم رہے گی جوحق کا احقاق اور باطل کا ابطال کرتی رہے گی —— کچھ ڈھارس بندھتی ہے۔

قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ سمیت تمام مرحوم بزرگوں کے لئے دعاء مغفرت اور موجودہ اکابر کیلئے دعاء صحت ودرازی عمر فرماتے رہیں۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم واکرم نزلھم ووسع مدخلھم وابدلھم دارا خیرا من دارھم واھلا خیرا من اھلھم اللھم متع المسلمین بطول حیاۃ علمائھم ومشائخھم ودعاتھم وکثر امثالھم برحمتک یاارحم الراحمین

آخر میں ایک اہم امر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے اکابر کی شان اور ان کی خاص پہچان ہی اتباع سنت میں کمال اور اہتمام ہے، ان کی زندگیاں سنت کے اہتمام اور سنت کی دعوت اور سنتوں کے احیاء کی محنت کے واقعات سے معمور ہیں؛ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے ان بزرگوں کے وصال پر ان کی تجہیز وتکفین اور تدفین کے معاملات میں ان کے وارثین وخدام کی طرف سے خلاف سنت طریقے صادر ہونے لگے ہیں؛ نماز جنازہ میں تاخیر، ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقلی، متعدد نمازیں پڑھنا وغیرہ امور سب بصراحت فقہاء خلاف سنت ہے، ماضی قریب میں پاکستان میں بھی متعدد اکابر کے وصال پر ایسے واقعات سامنے آئے اور یہاں بھی حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین میں باوجود نصف شب میں وصال فرمانے کے عاشوراء کی شام تک تاخیر کی گئی؛ جبکہ حدیث پاک میں ہے کہ "کسی مسلمان کی میت کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کے گھروالوں کے بیچ میں دیر تک رہے۔ (معارف الحدیث بحوالہ ابوداؤد ۳/ ۴۵۶) اس صریح ہدایتِ نبوی کی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ کثرت مجمع کے انتظار میں بھی تاخیر درست نہیں ہے؛ حتی کہ اگر

جمعہ کا دن ہے اور جمعہ سے قبل تدفین کر کے جمعہ کی تیاری کی جاسکتی ہے تو نماز جمعہ کا انتظار کرنا بھی مکروہ ہے؛ غرض یہ ہے کہ آج کل ان باتوں کا اہتمام اکابر کے انتقال پر کم ہوتا جارہا ہے جوان بزرگوں کی عاشق سنت روحوں کے ساتھ بڑی ناانصافی وزیادتی کی بات ہے؛ ویسے بھی زندوں کی مصلحت دیدار وشرکتِ جنازہ وغیرہ کی خاطر میت کے مصالح کونظر انداز کردینا کیسے مناسب ہوسکتا ہے؟ چونکہ عوام الناس بڑوں کے ہر عمل کو بلاتحقیق کئے جواز کی دلیل سمجھ لیتے ہیں اس لئے اس وضاحت کوضروری سمجھا گیا۔

استاذِ محترم

حضرت سید شاہ قادر معظم شہید رحمۃ اللہ علیہ

(۱۳۵۵- ۱۴۱۱ھ)

نام ونسب:

آپ کا اسم گرامی سید قادر معظم ابن سید محمد ایوب ابن سید محمد غوث ہے؛ صوبہ مہاراشٹرا کے ایک سادات خاندان سے آپ کے آباء واجداد کا تعلق ہے؛ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے جد امجد بڑے اونچے درجہ کے درویش صفت بزرگ تھے، جن کا مزار پر بھنی میں اب بھی مرجع خلائق ہے، کاش کہ شجرۂ نسب مل جاتا تو اس سلسلہ کے بہت حقائق ووقائع سامنے آتے؛ معلوم ہوا کہ اس خاندان کا تاریخی سرمایہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے تایازاد بھائی جناب عقیل صاحب کے پاس محفوظ ہے جو کہ لندن میں ہیں راقم السطور کیلئے اس وقت وہاں سے ان کا فراہم کرنا مشکل ہے اس لئے سلسلۂ نسب یہیں پر ختم کیا جاتا ہے۔

والدین

آپ کے والد سید محمد ایوب صاحب تقسیم ہند سے پہلے تلاشِ معاش کے سلسلہ میں اپنے آبائی وطن پربھنی سے ترک مستقر کر کے حیدرآباد پہنچے اور یہیں قیام پذیر ہوگئے، وہ ایک شریف النفس اور وضع دار آدمی تھے، حیدرآباد کی ایک قدیم بستی کاچی گوڑہ میں ان کا مکان تھا، سائیکل اور اسٹو رپیرینگ کا کام کرتے تھے اور سلطان بازار میں اس فن کے ماہر کی حیثیت سے معروف ومقبول تھے، علمی ودینی اعتبار سے کوئی خاص مقام ومنصب کے حامل تو نہ تھے مگر بہر حال سادہ مزاج پُروقار اور سمجھدار آدمی تھے؛ البتہ اخیر زمانہ میں اپنے صالح

ونیکوکار صاحبزادے کی دینی عملی ونورانی زندگی سے متاثر ہوکر خود بھی حتی المقدور دین داری کی جانب بڑھنے کی کوشش کرنے لگے تھے، وہ شروع میں صاحبزادے محترم کے دینی رجحانات سے نالاں رہا کرتے تھے مگر اخیر عمر میں نہ صرف یہ کہ ان سے متاثر ہوگئے تھے بلکہ غیر معمولی اعتقاد ان کے قلب میں اپنے بیٹے کا پیدا ہوگیا تھا، جمعہ کی نماز اہتمام سے ان کے پیچھے ادا کرتے تھے اور فخر سے کہا کرتے تھے کہ ان کے پیچھے نماز ادا کرنا میرے لئے سعادت ہے، ۲۷رذی الحجہ ۱۴۰۲ھ م ۱۵راکتوبر ۱۹۸۲ء شنبہ کی رات میں قریب پونے دس بجے اس دنیا سے رحلت فرماگئے، انتقال سے قبل اپنے اس متقی وپرہیزگار اور صالح کردار صاحبزادے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور بار بار اسے چومتے جاتے تھے اور فرماتے کہ "مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اس مقام ومرتبہ کے آدمی بنوگے"۔ آپ کی والدہ "رابعہ خاتون" تو بہت پہلے ہی (یعنی ۲۴رجمادی الثانیہ ۱۳۷۷ھ م ۱۵رجنوری ۱۹۵۸ء چہارشنبہ کے دن صبح ۱۱ بجے) وفات پاگئیں تھیں آپ نے انھیں کی نسبت سے اپنی بڑی صاحبزادی کا نام رابعہ تجویز فرمایا تھا، ایک بڑے بھائی سید اعظم صاحب تھے جو جامعہ عثمانیہ میں فورمین کی حیثیت سے کام کرتے تھے، تین بہنیں ہیں تینوں ماشاء اللہ حیات ہیں جن میں بڑی بہن کے شوہر کا انتقال ہوگیا، منجھلی بہن جناب طٰہٰ صاحب ڈائرکٹر ملے پلی آئی ٹی آئی کی زوجہ ہیں، اور سب سے چھوٹی بہن مجردہ ہیں؛ والد صاحب، بڑے بھائی اور بڑے بہنوئی صاحب کی تجہیز وتکفین خود آپ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔

ولادت وطفولیت:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت بتاریخ ۵رذی الحجہ ۱۳۵۵ھ ان کے آبائی وطن پربھنی میں ہوئی، آپ کے نانا محمد سلیمان خان نے آپ کا نام قادر معظم تجویز کیا، جس سے آپ کی تاریخِ ولادت بھی نکل سکتی ہے، اسی تاریخی نام سے آپ معروف رہے، بچپن ہی سے آپ اپنے دوسرے بھائی بہنوں کے مقابلہ میں مخصوص مزاج، منفرد طبیعت رکھتے تھے آپ کا بچپن دیکھنے والے ایک صاحب کے بقول اسی زمانہ سے آپ کی ایک نرالی

شان تھی، ممتاز مشاغل اور پختہ عزائم کے حامل تھے۔ خاندان کا ماحول شروع ہی سے وہ نہیں ہے جو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اس لئے باوجود سعی وکوشش کے ان کے اہلِ خاندان سے ان کے بچپن کے اہم واقعات وحالات کا پتہ نہ چل سکا، ان کی بہنوں نے بحیثیت مجموعی ان کے اخلاق وکردار خصوصاً بڑوں کے ادب واحترام کی تعریف کی اور اس سے اپنے بے حد تاثر کا اظہار کیا، ان کی بڑی بہن ڈاکٹر صفیہ اریب کا کہنا ہے کہ وہ شروع ہی سے خاموش مزاج، حساس وذہین، عافیت پسند، کم گو، متحمل وبردبار، ضد سے متنفر، لڑائی جھگڑوں سے دُور، نہایت نرم خو اور شریف النفس تھے مثل مشہور ہے ؎

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

تعلیم وتربیت:

جب پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو حسبِ اصول ودستور آپ کو پڑوس کی مسجد منیہار پٹی میں دینی وقرآنی تعلیم کے لئے بھیجا جانے لگا، گھر والوں کا رجحان چونکہ عصری علوم کی طرف تھا اسی لئے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے بھی یہی لائن منتخب کی گئی اور عیسیٰ میاں بازار پرائمری اسکول میں شریک کردیا گیا؛ جب تعلیم شروع ہوئی تو آپ نہایت مستعدی اور دلچسپی سے اسکول میں منہمک ومصروف ہوگئے، سال بہ سال ترقی فرماتے رہے تا آنکہ پرائیمری اسکول کا سلسلہ ختم ہوا اور آپ نے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا؛ پھر کسی وجہ سے اسکول تبدیل کرکے دارالشفاء ہائی اسکول میں گئے، وہیں سے آپ نے میٹرک پاس کیا پھر ملے پلی آئی ٹی آئی سے مشنسٹ کی سند حاصل کی، سنا ہے کہ اس کے بعد انھیں گورنمنٹ کی ملازمت بھی ملی تھی لیکن انھوں نے اسے قبول نہیں فرمایا۔

فنون سپہ گری:

اُن دنوں حیدرآباد میں سپہ گری سے نوجوان طبقے کو دلچسپی تھی جس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جاتا تھا، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس فن سے مناسبت تھی اسی لئے آپ نے ان فنون کو سیکھنے کا ارادہ فرمایا، اسکے لئے آپ محلہ ٹھگی جیل کی مشہور تربیت گاہ سپہ گری موسوم بنام "تعلیم

حیدری'' سے وابستہ ہو گئے اور عبد القیوم اور باشو پہلوان کی زیرِ تربیت اس سلسلہ کے مختلف فنون سیکھے، چند ہی دنوں میں آپ نے طبعی مناسبت اور جسمانی موزونیت اور فکر ومحنت کے ذریعہ استاذ کی نگاہ میں اچھا مقام بنالیا، اور وہ اپنے باکمال شاگرد پر فخر ومسرت کا اظہار کرنے اور دوسروں کو ان کی مثال دینے لگے، آخیر زمانہ بلکہ شہادت سے دو ایک برس قبل تک بھی ان کو ایک نگاہ دیکھنے والا جسم کی مضبوطی اور بناوٹ سے ایک عرصہ تک کی گئی جسمانی ورزش اور قویٰ کا بآسانی اندازہ لگا سکتا تھا، تاہم ان فنون کے عملی مظاہرے کو تعلیم کے ساتھیوں اور چند مخصوص حضرات کے علاوہ کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔

ذہنی انقلاب:

جب آپ رحمۃ اللہ علیہ نے آئی ٹی آئی میں داخلہ لیا تو ظاہر ہے کہ عمر مبارک کامل شباب اور پورے آب وتاب کو پہنچ چکی ہوگی، یہی وہ زمانہ ہے جس میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کی فکر ونظر میں وہ عظیم اصلاحی انقلاب برپا ہوا کہ جس نے تعلیمِ جدید سے ان کی طبیعت کو برگشتہ کر دیا، بلکہ اس لائن سے ان کی مناسبت ختم کر دی، اس کے مقابلہ میں تعلیمِ دین سے رغبت اور ایمان وعمل کی سرگرمیوں سے تعلق ومحبت کی روح پوری حرارت کے ساتھ پھونک دی، یہ کیفیت ہر دن پختہ اور ہر آن مستحکم ہوتی رہی، باوجود جستجو کے مجھے اس عظیم انقلابِ ذہنی کا ظاہری باعث اور ابتدائی محرک معلوم نہ ہوسکا؛ البتہ آپ ہی کے بقول ان دنوں خوش قسمتی ونیک بختی سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دو مسترشد مولانا فضل الرحمن صاحب دہلوی اور مولانا میر امام الدین صاحب حیدرآبادی علیہما الرحمۃ سے تعارف اور ان کی نورانی مجالس ومحافل میں شرکت کے مواقع حاصل ہوتے رہے، ان حضرات کی ایمان افروز گفتگوؤں اور شفقت آمیز برتاؤ وسلوک نے اپنی عظمت ومحبت کا سکہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے قلبِ مبارک میں بٹھا دیا تھا، مولانا امام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سنِ وفات اور اس وقت حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سنِ عمر میں تطبیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تربیتِ ذہنی وعلمی میں زیادہ دخل ان ہی کا تھا، بہرحال سببِ ظاہری وقریبی کچھ بھی ہو یہ تو طئے ہی ہے کہ اس کی

اصل محرک وحقیقی باعث توفیقِ خداوندی وقبولیتِ الٰہی ہے حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ خواہشاتِ نفسانی کے ناپاک دھارے میں بہنے، حب الدنیا کے قعر میں پھنسنے اوراغوائے شیطانی کا شکار ہونے سے بچ کر درجاتِ عالیہ اورثمراتِ غالیہ کو حاصل کریں، خود ہدایت یاب ہوں اوروں کوراہ ہدایت دکھلائیں اور بالآخر مقامِ شہادت کی رفعتوں اور بلندیوں سے مالا مال ہوجائیں۔

تحصیلِ علم دین

جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ سنِ شعور وادراک کو پہنچنے پر آپ کو ایسی چند برگزیدہ ہستیوں کا شرفِ صحبت حاصل ہوا جو صاحبِ نسبت وصاحبِ باطن ہونے کے ساتھ ساتھ اہل علم وفہم بھی تھے، ان حضرات کی صحبت نے کیمیا کا اثر کیا اور دھیرے دھیرے آپ کا طبعی رجحان اور قلبی میلان علوم عصریہ سے ہٹ کر علوم دینیہ کی جانب مائل ہوگیا، یہ نہیں معلوم کہ ان بزرگوں میں سے کسی نے ترغیب دی یا آپ نے ازخود طے فرمالیا کہ علم دین حاصل کروں مگر جب اس کا اظہار اپنے بعض اہلِ تعلق کے سامنے کیا اور عزم مصمم ظاہر فرمایا تو ان کے مخلص وکرم فرما پڑوسی —— جناب غوث محی الدین صاحب ناظم تعلیمات حکومتِ آندھرا پردیش جو بعد میں آپ کے خسر بھی ہوئے —— نے آپ کو اس مقصد کی بہتر تکمیل کے لئے ہردوئی کے مدرسہ اشرف المدارس میں رجوع ہونے کا مشورہ دیا، اور ظاہر ہے کہ ادھر یہ اکابرِ ثلاثہ —— یعنی مولانا میر امام الدین صاحب حیدرآبادی، مولانا سردار علی صاحب حیدرآبادی، اور مولانا فضل الرحمن صاحب دہلوی مسترشدینِ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جن کی صحبت وتربیت کے طفیل آپ کا رجحان ومیلان علم دین کی جانب ہوگیا تھا —— نے بھی اس مشورہ کی کامل حمایت اوراس کی تکمیل میں ہرطرح کی نصرت فرمائی ہوگی؛ لیکن ان کے والد صاحب اپنے بیٹے کو اتنی دور بھیجنے کے لئے آمادہ نہ تھے، آپ نے اپنے تایا صاحب سے مشورہ لیا، تایا نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید کی اور آپ کے والد سے کہا کہ نوجوان آدمی ہے اس کو ایک اچھا جذبہ ہے، اس کے جذبات کو ٹھیس نہ پہونچایا جائے بلکہ اجازت دے دی جائے

ہردوئی کا سفراور وہاں قیام

چنانچہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سفر کا ارادہ فرمالیا اور اس زمانہ میں اس قسم کے سفر طول مسافت، تغیر آب وہوا اور خود وسائل سفر کی قلت اور اس میں حد درجہ مشقت کے اعتبار سے ہمت وحوصلہ والوں ہی سے ممکن تھے؛ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی خداداد ہمت اور ذوق وشوق نے بہر حال وہاں تک پہونچادیا اور آپ نے مدرسہ اشرف المدارس کے شعبہ حفظ میں داخل ہوکر تعلیم کا آغاز فرمادیا، لیکن کچھ ہی دنوں میں دردِ سر کا عارضہ کچھ اس طرح لاحق ہوا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو حفظِ قرآن کا ارادہ ترک کر کے عربی وفارسی شروع کرنی پڑی۔

اساتذہ کرام

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اشرف المدارس میں خود محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی پڑھایا کرتے تھے اس لئے بہت ممکن اور غالب گمان ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شرفِ تلمذ حاصل ہوا ہوگا، وگرنہ تربیت وسرپرستی تو حضرت کی حاصل ہی رہی، آپ نے تین سال ہردوئی میں قیام فرمایا، اسی دوران حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کی سعادت بھی ملی اور اسفار میں رفیقِ سفر رہنے کا شرف بھی بارہا حاصل ہوا، اطاعت وفرمانبرداری، محبت وخوش اعتقادی کے ذریعہ آپ نے تمام مدرسہ والوں کے دل میں ایک مقام بنالیا تھا، اور سعادت مند صالح طلباء میں آپ کا شمار ہونے لگا تھا، ادھر حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے بھی آپ پر شفقاتِ کثیرہ واحسانات عدیدہ کا معاملہ روز افزوں ہوتا گیا، سنا گیا ہے کہ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کو رمضان المبارک میں اپنے ساتھ سحری میں اکثر شریک رکھتے تھے، اور مختلف طریقوں سے آپ کا خیال فرمایا کرتے تھے، چنانچہ جب آپ جب چند ناگزیر وجوہات اور خانگی مصالح کی بناء پر ترکِ تعلیم کر کے وطن لوٹ رہے تھے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی شفقت کے ساتھ دعائیں دے کر رخصت فرمایا اور موسم گرما کا لحاظ فرماتے ہوئے گھر سے ایک صراحی بھی عنایت فرمائی کہ دورانِ سفر راحت ملے۔

مدرسہ اشرف المدارس کے دوسرے قابلِ ذکر اساتذہ میں حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ — خلیفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ — کا اسم گرامی اہم ہے، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو انتہائی محبت تھی اور عجیب طرح کی اُلفت ومودت؛ جس کا نہ صرف یہ کہ طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ آخری وقت تک بھی جب بھی دونوں کی ملاقات ہوتی تو بخوبی اندازہ ہوتا تھا، اس واقعہ سے آپ بھی اندازہ لگائیں اور شاگرد واستاذ کے درمیان اس غیر معمولی اور قابلِ رشک تعلقِ خاطر سے لطف اندوز ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حیدر آباد (مدرسہ فیض العلوم) میں ذرا طویل قیام تھا، موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وقتی طور پر حضرت سے کچھ پڑھنا شروع کیا، مدرسہ میں میقاتِ اولیٰ سے فراغت پاتے ہی کتاب لے کر سیدھے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر پہنچ جاتے اور تھوڑی دیر استفادہ فرماتے تھے؛ دریں اثناء حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دن کے لئے سفر نلگنڈہ پیش آیا، وہاں سے واپسی پر جب حسبِ معمول حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پڑھنے کیلئے پہونچے تو ارشاد فرمایا "مجھے لوگ وہاں روک رہے تھے مگر میں آپ کی خاطر سے واپس آ گیا" سبحان اللہ! کیا تعلق تھا اور کیسی محبت تھی جانبین میں — راقم الحروف نے ہردوئی میں پڑھنے کے زمانے میں دیکھا تھا کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ درسگاہ میں پڑھانے کے لئے کتاب کے جو نسخے ساتھ لاتے تھے ان میں کئی ایک پر "احقر قادر معظم غفرلہ" لکھا ہوا تھا، کسی سے سنا بھی تھا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے واپسی کے وقت اپنی کتابیں شفیق استاذ کی خدمت میں پیش کر دی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم ہوسکا کہ ہردوئی میں اور کن کن حضرات سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شرفِ تلمذ حاصل ہوا اس لئے اِنہی دو اکابر کے تذکرہ پر اس عنوان کو ختم کرتا ہوں — واضح رہے کہ آپ کی باقاعدہ تعلیم کی کل مدت لگ بھگ تین سال ہے اس کے بعد آپ بوجوہ خاص تکمیلِ تعلیم نہ کر سکے اور اپنے بڑوں کے مشورہ سے ترکِ تعلیم کر کے وطنِ عزیز حیدر آباد لوٹ آئے۔

اکابر مسلک سے تعلقِ خاطر

یہاں پہنچ کر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ تر حضرت مولانا سردار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت ومعیت کو اپنایا، ان کی خدمت میں پابندی سے حاضر ہوتے ان سے مسائل شریعت وطریقت میں استفادہ فرماتے اوران کے نورِ باطنی وحرارتِ ایمانی سے اپنے باطن کو منور کرتے تھے؛ مولانا بھی آپ کو بہت چاہتے تھے اور حد درجہ محبت فرماتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کو جب کبھی کوئی بے چینی اور پریشانی تنگی وانقباض کی کیفیت محسوس ہوتی دوڑ کر ان کی خدمت میں پہنچ جاتے اور ایسا محسوس کرتے کہ ساری پریشانیاں کافور ہوگئیں، اور قلب وذہن کو نور وسرور حاصل ہوگیا، جس اہتمام سے آپ کو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے شاید ہی کہیں اور جاتے ہوئے دیکھا گیا ہو، اسی لئے ان کو بھی آپ کے خاص اساتذہ اور مربیین میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔

اسی طرح مولانا فضل الرحمٰن صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کے ممدوح بزرگوں میں سے تھے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ انھیں بہت محبت اور ادب واحترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یاد فرماتے تھے، ایک مرتبہ ذکر کیا کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب ایک عرصہ حیدرآباد میں قیام کے بعد واپس اپنے وطن دہلی چلے گئے تھے، پھر کچھ عرصہ بعد کسی کام سے اُن کا حیدرآباد تشریف لانا ہوا، مجھے معلوم ہوا تو میں فوراً حضرت سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کیلئے حاضر خدمت ہوا، مجھ سے مل کر بہت خوشی ومحبت کا اظہار فرمایا اور فرمایا: ”تم کیوں ملنے آگئے، میرے اس سفر کا ایک مقصد تو تم سے ملاقات کرنا بھی تھا، میں خود تمہارے پاس ملنے آجاتا“ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بزرگوں کا یہ تعلق آپ رحمۃ اللہ علیہ کیساتھ یوں ہی نہیں تھا، بلکہ ان حضرات نے آپ میں وہ بیش بہا جواہر دیکھے تھے جو قدرت اپنے کچھ منتخب بندوں ہی کو اپنے فضل سے عطا فرماتی ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

راقم الحروف کہتا ہیکہ ہم لوگ محسوس کیا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کا سب سے بڑا سرمایہ جس پر وہ فخر کرتے تھے وہ انہی بزرگوں کی محبت وشفقت

کی یادیں تھے۔

سمجھتے ہیں اہل ممالک تو یہ کہ بس بادشاہت بڑی چیز ہے
مگر جو ہیں اہلِ نظر اہلِ دل وہ کہتے ہیں چاہت بڑی چیز ہے

بیعت وارادت اور تکمیلِ سلوک

قیامِ ہردوئی کے دوران یا پھر وہاں سے واپس ہوتے وقت حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ مبارکہ میں پہونچ کر شرفِ باریابی وسعادت ارادت حاصل کی، یہ زمانہ غالباً ۱۹۸۴ء کا ہوگا، حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کے ساتھ بڑی شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا: ادھر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی خوب تندہی اور دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے اہتمام کے ساتھ استفادہ واستفاضہ میں یکسوئی کے ساتھ مشغول رہے، تین سال تک حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ سے کسبِ فیض فرماتے رہے، اس مدت میں تین مرتبہ خانقاہِ وصی اللٰہی میں حاضری دی اور ایک مرتبہ قریب پندرہ دن تک قیام فرمایا، حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں عوام وخواص کے لئے دو علاحدہ مجلسیں ہوتی تھیں، عام مجلس میں تو خواص بھی شریک ہو سکتے تھے لیکن خاص مجلس میں عوام کو شرکت کی اجازت نہ تھی، اسلئے کہ وہاں جو مضامین بیان ہوتے تھے، ان کا سمجھنا سب کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے صرف وہی حضرات اس میں شریک رہتے تھے جنھیں حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں شرکت کی اجازت یا از خود ہدایت فرمائی ہو؛ مولانا عبد الرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ (جو حضرت کے بہت ہی خاص خادم اور اجل خلیفہ تھے) نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑ کر حضرت مصلح الامت کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ حضرت کیا انھیں خصوصی مجلس میں شرکت کی اجازت ہے؟ تو حضرت نے فرمایا "ہاں ضرور ہے"۔

مخفی مباد کہ حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ چمنِ اشرف ہی کے ایک گلِ سدا بہار تھے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سے تکمیل کر کے اور اجازت وخلافت لے کے جانے والوں میں بہت سی مشترکہ صفات وخصوصیات کے ساتھ ساتھ ہر ایک کا ایک ممتاز اور

جداگانہ رنگ بھی تھا، چنانچہ حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک امتیاز تھا، مجھ جیسا ناآشنائے طریقت ومحروم رازہائے معرفت اس کی صحیح تعریف اور مناسب تعبیر کا قطعاً اہل نہیں مگر بزرگوں سے ان کے تذکرے سننے اور ان کی تصانیف کے مطالعہ کرنے سے فہم ناقص میں جو بات آئی وہ یہ کہ ان کے ہاں واردین وسالکین کے لئے بڑی خاص شرائط تھیں اور اہلِ اخلاص کو پرکھنے کی ایک مخصوص کسوٹی تھی، اتنی مخصوص کہ اچھے اچھے لوگ اس میں صحیح اُترنے سے رہ جاتے تھے؛ اس لئے وہاں عام لوگ تو ٹکتے ہی نہ تھے، خاص حضرات کو بھی بسا اوقات بڑی نازک صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ ایسی بارگاہ میں قبولیت کا حاصل ہوجانا اور اس قدر شفقت وخصوصیت کا معاملہ فرمایا جانا صاف اشارہ دیتا ہے کہ حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہِ قلندری اور بصارتِ باطنی نے اس نوجوان صالح کی پیشانی پر کامیابی وبامرادی، اخلاص وللٰہیت کے ستارہ کو تابندہ دیکھ کر تاڑ لیا تھا کہ مستقبل میں یہ نوجوان بڑے مقام ومرتبہ تک پہونچنے والا ہے۔

بہر حال! آخری ملاقات حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ سے بمبئی میں اس وقت ہوئی جب کہ حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ سفر حج کے عنوان سے سفرِ آخرت کی تیاریوں کے سلسلہ میں وہاں مقیم تھے، شرکتِ سفر کے خواہشمندوں کا بھی تانتا بندھا ہوا تھا اور ملاقات اور زیارت کی غرض سے حاضر ہونے والوں کا بھی ہجوم تھا، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی پہنچے اور چند دن قیام فرمایا، جب واپس ہونے لگے تو خود انہی کی روایت ہے کہ حضرت دیر تک دستِ شفقت میرے اوپر پھیرتے رہے اور پھر دعائیں دیتے ہوئے اجازت عطا فرمائی، یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ”تمہارا وطن بہت دور ہے ورنہ جی یوں چاہتا ہے کہ تمہیں چھوڑنے تمہارے وطن تک جاؤں“ اس واقعہ کو بیان کرکے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ گھر پہونچنے تک حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کے یہ پیار بھرے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے جارہے تھے، اور ذرہ نوازی وخُرداں پروری کا یہ عجیب وغریب واقعہ مجھے رُلاتا جارہا تھا۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع

۱۹۸۷ء میں جب حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کا دورانِ سفر حجاز سانحہ ارتحال پیش آیا اور وہ سپردِ سمندر کردیئے گئے تو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ نے ارادت واستفادہ کے لئے ان کے ایک خلیفۂ اجل وفاضلِ معدن العلوم وانمباڑی حضرت مفتی محمود حسن پیارم پیٹی رحمۃ اللہ علیہ کا حسنِ انتخاب کیا اور ان سے مکاتبت کے ذریعہ رجوع ہو گئے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالمِ دین اور وانمباڑی کے فضلاء قدیم میں سے تھے، حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اور اجازت یافتہ بھی تھے، پیارم پیٹ ضلع جنوبی آرکاٹ تمل ناڈو ان کا وطن تھا اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فقیہ اعظم پاکستان کے بھی مجاز تھے، یہاں بھی باہمی اعتقاد واعتماد محبت ومودت کی وہی تفصیلات پیش آئیں جو دیگر بزرگوں کیساتھ تعلقات کے سلسلہ میں اوپر مذکور ہوچکی ہیں، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تو خیر ہونا ہی چاہیے تھا کہ وہ طالب صادق اور مرید عاشق تھے اور مرید کا اپنے شیخ سے عقیدت ومحبت رکھنا اور ہمہ وقت اسی کے تذکرے سے رطب اللسان رہنا نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ ہی حیرت واستعجاب کی، لیکن قابلِ فخر ولائقِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی محبت اور اس درجہ تعلق تھا جو اللہ کے نیک بندوں کو ہزاروں لاکھوں میں کسی کسی سے ہوجاتا ہے، چنانچہ ایک خط کے جواب میں انھوں نے لکھا:

"عزیز محترم! میں آپ کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں، ماشاء اللہ آپ اس قابل ہیں کہ خود میں آپ سے استفادہ کروں اور اگر میں تندرست ہوتا اور قریب ہوتا تو میں خود آپ کے پاس آتا"۔ اس سے مرشد ومسترشد کے درمیان ربطِ باہمی وعلاقہ خصوصی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس قدر تھا۔

اجازت وخلافت

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے شاید صرف ایک مرتبہ خانقاہ وصی اللٰہی میں دیکھا تھا اور وہ ان کے زہد وتقویٰ سے متاثر ہوئے تھے، لیکن اس کے بعد سے

ملاقات کی کبھی نوبت نہ آئی تھی، تقریباً تیرہ سال تک دونوں کے درمیان خط وکتابت کے ذریعہ افادہ واستفادہ ارشاد واسترشاد کا سلسلہ قائم رہا اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکاتبت ہی کے ذریعہ مدارجِ تصوف وسلوک کو طے کرتے اور اوہام وشکوک کا ازالہ فرماتے رہے، یہاں تک کہ اجازت وخلافت سے بھی سرفراز کئے گئے مگر ملاقات اس درمیان کبھی نہ ہوئی، یہ حسنِ نیت اور صدقِ طلب کے ساتھ ساتھ خداوند تعالیٰ کو حاضر وناظر سمجھتے ہوئے اطلاع حالات واتباع ہدایات میں دیانت کا نتیجہ تھا؛ چنانچہ ہم لوگوں سے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "شیخِ کامل کے سامنے اپنا کچا چٹھا سب پیش کر دینا اور پھر وہ جو تجویز کر دے اس پر اہتمام سے عمل درآمد کرنا چاہئے"۔ بعض خطوط کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حالات کی اطلاع بڑے اہتمام سے کرتے تھے جن اشغال واحوال سے وہ مطمئن ومسرور ہوتے ان کی بھی اطلاع کرتے کہ تصویب ہو جائے اور جن کو وہ غلط سمجھتے اور ان سے اجتناب کرتے ان کی بھی اطلاع دیتے کہ تحقیق ہو جائے اور جن چیزوں کو وہ غلط اور بُرا سمجھتے اور ان کے اندر پائی جاتیں اس کی بھی اطلاع کرتے کہ مرض کی تشخیص اور طریق ازالہ تجویز ہو جائے، پھر جو حکم وہاں سے آجاتا اس پر پورے وثوق واعتماد کے ساتھ عمل فرماتے تھے اس لئے کہ ان کا شیخ نرا زاہد نہ تھا بلکہ اس کے ایک ہاتھ میں اگر "سندانِ عشق" تھا تو دوسرے ہاتھ میں "جامِ شریعت" بھی تھا، اور ایسے ہی شیخ کے بارے میں شیخِ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ ہے کہ اس کے سامنے "چون وچرا" کرنے والے مرید کو "صحرا" بھیج دیا جانا چاہئے۔

حضرت مفتی نثار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

یہ کاملین کا معمول ودستور ہے کہ وہ کبھی اپنے کو کامل نہیں سمجھتے ہیں، اسی لئے سب سے زیادہ انہی کو اس بات کی فکر رہتی ہے کہ وہ بے رہبر رَہروی کے خبط میں مبتلا ہو کر ہلاک نہ ہو جائیں، اکابر علماء دیوبند کی زندگیوں میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ باوجود بلند مقام پر متمکن ہونے اور بجائے خود صاحبِ نسبت اور شیخِ طریقت ہونے کے اس کا التزام فرمایا کرتے تھے کہ خود ان کا بھی کوئی بڑا ہو، اور وہ ان کی رہبری وسرپرستی میں قربِ

خداوندی کا راستہ طے کرتے رہیں، اشتباہ والتباس کی نازک صورتوں میں اُن کے نورِ باطنی سے مدد حاصل کرتے رہیں حتیٰ کہ ضرورت کے وقت اپنے ہی شاگرد کو شیخ تسلیم کرنے اور اس سے باطنی معاملات میں صلاح ومشورہ لینے تک کی مثالیں ہمارے اکابر میں موجود ہیں، اس لئے کہ جو چیز جہاں ملتی ہے وہیں سے لی جاسکتی ہے، جیسا کہ بیہقیٔ زمانہ مفسر قرآن عارف باللہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ کا ارشادِ گرامی ہے:

''نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را در خدمتِ درویشاں باید جست''

اور جیسا کہ عارف رومی نے فرمایا ہے:

بے عنایات حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی یکے بعد دیگرے جب بھی اپنے کسی شیخ کا سایہ سر سے اٹھتا گیا بلا تاخیر کسی اور بزرگ کا انتخاب فرماتے اور ان کی جانب امورِ دینیہ وذاتیہ میں رجوع ہوتے رہے، چنانچہ جب ۱۴۰۰ھ میں حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تو آپ نے اپنے آپ کو انہی کے چھوٹے بھائی اور مجاز بیعت اور مدرسہ وصیۃ العلوم پرنامبٹ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی نثار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد فرمایا، اور ہر اہم معاملے میں ان کی جانب رجوع فرماتے رہے پھر جب ۱۴۰۸ھ میں حضرت شیخ الحدیث کا بھی انتقال ہوگیا تو پھر مجھے کسی طرح یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کس سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا تعلق اصلاحی ورشتۂ روحانی قائم فرمایا تھا؟ مگر بعض قرائن سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیرزادے حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پرنابٹی دامت برکاتہم کی جانب رجوع فرمالیا تھا۔

نکاح اور ازدواجی زندگی

آپ کا رشتۂ ازدواج حیدرآباد کے ایک خوشحال اور معزز گھرانے میں جناب غوث محی الدین صاحب فاروقی، سابق ناظم تعلیمات حکومتِ آندھرا پردیش کی صاحبزادی سے

طئے پایا، اور ۱۳۸۵ھ میں بمقام جامع مسجد ملے پلی نکاح ہوا، خطبۂ نکاح حافظ حسن احمد صاحب علوی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا، اس وقت آپ کی عمر سنہ عیسوی کے مطابق (۲۸) سال تھی۔

پیغام نکاح کے سلسلہ میں آپ کے خسر محترم نے ایک عجیب ودلچسپ اور سبق آموز واقعہ بہت آبدیدہ ہوکر آج سے چند برس قبل خود راقم السطور کو سنایا تھا کہ:

''وہ آفس جس راہ سے جایا آیا کرتے تھے اس راستہ میں کسی بس اسٹاپ پر ایک مسلمان غریب ــــــ جو فٹ پاتھ پر کچھ کاروبار چھوٹا موٹا کیا کرتا تھا ــــــ روزانہ نظر آتا تھا، ایک دن انھوں نے دیکھا کہ وہ غریب بغیر ساز وسامان کے بیٹھا ہوا ہے اور متفکر ہے، انھوں نے پوچھا کہ میاں آج کاروبار نہیں کر رہے ہو؟ اس نے دکھی انداز میں اپنی معاشی حالت سنائی اور کہا کہ اس مرتبہ سامان نہیں خرید سکا کیوں کہ سارا پیسہ گھر کی کسی اچانک ضرورت میں صرف ہوگیا، اسلئے اب مجبور اور بے روزگار ہوگیا ہوں، اس نے کہا کہ اگر مجھے سو روپیے مل جائیں تو میں پھر سے کاروبار کا آغاز کرسکتا ہوں اور ہر مہینے کچھ رقم قرض میں واپس بھی کرسکتا ہوں، یہ سن کر انھوں نے اسے بلا تامل سو روپیہ دے دیئے۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں سو روپیہ کی بڑی قدر تھی، یوں جھٹ سے کسی اجنبی کے تقاضے پر دئے نہیں جاسکتے تھے مگر موصوف پر اس وقت ترحم کا ایسا غلبہ ہوا کہ بلا تأمل یہ ایثار کردیا، اس شخص نے وہ رقم اپنے بھائی کو دے کر بمبئی بھیج دیا کہ سامان خرید کر لائے، بھائی رقم لے کر بمبئی جو گیا تو پھر لوٹا ہی نہیں۔ اس اثناء میں آپ کے خسر صاحب کا تبادلہ محبوب نگر ہوگیا تھا، ادھر گھر والوں کو چونکہ اس کا علم ہوگیا تھا اس لئے وہ لوگ وقتاً فوقتاً اس شخص سے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگے، مگر چونکہ وہ بالکل عاجز اور بے بس تھا اس لئے ایک دن اس نے آپ کے خسر صاحب کو خط لکھا کہ میں بالکل بے بس ہوں اور اس موقف میں نہیں ہوں کہ آپ کا قرض ادا کردوں، اس لئے اگر آپ مجھے معاف کردیتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں اپنی آبرو کی حفاظت کیلئے خودکشی کا آخری اقدام کر بیٹھنے پر مجبور ہوں؛ آپ کے خسر صاحب کو اس کے اس خط نے حد درجہ متاثر

کیا اور انھوں نے فوراً اپنے گھر ایک خط لکھا کہ فلاں صاحب کے پیسے مجھے وصول ہو چکے ہیں آپ لوگوں کے مطالبہ کی ضرورت نہیں ہے، ان کا کہنا ہے کہ اِدھر میں یہ خط پوسٹ کر کے گھر آیا اُدھر ڈاکیہ گھر سے آیا ہوا ایک خط لا کر دیا، جس میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیغام کی اطلاع تھی، میں نے اسے ایک غریب بندۂ خدا پر مہربانی کا نقد صلہ سمجھتے ہوئے بلا تاخیر قبول کر لیا، میں ہمیشہ اس سعادتمند اور اللہ والے داماد پر فخر ہی کرتا رہا ہوں، جب بھی انہیں دیکھتا ہوں ایک مخلصانہ نیکی کا نقد صلہ معلوم ہوتے ہیں۔

مجاہدہ کا زمانہ

مسلمانوں کے عام ماحول میں کسی کا اچانک دینداری اور اس میں بھی نہایت سختی وپختگی کا اختیار کر لینا اپنی قوم اور خاندان کو ایک زبردست مقابلہ کی دعوت دینے کے مترادف ہمیشہ سے رہا ہے، خصوصاً دکن کی سرزمین میں یہ وبا بہت عام ہے، لوگ نہ خود کچھ کرتے ہیں اور نہ اوروں کو کچھ کرنے دیتے ہیں، اگر کوئی بے دینی کے ساتھ کتنی ہی پریشانیوں میں مبتلا ہو تو کسی کو اس پر رحم نہیں آتا لیکن اگر وہ دینداری اختیار کرنے لگتا ہے تو اپنوں پرایوں سب کو اس پر ترس آنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی کا کیا ہوگا؟ کھائے گا کہاں سے؟ مستقبل تاریک ہو جائے گا اور کہنے لگتے ہیں کہ ارے اس دنیا میں اس طرح جینا مشکل ہے وہ پہلے لوگ تھے جو پہلے زمانہ ہی کے ساتھ چلے گئے، ذرا نیچے سے نظر اٹھا کے تو دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی، وغیرہ وغیرہ، اسی طرح اگر کوئی شخص خالص دنیاداری کو اختیار کر لے اور نماز روزہ سے ایسا ہی غافل ہو جائے جیسا کہ کوئی لامذہب رہتا ہے تو اس کو ٹوکنے اور روکنے والا تو نظر نہیں آتا لیکن کوئی شخص ذرا دین کی طرف راغب ہو جائے اور کچھ سنتوں کو اختیار کرنے لگے تو ناصحین واعظین کی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے کہ میاں اسلام میں دین بھی ہے دُنیا بھی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تو نہیں کہا کہ صرف اللہ اللہ کرتے رہو وغیرہ؛ اس قسم کے واقعات آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں اور اس پُر خار وادی سے ہر وہ شخص آج بھی گذرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دینداری کی توفیق عطا فرمائی ہو، یہ کیفیت آج سے ۳۵۔۴۰ سال

قبل کے حیدرآباد میں بہت ہی زیادہ تھی؛ اب ماشاء اللہ بہت کچھ خوش آئند تبدیلیاں آئی ہیں اور دین کی لائن پر آنے والے کی اگر چند آدمی کسر ہمت کرتے ہوں تو کچھ لوگ ہمت افزائی کرنے والے بھی مل جاتے ہیں۔

حضرت شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ایسی ہی کچھ صورتحال کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ بہت دور کیوں جایئے خود ان کے والد صاحب ــــ جو اگرچہ کہ بعد میں ان کے بڑے معتقد ہو گئے تھے ــــ یہی کہتے رہتے تھے کہ "نماز پڑھ لو، روزہ رکھ لو، اتنی دین داری ٹھیک ہے لیکن یہ کیا تشدد و سختی ہے کہ صورت شکل، وضع قطع بود و باش ہر چیز میں سنت سنت؟ اگر یہی حال رہا تو پاگل ہو جاؤ گے" کبھی اپنے دوستوں کے سامنے اس طرح کہتے تھے کہ "اگر یہ اپنی حالت نہیں بدلتا ہے تو یا تو پاگل ہو جائے گا یا پھر ولی اللہ ہو جائے گا" حالانکہ یہ حال انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جنھیں قلمِ تقدیر ولی اللہ لکھ چکا ہوتا ہے۔

پردہ کے سلسلہ میں بھی آپ کو بہت کچھ سننا پڑا، حتیٰ کہ اسی قسم کے بعض اُمور نے انھیں اپنے گھر سے محض بدن کے کپڑوں کے ساتھ نکل جانے پر مجبور کر دیا، جہاں تک راقم السطور کو علم ہے یہ گھر سے ان کا نکل جانا کسی مالی و مادی مصالح یا اختلافاتِ باہمی کی بناء پر نہیں بلکہ دین داری اور اس پر ثابت قدمی کے لئے ایک ناگزیر اقدام تھا جو انھیں کرنا پڑا؛ بہر حال وہ ان تمام حالات و معاملات کا مکمل عزم و استقلال کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، اور کوہِ صبر و استقامت بن کر کسی لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتے اور ترقی کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ موافق و مخالف تمام لوگوں کے حقوقِ شرعیہ ادا کرنے کا غایت درجہ اہتمام فرماتے رہے، اس طرح اس ترکِ تعلق کا نفسانی اغراض سے مامون و محفوظ رہنا اور بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

کسبِ معاش

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب ہردوئی سے واپس ہوئے تو اپنے روزگار کے بارے میں سوچنا شروع کیا، بالآخر آپ نے یہ طے فرمایا کہ اپنے والد صاحب ہی کی دکان پر اسی

پیشہ سے منسلک ہوجائیں؛ ہردوئی جانے سے قبل بھی آپ والد کی دکان پر کام کرنے لگے تھے؛ لیکن حق تعالیٰ شانہ کو آپ کا ان کاموں میں مصروف ہونا منظور نہ تھا اس لئے سال دو سال ہی کے اندر آپ نے ان کاروبار سے علاحدگی اختیار فرمالی، بظاہر یہ صورتحال پیش آئی کہ مولانا عبدالرؤوف صاحب قاسمی سیتاپوری ـــــ جو اس زمانہ میں مدرسۂ فیض العلوم میں استاذِ حفظ کی حیثیت سے کام کرتے تھے، ـــــ کی ان سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے باتاکید و باصرار مشورہ دیا کہ وہ ان کاموں کو چھوڑ کر خدمتِ دینِ مبین کا ارادہ کرلیں، کیونکہ آدمی کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ قرآن مجید اور اس کے طالبین کی خدمت میں لگنے کا موقع حاصل ہو، خود حدیث میں "خیر کم من تعلم القرآن وعلمه" فرمایا گیا ہے۔

مدرسہ فیض العلوم میں

چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا پختہ ارادہ فرمالیا اور مدرسہ فیض العلوم میں درخواست داخل فرمائی کہ میرا ارادہ دینی خدمت کا ہے اس لئے مجھے اسکا موقع دیا جائے خواہ کسی خدمت پر لگایا جائے مجھے قبول ہے؛ چنانچہ یکم صفر ۱۳۸۹ھ سے آپ کا باضابطہ تقرر مدرسہ فیض العلوم میں ہوگیا، اس وقت سے شہادت تک مسلسل بلاانقطاع اسی مدرسہ میں پورے ثبات واستقلال کے ساتھ کام کرتے رہے، جو کام آپ کے سپرد کیا جاتا بہ حُسن وخوبی اسے انجام دیتے رہے، اس طویل زمانے میں کتنے لوگ آئے اور گئے اور کتنے حالات وانتظامات بدلے حتیٰ کہ انتظامیہ کی تبدیلیاں مختصر مختصر وقفے سے ہوتی رہیں، لیکن آپ تھے کہ ان تمام اُمور سے بے تعلق اور اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھے، کسی معاملہ کا ان پر کوئی اثر نہیں اور کسی تبدیلی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی جو ذمہ دار بنتا اس کی اطاعت فرماتے اور جو بات نامناسب یا خلاف مذاق ومزاج سامنے آتی اس سے حسنِ تدبیر اور کمالِ سلیقہ سے اپنے آپ کو بچالیا کرتے تھے؛ اوقات کا انضباط، محنت ومستعدی اور کارِ مفوضہ کی بہتر تکمیل میں آپ نے مدرسے کی تاریخ میں نادر مثال قائم کردی۔

طرزِ تدریس وتربیت

ان کا طرزِ تعلیم وتربیت منفرد تھا، وہ بچوں کی نفسیات کے بڑے ماہر تھے، عمروں اور مزاجوں کے اختلاف پر نظر رکھتے ہوئے ہر ایک کے ساتھ جُداگانہ معاملہ فرماتے تھے، بچوں پر سختی کے بالکل قائل نہ تھے حتی الامکان صبر وتحمل کو ترجیح دیتے تھے، تادیبِ ضربی یا تو ان کے ہاں تھی ہی نہیں یا اگر تھی تو ناقابل تذکرہ، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بچوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتے ہوں، نہیں بلکہ وہ انکی سخت نگرانی رکھتے تھے، ضابطہ قاعدہ کے معاملہ میں بچوں پر کڑی نظر رکھتے اور بروقت احتساب فرماتے تھے، اس لئے بالغ اور سمجھدار طلباء ان کے شفقتوں کا اعتراف اور ان سے محبت رکھنے کے باوصف ان سے گھبراتے تھے؛ بلکہ ان اساتذہ کو بھی جو ان کے شاگرد رہ چکے تھے ان سے ملاقات کے وقت دل میں اس کا کھٹکا ضرور رہتا تھا کہ کسی وقت کی بے اصولی کو یاد رکھ کر اس وقت کہیں پوچھ نہ لیں؛ بعض مرتبہ لوگ ان پر براہِ راست اعتراض بھی کر دیا کرتے تھے ایسے مواقع پر وہ بڑے حلم وتحمل کا مظاہرہ فرماتے تھے اور مُسکراتے ہوئے سن لیتے تھے، ایک دفعہ ایک طالب علم نے کہا ''پہلے اپنے بچے کو سکھایئے''، لیکن انھوں نے اس پر کچھ خفگی کا اظہار نہ فرمایا، وہ بڑے شفیق مربی اور کریم استاذ تھے اور طلباء کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، طلباء بھی —— نگرانی وگرفت سے طبعی وعمومی گھبراہٹ سے صرفِ نظر —— ان کا بہت ہی اکرام کرتے تھے اور ان سے محبت رکھتے تھے۔

طرزِ ملازمت

اور یہی نہیں کہ وہ دوسروں ہی کی دیکھ بھال اور غیروں ہی میں تجسس فرماتے ہوں بلکہ خود احتسابی اور اپنے آپ کی نگرانی کے بھی بڑے ماہر تھے، شرعی اصول کے تو وہ سختی سے پابند تھے ہی مدرسہ کے انتظامی قواعد وضوابط کا بھی بہت اہتمام فرماتے تھے، اس طرح وہ اپنے معمولات کے بھی سختی سے پابند تھے، چند ناگہانی مواقع کو چھوڑ کر عموماً خلافِ معمول کیلئے کبھی تیار نہ ہوتے تھے، راقم السطور نے ایک موقع پر قدیم رجسٹرات حاضری مدرسین

میں ان کی رخصتوں اور دیر حاضریوں کا تجزیہ کیا تھا جہاں تک حافظہ ساتھ دے رہا ہے ——— واللہ اعلم ——— کئی کئی برس میں ایک آدھ یوم کی چھٹی نظر آئی اور دیر حاضری تو شاید ہی کہیں تھی، ادھر آخری برسوں میں جبکہ ضعف واضمحلال کی روز افزونی اور مختلف افکار کی وجہ سے انکی صحت مسلسل گر رہی تھی تو گوکہ ان کے اس غیر معمولی اہتمام معمولات پر غیر اختیاری اثر پڑا لیکن پھر بھی وہ چھٹی لینے سے قبل کافی غور وخوض کرتے تھے، ایسی ضرورت کے وقت پہلے مدرسہ حاضر ہوجاتے پھر دوسرے اساتذہ کی موجودگی اور ضرورتِ کار کا اندازہ کرکے چھٹی حاصل کرتے تھے، چنانچہ بارہا فرمایا کہ آج چھٹی لینے کا ارادہ تھا مگر فلاں فلاں اساتذہ نے بھی چھٹی لے لی ہے اس لئے درجہ میں بیٹھ گیا۔ حالانکہ وہ اصولاً محض استاذ تھے اور ان انتظامات کی ذمہ داری کسی بھی نوعیت سے ان پر نہ تھی مگر وہ نوکری برائے نوکری وآمدنی کے سطحی نظریہ سے ——— جیسا کہ ناظرین معاف فرمائیں اور کہنے دیں کہ اس زمانہ میں عموماً خدام دین اور کارکنانِ ادارہ جات میں پایا جارہا ہے ——— بری وعاری اور جذبہ خدمت اور احساسِ تعلیم وتربیت کے حامی تھے، اس لئے کارِ مفوضہ کو امانت سمجھ کر حتی الامکان اس میں کوتاہی سے اجتناب فرماتے تھے، ایک ایسے ادارے میں جہاں استحقاق رخصت کی حیثیت محض رعایت کی ہو اور ان کے عدم استعمال پر کوئی معاوضہ بھی نہ ملتا ہو، رخصتوں کے معاملے میں اس قدر احتیاط اور اوقات کا انضباط سوائے احساس فرائض، پاس امانت اور خوف مقام رب" کے کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں ہے، وہ ترانہ سے پانچ منٹ قبل مدرسہ حاضر ہوتے اور پورے وقت کار کو نہایت مستعدی، بیدار مغزی سے کار مفوضہ میں صرف فرماتے اور یہی نہیں کہ وقت پر آتے بلکہ بروقت تشریف بھی لے جاتے، ادھر گھنٹی ہوئی اور چند ہی لمحات میں دیکھ لیجئے کہ وہ ہاتھ میں سیکل لئے گیٹ سے نکل رہے ہیں اس لئے کہ لگے بندھے معمولات میں وقت ضائع کرنے کا موقعہ ہی نہ تھا، اوقاتِ مدرسہ میں کوئی ان سے نجی گفتگو کرتا تو پہلے تو روک دیتے لیکن کبھی ضروری سمجھا تو نہایت ہی مختصر وقت میں اس سے نمٹ لیتے پھر اس وقت کو نوٹ کرکے اس کے معاوضہ کو تنخواہ سے وضع کروایا کرتے تھے۔

امامت کی سعادت

فیض العلوم ہی میں کام کے دوران مدرسہ سے متصل ایک کالونی میں واقع مسجد بی بلاک کے مصلیوں کے اصرار وخواہش پر آپ نے اس مسجد میں امامت شروع فرمائی تھی، امامت کے سلسلہ میں بھی نظم وضبط کا وہی حال تھا جو مدرسہ کے کاموں کے بارہ میں اُوپر مذکور ہوچکا ہے، عام مصلیوں اور مجلس انتظامی سب ہی کو اس بات کا اعتراف ہے کہ برسوں میں ایک آدھ مرتبہ نہ تشریف لائے ہوں تو ممکن ہے، باقی یاد سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ امامت سے کبھی غیر حاضر ہوئے ہوں؛ حتیٰ کہ باوثوق ذرائع سے یہاں تک معلوم ہوا کہ جس دن ان کے والد کا انتقال ہوا تھا اس دن وہ تجہیز وتکفین کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے اور ان کاموں سے فراغت کے بعد نمازِ جنازہ میں کچھ تاخیر تھی تو نماز پڑھانے کے لئے وہاں سے اپنی مسجد تشریف لاکر اور نماز پڑھائی، اس کے بعد جنازے میں واپس گئے؛ جبکہ کوئی چار پانچ کیلومیٹر کا فاصلہ تھا اور سواری سائیکل تھی؛ اور امامت بھی ان کی کہنے کو امامت تھی لیکن انھوں نے مسجد کا بروقت کھولنا، اذان کہنا، صفائی وغیرہ کی نگرانی، ایک عرصہ تک پانی کا نظم کرنا اور پھر بعد نماز مسجد کو مقفل کرنا، سارے امور اپنے ہی ذمہ لے رکھے تھے اور ان سب کاموں کو شروع اور اخیر میں بلا کسی معاوضہ کے اور درمیان میں ناقابلِ ذکر قلیل معاوضہ پر انجام دیتے رہے، اس مسجد سے انھیں غیر معمولی اُنس تھا ابتداء تعمیر سے لے کر شہادت سے ایک سال قبل تک وہ اس مسجد میں امامت فرماتے رہے؛ ان کے بیشتر معمولاتِ مبارکہ اسی میں انجام پاتے تھے، فجر سے اشراق تک اوراد واذکار، قبل وبعد ظہر تلاوتِ کلام پاک، قبل عصر تلاوت اور بعد عصر تا اذانِ عشاء مطالعہ کُتبِ دینیہ، اہم مضامین کا انتخاب اور ضبطِ تحریر، یہ سب کام اسی مسجد کے ایک گوشہ میں انجام پاتے تھے؛ فجر وعصر کے بعد بزرگوں کی کتب سے منتخب مضامین بھی مختصراً سنایا کرتے تھے، اور بعد فجر بالغین کو قرآن مجید کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔

پھر ان چند در چند مصروفیات کے باوجود مسجد کے نظم ونسق، سکون ووقار آدابِ مسجد کے

پاس ولحاظ اور اسکی نگرانی میں کوئی فرق نہ آتا تھا؛ راقم السطور کا ـــــ غلوفی المدح سے اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے ـــــ ذاتی تاثر یہ ہے کہ اسی مسجد میں پہونچ کر کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم "احکم الحاکمین" کی بارگاہ میں ہیں، چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب لوگ نہایت ادب واحترام سے بیٹھے مصروفِ عمل رہتے، بلا کا سناٹا چھایا رہتا جو عموماً آج کل مساجد میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا ہے اور لوگ باہم اشاروں تک سے گریزاں رہتے، وہیں پہنچ کر "کانهم علی رؤوسهم الطيور" کی ایک جھلک نظر آتی تھی؛ کبھی کبھی کوئی نیا آدمی اس ماحول میں اپنی کسی حرکت سے رخنہ پیدا کر دیتا، تو حضرت گردن پھیر کر بس ایک نظر دیکھتے اور پھر پورے ماحول میں سکون ووقار بغیر کسی زبانی تنبیہ وتاکید کے بحال ہو جاتا، یہ عجیب اتفاق ہے کہ جیسی طبیعت انھوں نے علاحدگی پسندی اور مجمع سے بے زاری کی پائی تھی مسجد بھی انھیں ویسے ہی گوشۂ عافیت میں ملی تھی، اب تک[۱] بھی اطراف واکناف کے بہت سے رہنے والوں کو اس جگہ مسجد ہونے کا علم تک نہیں ہے ایک عرصہ تک وہ ٹین پوش رہی اور ابھی کچھ دنوں قبل دومنزلہ پختہ تعمیر سے آراستہ کی گئی ہے۔

بیس سال تک انھوں نے اس مسجد میں صفائی وستھرائی سے لے کر اذان وامامت تک کی خدمات انجام دیں، صالحین ومتدینین کی ایک جماعت ان کے خاموش مواعظ اور "دعوت بالعمل" کے ذریعہ تیار ہوئی، اس کا محل وقوع بھی ان کے مذاق ومزاج کے حسب منشاء تھا مسجد میں "مقاصد مسجد" پر مشتمل ایک پر سرور اور نُور سے بھر پور ماحول بھی انھوں نے طویل عرصہ میں تیار کر لیا تھا، نیز مکان ومدرسہ سے قرب ان کی جسمانی راحت اور طبعی سہولت کا بھی سبب تھا، یہ وہ اُمور تھے جن کی وجہ سے ان کو اس مسجد سے قلبی وروحانی تعلق وانسیت پیدا ہوگئی تھی جو لازمی بھی تھی اور حق بجانب بھی؛ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کہیں اور جائیں مگر جب مصلیوں کی تعداد بڑھی اور ہر فکر اور ہر مزاج کے لوگ آنے لگے تو نئے نئے مسائل کھڑے ہونے لگے اور جس سادگی وخاموشی سے دینی سرگرمیاں قائم تھیں اس کے

---

[۱] اس کے مضمون کے لکھنے کے وقت تک

مقابلہ میں نام ونمود اور شور وہنگامے کے کاموں کا مطالبہ کیا جانے لگا تو آپ کے لئے اپنے مذاق ومزاج کے ساتھ یہاں کی خدمات قائم رکھنا مشکل ہوگیا، انھوں نے ان حالات کے پیش آنے سے بہت قبل ـــــ غالباً اس کے آثار کو محسوس فرما کر ـــــ اپنے پیر ومرشد کو تفصیلی خط لکھا تھا وہ خط تو مجھے نہیں مل سکا مگر اس کے جواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اس مسجد سے اپنے خاص تعلق کا بھی ذکر کیا تھا، حضرت مفتی صاحب نے انھیں جو جواب ارقام فرمایا تھا وہ چونکہ سب خدامِ دین کیلئے مفید ونافع ہے اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے، حضرت مفتی محمود حسن پرنامبیؒ نے لکھا:

"آدمی حق تعالیٰ سے اپنے معاملہ کو صحیح اور صاف رکھے تو پھر کسی سے ڈرنے اور دبکنے کی ضرورت نہیں، قلم تقدیر سب کچھ لکھ کر فارغ ہوگیا ہے، لہذا ایسے موقع پر عارف کو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں، جب تک ماحول سازگار رہے وہاں رہیں، جب حالات ناسازگار معلوم ہوں تو علاحدگی اختیار کرلیں۔

ارض خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست

حق تعالیٰ کو آپ سے کام لینا ہو تو اس کے لئے کوئی خاص مسجد متعین نہیں، کہیں جگہ نہ رہے تو اپنے گھر میں بیٹھ کر جس قدر کام ہوسکے کرتے رہیں۔

بہر حال وہ وقت بھی آیا کہ انھوں نے نئی انتظامیہ کی اصلاح ودرستی سے مایوس ہوکر اس مسجد کی خدمات سے علاحدگی اختیار فرمالی، اس کے بعد وہ مختلف مساجد میں جا جا کر نماز پڑھتے رہے مگر جہاں تک راقم السطور کا خیال ہے انھیں کہیں چین نہیں ملا، یہاں تک کہ وہ رفیقِ اعلیٰ سے جاملے۔

خطابت کا شرف

آپ کے والد صاحب کی دکان ـــــ جس میں کچھ دنوں آپ نے کام کیا تھا ـــــ پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے کہ محلہ سلطان بازار میں تھی اس سے متصل کافی بلندی پر ایک نہایت خوبصورت تعمیر سے آراستہ قدیم مسجد "ہری مسجد" کے نام سے موسوم ہے، ایک عرصہ تک آپ

اس مسجد میں نماز جمعہ پڑھاتے اور اس سے قبل وعظ فرماتے رہے؛ ان مواعظِ حسنہ کے ذریعہ اصلاحِ عقائد واعمال کے سلسلہ میں ایک بڑے طبقے نے آپ سے فائدہ اٹھایا، شروع میں بڑے اہتمام سے اکابر کی کتابوں سے اخذ کر کے مضمون مرتب فرماتے پھر ان مضامین کو اپنے شیخ کے ہاں بھیج کر اس کی صحت کی تنقیح کرواتے اس کے بعد اسی کی روشنی میں وعظ فرماتے تھے، اس طرح مختلف عنوانات پر کوئی ڈھائی سو وعظ خود ان ہی کے قلم سے مرتب اور بزرگوں کے نظر فرمودہ اب بھی موجود ہیں، کاش کے وسائل ہوتے اور ان کی اشاعت وطباعت کر دی جاتی تو بہت سے غیر عالم واعظوں اور خطیبوں کے لئے عظیم سرمایہ ثابت ہوتا۔

کثرتِ مجاہدہ کا اثر صحت جسمانی پر

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی صحت عمدہ اور قویٰ کافی مضبوط تھے، دیکھنے ہی سے خاص قسم کے رعب و وجاہت کا اندازہ ہو جاتا تھا، مگر ایک تو خانگی مسائل کی بہتات دوسرے کثرتِ مجاہدات نے ان کی صحتِ جسمانی پر آخری سالوں میں کافی اثر ڈالا، ساتھ ہی بائیں پیر میں لنگ اور داہنے ہاتھ میں سخت تکلیف نیز انگلیوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے بھی صحت کافی متاثر ہو گئی تھی، اس کے ازالہ کے لئے یونانی علاج فرماتے رہے، ہومیو پیتھک طرز علاج سے بھی استفادہ کیا مگر افاقہ نہ ہوا، ایلو پیتھک ادویہ کے وہ قائل نہ تھے اور اپنی حد تک احتیاط فرمایا کرتے تھے، طب نبوی میں مذکور تدابیر عموماً اختیار فرما لیتے اور دعا والتجا کے ساتھ تسلیم ورضا ان کی طبیعت بن گئی تھی اس لئے جو تدابیر اختیار فرماتے اِن کی جانب زیادہ دھیان واہتمام نہیں تھا۔

ایامِ آخرین

جیسا کہ سلف صالحین کا دستور ہے ساری زندگی اس گھڑی کی تیاری میں کھپا دیتے ہیں جس میں انسان اچانک اس دنیائے فانی سے حیاتِ جاودانی کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے؛ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں چھوٹوں، بڑوں، ہم عمروں سب کا متفقہ تاثر یہ ہے کہ آخرت ہمیشہ ان کے مدنظر رہتی تھی اور وہ ایک ایک لمحے کو بعد الموت کی تیاریوں کیلئے

صرف فرماتے تھے، ضروریاتِ زندگی اور مطالباتِ بشری کی تکمیل میں حتی المقدور تقلیل فرماتے تھے، جو وقت بچتا اس میں ہر وقت اسی فکر و لگن میں رہتے کہ کس طرح ذخیرہ آخرت جمع کیا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں ان کی کیفیت حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان اشعار کی عملی تعبیر تھی ۔

ہم ایسے رہے یا کہ ویسے رہے ۔۔۔ وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دوروزہ کا کیا عیش وغم ۔۔۔ مُسافر رہے جیسے تیسے رہے

اس عمومی مزاج کے باوجود زندگی کے آخری ایام میں اس معاملہ میں مزید فکر واہتمام غالب ہوگیا تھا، اس وقت تو شاید کسی کو اندازہ نہ ہوا ہو لیکن بعد میں سب ہی کو پتہ چل گیا کہ حق تعالیٰ نے اپنے لطف سے انھیں اس کی خبر فرمادی اور اشارہ دے دیا تھا کہ وقتِ موعود قریب آگیا ہے اور ان کی یہ سب ہنگامی تیاریاں اسی وقتِ موعود کی استعداد کی کڑیاں تھیں؛ چنانچہ شہادت سے قبل چند ہی دنوں کے اندر قریبی رشتہ داروں اور احباب خاص سے خصوصی ملاقاتیں فرمائیں اور انھیں حقوق العباد کی ادائیگی ضرورت مند قرابت داروں کی اعانت اور صلۂ رحمی کے سلسلے میں خاص طور سے متوجہ کیا۔

اپنی چھوٹی اور عزیز ترین بہن کے گھر ایک دن تشریف لے گئے اور وہاں خلافِ معمول زیادہ قیام فرمایا، جمعہ کے دن کے علاوہ عموماً کہیں جانے کا معمول نہ تھا اس لئے انھوں نے پوچھا کہ آج تو چھٹی کا دن نہیں پھر کیسے تشریف لے آئے؟ تو فرمایا کہ آج میں تمہاری خاطر سے رخصت لے کر آیا ہوں، گھر کے تمام بچوں اور بڑوں کے ساتھ اطمینان اور دلجمعی سے گفتگو کر کے سب کا جی خوش کردیا؛ بہت سی نصیحتیں فرمائیں اور ایک ایک قرابت دار کا نام لے کر ان کے حقوق کی ادائیگی اور خیر خیریت لیتے رہنے کی تلقین بھی فرمائی؛ اپنے بڑے بھائی مرحوم (جن کے ہاں بوجوہ آمد ورفت کم رکھتے تھے) کے بال بچوں کی نگہداشت اور دیکھ بھال کی بھی ہدایت دی، ان کی بہن نے کہا کہ آپ خود بھی ان کے گھر چلے جائیں تو بچے بہت خوش ہوں گے، اس پر فرمایا کہ اچھا میں بھی جاؤں گا؛ بڑی بہن جو

بیوہ تھیں ان سے ملاقات کر کے انھیں ان کی تنہائی پر پریشان نہ ہونے اور صبر کرتے رہنے کی ہدایت وتاکید فرمائی اور بھانجوں بھانجیوں کے سلسلہ میں نصیحتیں فرمائیں۔

اسی طرح اپنے ایک قدیم دوست اور پیر بھائی جناب حافظ زین العابدین صاحب امام مسجد یک مینار نا مپلی کے گھر تشریف لے گئے ان کے اصرار پر تھوڑی دیر ان کے ہاں آرام بھی فرمایا؛ انھوں نے فرمایا کہ آپ کے مرض کا علاج مجھے کرنا آتا ہے جس کے لئے آپ کو انجکشن لینا ہوگا؛ اس پر فرمایا کہ "اب کچھ کرنا نہیں ہے اب چل چلاؤ کا وقت ہے"۔

انہی دنوں میں سنا ہے کہ ایک طالب علم نے اپنی کسی درخواست کے سلسلے میں کافی اصرار کیا تو فرمایا کہ ٹھیک ہے، جمعرات کے دن اگر میں آؤں گا تو اس پر غور کروں گا یا پھر (درسگاہ کے سامنے والے دالان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہاں میرا جنازہ رکھا ہوگا اور تم لوگ نمازہ جنازہ کی تیاری میں ہوگے۔

انہی دنوں میں راقم الحروف کے بہنوئی جناب محمد علی صاحب کے ذریعہ کفن کا کپڑا منگوایا اور اس کی دو چادریں کرلیں، اور عرصہ قبل اپنے پیرومرشد حضرت مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مستعملہ لباس منگوا کے رکھ لیا تھا، اُسے جوڑ توڑ کر اپنے ناپ کا کفنی کُرتا تیار کرلیا، تین گرہ بند بنا کر یہ سب چیزیں یکجا رکھ لیں۔

ان سب تیاریوں سے ایسا لگتا ہے کہ ان کا دل گواہی دے رہا تھا کہ لقاءِ محبوب کا وقت قریب آ گیا ہے اور جو شخص زندگی بھر خود اعتمادی، استغناء و بے نیازی کا پیکر رہا ہو اور ذاتی مصارف کے سلسلے میں مدت العمر صبر وثبات کے ساتھ اس طرح رہا کیا کہ پرائے تو پرائے اپنوں سے تک کسی ضرورت کا ذکر کرنا اور اُن کا سہارا لینا گوارا نہ کیا ہو اس کی غیرت سے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ مرنے کے بعد کسی کا زیر بار احساں ہوتا۔

مجھ کو جینا ہی نہیں بندۂ احسان ہوکر

شاعر نے تو صرف جینے کی بات کہی تھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح مرنے کو بھی خودداری کے خلاف سمجھا، گو شہادت کی نعمتِ عظمیٰ نے انھیں ایسی زندگی سے نوازا جس کو موت

نہیں ؛ جن لوگوں سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ذرا بے تکلفانہ تعلقات تھے اور وہ آپ کے سامنے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی بھی جرأت کر لیتے تھے ان کا کہنا ہے کہ آخری دنوں میں آپ نے طبعی خموشی وسکوت پسندی سے مستزاد خموشی اختیار فرمالی تھی، بہ ضرورتِ شدیدہ ہی بولتے تھے ورنہ خاموش رہتے تھے گویا فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی اتباع میں اپنے چاہنے والوں کو زندگی بھر کی نصیحتوں کے بعد آخری نصیحت فرمارہے ہوں ؎

بہ طبعم ہیچ مضموں بہ زلب بستن نمی آید
خموشی معنۓ دارد کہ در گفتن نمی آید

یا پھر اپنے معبودِ ازلی اور محبوبِ اصلی کے جمالِ جہاں آراء میں اس قدر غرق اور اس کی صفات وکمالات کے مطالعہ میں اس درجہ منہمک ومصروف ہو گئے ہوں کہ ماسواسے اشتغال وتعلق ناپسند ہونے لگا ہو۔

یہ بھی بعض قریبی لوگوں کا بیان ہے کہ ''حصولِ شہادت'' کا وہ جذبہ وشوق جو نہاں خانۂ دل میں اب تک چھپا ہوا تھا کسی نہ کسی مناسبت سے ان کی زبان سے اب ظاہر ہونے لگا تھا، حتیٰ کہ یوم الشہادت میں بھی —— گھر والوں کا بیان ہے کہ —— اس نعمتِ عظمیٰ کی خواہش وآرزو کا اظہار —— یا خفیہ طور پر ملی ہوئی بشارت کا تذکرہ —— بزرگوں کے واقعاتِ شوقِ شہادت کے پردہ میں چھپا کر ان لوگوں کے سامنے بیان فرمایا تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشق پاک طینت را

شہادت سے سرفرازی

دسمبر ۱۹۹۰ء کے اوائل میں آندھرا پردیش کے سیاسی حلقوں میں کچھ اتھل پتھل شروع ہوئی اور مفاداتِ حاصلہ نے اپنی اغراض کی تحصیل کیلئے عوام کو قربانی کا بکرا بناتے ہوئے پورے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکا دی، خفیہ ذرائع کا کہنا ہے کہ بعض سیاسی حلقے ہر محلہ میں خود ہی ایک مسلمان اور ایک ہندو کو قتل کردیتے تھے، جس کے نتیجے میں دونوں فرقوں کے جذبات میں اشتعال اور جوشِ انتقام پیدا ہوکر پوری فضاء مکدر ہوتی جارہی تھی،

بہر حال ان حالات کے آغاز پر پولس نے کرفیو کا اچانک اعلان کر دیا تھا جس کی وجہ سے جو جہاں تھا وہیں محبوس ہو کر رہ گیا۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان دنوں شہری حدود ہی میں مگر قدیم آبادیوں سے ذرا کنارے ایک کم آباد محلے میں واقع اپنے نو تعمیر شدہ مکان میں مقیم تھے؛ کرفیو کی وجہ سے اپنے اسی گھر میں محبوس ہو گئے، اہلیہ اور بڑے فرزند ساتھ تھے، باقی بچے اپنی ننھیال میں تھے، چند ایک مسلمان جو اس محلہ میں تھے ان سب کی تسلی واطمینان کا ظاہری سامان آپ ہی کی ذات تھی، تمام لوگوں کو لے کر اپنے گھر کی چھت پر باجماعت نمازوں کا اہتمام فرما رہے تھے۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء م ۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ جمعرات کے روز ۴ر بجے دن دو گھنٹے کیلئے ــــ کوئی چھ یوم کے مسلسل کرفیو کے بعد ــــ نرمی دی گئی، سب لوگ ضروریاتِ زندگی اور اشیائے مایحتاج کی فراہمی کے لئے بازاروں میں منتشر ہو گئے، آپ بھی اپنے بچوں کی خبر لینے اور مدرسہ والوں سے ملاقات کر لینے کا ارادہ ظاہر کر کے گھر سے نکلے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوس میں حافظ عبد الصمد صاحب مدرس مدرسۂ فیض العلوم کا مکان تھا ان سے پوچھا کہ آپ بھی چل رہے ہیں؟ ان سے نفی میں جواب پانے کے بعد خود ہی چل دیئے، اور اپنے معمول کا راستہ جس پر ہمیشہ آمد و رفت تھی اِسے چھوڑ کر ــــ نہ جانے کیوں؟ ــــ دوسرا راستہ اختیار فرمایا اور یہ ''نہ جانے'' کے کیا معنیٰ؟ عزم وعزیمت کا پہاڑ ہونے کے باوجود ہر کام میں تدبیر واحتیاط کی سنت پر عمل پیرا رہنے والے اس اللہ والے کے دل میں یہی خیال آیا ہوگا کہ نامساعد حالات میں غیر آباد اور ویران راستہ سے گذرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے آبادی اور چہل پہل کے علاقے سے نکل جانا بہتر ہے، مگر اس کا حل کیا کیا جاسکتا ہے کہ آج کی بستیوں اور آبادیوں میں کچھ انسانوں کے ساتھ بہت کچھ درندے بھی بستے ہیں۔

چنانچہ جب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بستی کے وسط میں پہونچے تو دو عدد روسیاہ ونامہ تباہ جو مسلح ہو کر منتظر کھڑے تھے آپ کو دیکھ کر آگے بڑھے، ایک نے آپ کے دونوں ہاتھ پکڑے دوسرے نے سینہ مبارک کی داہنی جانب پے بہ پے چند وار کئے اور موٹر سائیکل

پر سوار ہو کر راہ فرار اختیار کر لی، مقام حادثہ پر جمع اڑوس پڑوس کی خواتین کا بیان ہے کہ جیسے ہی آپ سائیکل پر سے گرے پوری قوت کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالا اور کھڑے ہو کر نماز کی نیت باندھنے میں کامیاب ہو گئے، رکوع کی کوشش فرمائی مگر تکلیف کی تاب نہ لا کر سجدہ میں گر پڑے اور چند ہی لحات میں ان کی روح مبارک جسد عنصری سے پرواز کر گئی؛ حادثہ کے وقت حاضرین ومشاہدین کے اس بیان کے مطابق —— اگر یہ ایسا ہی ہوا اور ایسا ہونے میں کوئی تعجب بھی نہیں —— آپ کا آخری عمل صلوٰۃ تھا اور روح مبارک کے پرواز ہوتے وقت آپ کا سر "رحمٰن کے قدموں" پر تھا، سبحان اللہ! لاکھوں زندگیاں ایسی موت پر قربان ۔

چیست ازاں خوب تر کہ در ہمہ آفاق کار
دوست رسد نزد دوست یار بہ نزدیک یار

اور ۔

اے دل ہزار نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سوا ایسا زیاں نہیں

یہ کوئی دن کے ڈھائی بجے کا وقت ہوگا، صاحبزادۂ اکبر حافظ سید وصی اللہ سلمہٗ مقام شہادت پر پہونچے اتنے میں پولیس سواری لے آئی اس کے ذریعہ آپ کو دواخانہ عثمانیہ منتقل کیا گیا؛ ڈاکٹر نے نبض دیکھی اور بطور فرضِ منصبی کے آپ کی وفات بلکہ ابدی حیات کی اطلاع دے دی، پولس نے آپ کی جامہ تلاشی لی جب آپ کے جیب سے صرف ایک تسبیح نکلی تو اس نے اسے آنکھوں سے لگایا اور مردہ انسانیت پر ماتم کرتے ہوئے کہا "اس شخص کے قاتل کو کیا ملا ہوگا؟" ۔

بہ لوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

شہر کے تمام حالات سخت ناسازگار اور ناخوشگوار تھے، قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا، آگ وخون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، انتظامیہ باوجود سخت کرفیو نافذ کر دینے کے چوکسی وقابو

میں ناکام ہوتا جارہا تھا، حساس علاقے فوج کے اختیار میں دے دیئے گئے تھے، انھیں حساس علاقوں میں وہ مقامات بھی تھے جہاں آپ کا مدرسہ، مکان اور سُسرال واقع تھے، اسلئے بڑی لے دے اور جدوجہد کے بعد آپ کے رشتہ دار آپ کے جسدِ خاکی کو دواخانہ سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے، ان قانونی مراحل سے گزرتے گزرتے رات کے ۹ربج چکے تھے۔

محبین کی بے تابی

ادھر اس واقعہ کی خبر دیکھتے دیکھتے دور دور تک پھیل گئی تھی، اضلاع سے اس واقعہ کی تصدیق چاہنے والوں کے ٹیلیفون مسلسل آنے لگے تھے؛ حتیٰ کہ اگلے ہی دن شکاگو، لندن، اور سعودی عرب سے تک ان کے رشتہ داروں نے اس خبر کی تصدیق کیلئے فون کئے، لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ دور والوں کو تو چھوڑیئے خود شہر میں بلکہ پڑوس کے محلوں میں لوگ آپ کی نماز جنازہ اور دیدارِ آخریں کے لئے بے چین ومضطرب تھے، کوئی صورت وہاں تک پہونچنے کی نہ تھی خود راقم سطور جو اشرف العلوم اکبر باغ میں مقیم تھا مدرسہ فیض العلوم سے مسلسل ربط رکھنے کے باوجود کوئی صحیح معلومات حاصل نہ کرسکا۔ اللہ اللہ کر کے شب کے ۱۱ر بجے بس اتنی اطلاع مل سکی کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اہل خاندان نے مدرسہ فیض العلوم میں نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت حکومت سے حاصل کرلی ہے تا کہ ان کی روح مبارک کو سکون وآرام ملے اور ان کے رفقاء کار، دوستوں اور عزیز طلباء کرام کو ان پر نماز پڑھنے کا موقع مل سکے؛ مگر میرے پہونچنے کی تو اب بھی کوئی صورت سامنے نہیں تھی، میں نے فون پر اپنے رفیق قدیم وصدیق حمیم حافظ سید حقانی صاحب (اعمیٰ) سے گفتگو کی اور کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تو بظاہر شرکت سے محروم ہی رہوں گا، اس کے بعد بستر پر دراز ہوگیا۔

رات کے کوئی ایک بجے پولیس کی ویان میں راقم سطور کے بہنوئی جناب محمد علی صاحب پہونچے اور انھوں نے اطلاع دی کہ مجھے تجہیز وتکفین کے انتظامات کیلئے چلنا ہے تو فوراً اٹھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ان کے ہمراہ ہوگیا، رات کی تاریکی، سڑکوں پر ہو کا عالم

سوائے فوجی ٹینکروں کے رینگنے کے اور کسی چیز کی آواز نہیں ہے قدم قدم پر چھان بین اور تفتیش کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان واقع خواجہ باغ کالونی پہنچے۔

تجہیز و تکفین

اس قسم کے واقعات گاہے گاہے پیش آتے ہیں، ادھر شہید کی اقسام اور ان کے احکام مفصل اور پیچیدہ ہیں جن کا استحضار ہر وقت مشکل ہے، اسلئے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ آیا آپ رحمۃ اللہ علیہ کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، معلوم ہوا کہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس دار العلوم سبیل السلام[۱] لائن پر ہیں اور اس واقعہ کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں؛ جب انھیں اطلاع دی گئی کہ اطلاع صحیح ہے اور صبح تجہیز و تکفین ہونا ہے تو انہوں نے از خود کہا کہ غسل نہ دیا جائے مفتی محمد عبد المغنی صاحب کی خواہش پر اُنھوں نے فون ہی پر ایک فقہی عبارت سنائی اور ثابت کیا کہ اس صورت میں غسل نہ دیا جائے گا، یوں منجانب اللہ یہ مسئلہ بعافیت و سہولت حل ہو گیا؛ اور قریب دو بجے آپ ہی کے تیار کردہ کفن میں آپ کو کفنایا گیا زخموں اور پوسٹ مارٹم کی وجہ سے خون مسلسل جسم مبارک سے رستا رہا اس لئے بمشکل تمام تکفین سے فارغ ہوئے۔

حاضرین کا مشورہ ہوا کہ تعزیت و تسلیت کے چند کلمات اہل خانہ کے سامنے عرض کئے جائیں، مگر سوال یہ تھا کہ کون کس کی تعزیت کرے ہر شخص اپنی جگہ سوگوار و اشکبار تھا، طے یہ ہوا کہ راقم سطور ہی یہ کام کرے۔ چنانچہ حق مسلم، حق استاذ، حق ولی اللہ، حق مربی جیسے چند در چند حقوق کے مدنظر ہمت کر کے مختصراً مسنون کلماتِ تعزیت پیش کئے؛ یہ بھی عرض کیا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو جس دن سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق اور اسی کی ہستی کی جانب متوجہ ہوئے اس وقت سے آج تک ہر دن ترقی فرماتے رہے اور کسی دن اپنی موت سے غافل اور خدا کی ذات سے بے خبر نہ رہے بالآخر شہادت کی وہ نعمتِ عظمیٰ حاصل فرمائی

۱۔ اور اب ناظم المعہد العالی الاسلامی

جس سے بڑھ کر شاید کوئی نعمت اس دنیا میں حاصل نہیں کی جاسکتی ہے؛ بہر حال ان کی وہ منزل بہ عافیت طے ہوگئی جس کے بعد مقبولین کو نہ کوئی خوف رہتا ہے نہ غم، مگر مسئلہ ہماری آخرت اور دین کی درستگی کا ہے اس لئے ہم ان کی تعلیمات کو سینے سے لگا لینے اور ان کی ہدایات پر کار بند ہو جانے کا آج پختہ ارادہ اور عزم کرلیں کیونکہ ان کی آرزو یہی تھی اور اسی سے ان کی روح پُر فتوح کو سرور ونشاط حاصل ہوگا۔ وغیرہ

اس کے بعد جنازہ ایک ٹرک میں رکھ کر پولیس کی سخت نگرانی میں مدرسہ فیض العلوم لایا گیا اس وقت رات کے ۳ر ساڑھے تین بج رہے ہوں گے، سب لوگ صبح کی نماز کے لئے تیاریوں میں مشغول ہو گئے، نمازِ فجر میں اور اس کے بعد بھی قرب وجوار کے لوگ چوری چھپے مدرسہ پہونچتے رہے؛ ٦ بجے صبح اس درسگاہ کے سامنے جہاں وہ برسہا برس تک معصوم بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم اور اخلاق کی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے، نماز جنازہ ادا کی گئی، ساڑھے چھ بجے پولس کے ذمہ دار حضرات مدرسہ پہنچ گئے اور جب ان کی نگرانی میں جنازہ گیٹ کے باہر لے جایا جارہا تھا سینکڑوں شاگرد متعلقین سوگوار دلوں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ آخری بار انھیں الوداع کہنے کے لئے کھڑے تھے ایک ٹرک ایک ویان اور ایک کار میں جس قدر لوگ قبرستان جاسکتے تھے ساتھ چلے اور تقریباً ساڑھے سات بجے صبح حق تعالیٰ شانہٗ کی اس عظیم امانت کو اس کے حوالہ کر دیا گیا۔

سولہ اٹھارہ گھنٹے آپ کی روح کو پرواز کئے ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود جسم مبارک سے تدفین کے وقت بھی خون زخموں سے مسلسل بہہ رہا تھا اور چہرہ مبارک پر شادابی وشادمانی اس قدر نمایاں تھی کہ ـــــ ہر دیکھنے والا اس کی شہادت دے گا ـــــ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی آپ کی روح پرواز نہیں ہوئی، بس آپ بہت تھک ہار کر تھوڑی دیر ستانے کو لیٹ گئے ہوں، آنکھیں نیم باز اور ہونٹوں پر حسبِ معمول مسکراہٹ تھی۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مزار مبارک

سلطان دائرہ نامی قبرستان میں جو مسجد معراج کرما گوڑہ کے عقب میں واقع ہے آپ کا مزار جنوبی باب الداخلہ سے قریب واقع ہے؛ حق تعالیٰ کی توفیق سے جس طرح تمام اُمور آپ کی حسبِ خواہش مطابقِ سنت ادا کرنے کی کوشش کی گئی اسی طرح قبر مبارک بھی حسبِ ہدایت شریعت غیر پختہ ہی ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کثرت درودِ شریف اور کثرت تلاوت میں اپنی مثال آپ تھے اور وہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ کئی دنوں تک مزار مبارک سے خوشبو پھیلتی رہی؛ حتیٰ کہ تدفین کے دو چار روز بعد جب لوگ قبرستان پہونچے تو تب بھی محسوس کیا کہ خوشبو پھیل رہی ہے، بیسیوں حضرات نے اس کی شہادت دی تھی اور بہت سے لوگ تو مٹی اٹھا کر لے گئے اوروں کو بھی سنگھوایا۔

ایک ثقہ عالم دین صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے بعض لوگوں سے اس خوشبو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سنا تو اسے رد کرتے ہوئے کہہ دیا کہ اِن باتوں کی کوئی حقیقت نہیں، رات میں جب وہ سو گئے تو خواب میں دکھایا گیا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سائیکل پر سوار ان کی طرف آرہے ہیں، جب قریب پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں بوتل ہے جس میں سرخ مٹی ہے اور اسے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے ارشاد فرما رہے ہیں "سونگھیے سونگھیے! آپ تو کہتے ہیں کہ ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں"۔

خیر! حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ اتباعِ سنت و پابندئ شریعت کے جن عبرت آموز واقعات سے بھرپور ہے ان کے ہوتے ہوئے ان واقعات و کرامات کے ذکر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی ان کا مزاج و مذاق اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کو اہمیت دے کر بیان کیا جائے، اس لئے راقم السطور اسی ایک واقعہ پر اس ذکر کو یہ کہتے ہوئے ختم کرتا ہے کہ ناظرین کرام کو اگر ان حالات سے کچھ عبرت و موعظت حاصل ہوئی دل متاثر ہوا اور جذبۂ ایمان و عمل کو جلاء ملی تو ان سطروں کے راقم کے لئے توفیق

عمل وحسنِ خاتمہ کی دعاءفرمائیں کہ اس ساری محنت کا مقصد ہی کسی صاحبِ دل کی دعاؤں کا سبب بننے کی حرص ہے۔

مگر صاحب دلے روزے زرحمت
کند بر حال ایں مسکین دعائے

تحدیث بالنعمۃ

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بھی تھا اوران کی خاص ڈائری میں نوٹ بھی ہے کہ وہ اہتمام سے یہ دُعافرمایا کرتے تھے کہ" یااللہ مجھے صلحاءومخلصین کے ہاتھوں مسنون غسل کفن دفن نصیب فرما" چونکہ یہ تمام امورراقم سطور کے ہاتھوں انجام پائےاِس لئے وہ اسے اپنے حق میں فالِ نیک سمجھتا ہے اورناظرین کرام سے دعاء کی التجا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے صلاح واخلاص کی دولت سے مالامال فرمائیں اورصلحاءومخلصین کی جماعت میں شامل ہونے کے قابل بنادیں۔

احب الصالحین ولست منهم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۳۴۹-۱۴۳۱ھ)

کوئی چار دہے قبل کی بات ہے جب یہ عاجز مدرسہ فیض العلوم کے شعبۂ حفظ میں بالکل ابتدائی تعلیم حاصل کر رہا تھا، مدرسہ میں کسی بزرگ کے تشریف لانے کا چرچا ہوا، پہلے سے غالباً ذمہ داروں کو کوئی اطلاع نہیں تھی، مدرسہ قدیم عمارت —— جواَب تقریباً منہدم ہوگئی ہے —— میں محدود تھا، مسجد کی جگہ پر ابھی ابھی عارضی ٹین شیڈ ڈالا گیا تھا، اسی مسجد کی طرف سب لوگ جارہے تھے، یہ عاجز بھی دیگر بچوں کے ساتھ محض تماشائی بن کر پہونچا، ایک نہایت ہی حسین ووجیہ چہرہ اور بلند قامت شخصیت، سفید شیروانی میں ملبوس، سر پر ایک بڑا سا عمامہ، اس کے اوپر سے سفید چکن کا دوپٹہ لپیٹا ہوا، بڑی سی داڑھی، ہاتھ میں عصا لیے ہوئے مسجد میں موجود تھی، لوگ اطراف جمع تھے، بیان کی خواہش کی گئی تو مختصر سا خطاب ہوا، زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کچھ فرماتے جاتے تھے، سامعین بہت مسرور ومحظوظ نظر آرہے تھے، کبھی کبھی قہقہہ بھی بلند ہوجاتا، تھوڑی ہی دیر میں مجلس برخاست ہوئی اور وہ اپنے رفقاء کے ساتھ واپس چلے گئے۔

یہ تھے امیر ملتِ اسلامیہ حضرت مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ اب یہ یاد نہیں کہ بیان کیا ہوا تھا، کیوں ہوا تھا، البتہ اتنا یاد پڑتا ہے کہ وہ "دار العلوم حیدرآباد" کے قیام کے سلسلہ میں کوشاں تھے، مدرسہ فیض العلوم کی شہرت سن کر یہاں کا نظم ونسق دیکھنے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔

ہم لوگ والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی سخت نگرانی کی وجہ سے فیض العلوم کے حدود سے باہر کبھی نہ

جاسکتے تھے، اچھی خاصی عمر —— ۲۰ سال —— تک بھی میں یا تو عنبر پیٹ میں نانی صاحبہ کا مکان جانتا تھا یا پھر اکبر باغ میں ایک تایازاد بہن کا گھر، اس کے علاوہ اگر کہیں جانا ہوا تھا تو وہ پرانی حویلی میں حکیم حافظ محمود الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مطب تھا جہاں والدہ دوائی کے لیے جاتیں تو بطورِ محرم کے ساتھ لے لیتی تھیں؛ ایک دفعہ حکیم صاحب کے مطب سے واپس ہو رہا تھا کہ راستہ میں سنٹرل جیل کی گیٹ پر پولیس کی گاڑی اور متعدد پولیس والے نظر آئے، یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ اندر سے مولانا عاقل رحمۃ اللہ علیہ اسی رعب و دبدبہ، شان وشوکت اور عالمانہ وجاہت کے ساتھ پولیس والوں کے درمیان نمودار ہوئے اور گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے، یہ مولانا کی دوسری مرتبہ زیارت ہوئی تھی اور دل پر محبت وعظمت کا نقش کر گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا ایمرجنسی کے دوران حکومت کی کسی مخالفت —— جس کا ذکر آگے آئے گا —— کی پاداش میں محروس ہیں اور اہلیہ کی ناسازیِ طبع کی وجہ سے عارضی رہائی پر گھر لے جائے گئے ہیں۔

اس کے بعد جب مجھے دین کی خدمت میں حصہ لینے کا موقع ملا تو پھر ان سے بار بار ملاقات ہوئی، قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور آخری دن تک بھی ملاقات وزیارت کا شرف حاصل رہا، ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ ان کی اہمیت وضرورت اور عظمت ومحبت کا احساس ہوا؛ ان کو اللہ تعالیٰ نے قائدانہ صلاحیت، سرپرستانہ عظمت اور مجاہدانہ حوصلہ وہمت کا پیکر بنایا تھا، وہ خلوص وللّٰہیت کا مجسمہ اور جہدِ مسلسل کا مثالی نمونہ تھے، ان کا قد وقامت بارعب، لباس پروگراموں میں پُرتکلف بقیہ اوقات میں انتہائی سادہ تھا؛ ان کی رفتار مردانہ، گفتار ظریفانہ، بیان ناصحانہ ہوا کرتا تھا؛ فکر ونظر میں پختگی، عقیدہ وعمل میں اتباعِ شریعت کا اہتمام پایا جاتا تھا؛ چھوٹوں پر شفقت تو سبھی کرتے ہیں چھوٹوں کو بڑا بنانا اور بڑا دیکھ کے خوش ہونا ان کا خاص وصف تھا؛ مسلمانوں سے محبت، ان کے مسائل کا ادراک اور تکلیف کا احساس ہر وقت لگا رہتا تھا، اس سلسلہ میں کسی بھی اچھے اقدام میں شرکت وتعاون سے گریز نہ فرماتے تھے، حق کے احقاق میں کسی ملامت گر کی تو کیا حکومتِ وقت کی بھی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے؛

نہایت ملنسار، شفیق اور تمام مسلمانوں کے ہمدرد و خیر خواہ تھے، الغرض! نہایت ہی اچھی صفات کے حامل اور سلفِ صالحین کی یادگار تھے۔

۱۳۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۳۱ھ میں وصال فرمایا، ۸۲ سال کی لمبی عمر پائی اور خوب کام کیا۔ تین ہی سال کی عمر میں والدہ محترمہ کی شفقتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے تھے، والد بزرگوار —— جو خود عالم وفاضل، شیخِ طریقت اور معروف و مشہور واعظ تھے —— نے تربیت کی اور بہت عمدہ تربیت کی، اس زمانہ میں حیدرآباد مسلم مملکت ہونے کی وجہ سے اسکول کی تعلیم پر بھی اسلامی رنگ غالب تھا، مولانا نے اپنے والد کے زیر سایہ پرائمری سے لے کر ہائی اسکول، پھر جونیر کالج تک مرحلہ وار تعلیم حاصل کی، ساتھ ہی ساتھ اپنے والد سے درسِ نظامی کی کتب بھی پڑھتے رہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات سے بی اے بھی کیا، پھر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے ایم اے کیا اور پوری ریاست میں فرسٹ آئے، شوق علم نے پیچھا نہ چھوڑا تو پی ایچ ڈی میں داخلہ لے کر علامہ فخر الدین رازی کی ”کتاب الامامت“ پر تحقیقی مقالہ تیار کیا، لیکن بعض خانگی اعذار کی وجہ سے اسے داخل کر کے سند حاصل نہ کر سکے۔

اسکول اور کالج کے علاوہ اپنے والدِ بزرگوار سے درسیات کی کتب باقاعدہ پڑھتے تھے، ان کے والد درسِ نظامی کی تعلیم تو خود دیتے تھے اور امتحان ریاست کی معروف جامعہ ”جامعہ نظامیہ“ سے دلواتے رہتے، چنانچہ مولانا نے عصری تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ساتھ جامعہ نظامیہ سے مولوی منشی اور منشی کامل کی سندیں درجہ اول میں کامیابی کے ساتھ حاصل کر لی تھیں؛ تعلیم کے اختتام پر والدِ محترم نے آپ کا نکاح کیا، اِدھر اخلاقی وروحانی تربیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ان کے اخلاق واحوال، اعمال واشغال سے مطمئن ہونے کے بعد والد محترم نے انہیں سلسلۂ قادریہ میں بیعت وتربیت کی اجازت عطا کی، اور خلافت سے سرفراز کیے گئے —— ان کے والد بزرگوار مدینہ منورہ کی عظیم روحانی شخصیت شیخ عبدالقادر شبلی طرابلسی سے اجازت رکھتے تھے ——

مولانا نے عنفوانِ شباب یعنی کھڑی جوانی ہی سے وعظ ونصیحت، اصلاح وتربیت اور دین کی دعوت کا کام شروع کردیا تھا، مگر ۱۳۷۷ھ میں اپنے مایۂ ناز وفخر دکن والد بزرگوار کے سانحۂ ارتحال پر باقاعدہ ان کے جانشین تسلیم کرکے ان کی تمام علمی وروحانی خدمات پر فائز کردیے گئے، اس وقت سے تادم واپسیں پورے استقلال اور کمال اشتغال کے ساتھ خدماتِ دینیہ میں مصروف رہے، جیسے جیسے وقت گذرتا گیا انہیں علاقہ سے آگے بڑھ کر ملکی سطح پر جانا پہچانا جانے لگا اور بڑی بڑی تنظیموں نے ان کی شمولیت کو باعثِ فخر واعتبار سمجھا؛ اخیر زمانہ میں تو ان کا دیوان خانہ ملت کے ہر دکھ درد پر غور وفکر کا مرکز بنا ہوا تھا، تمام اہلِ حق علماء جب بھی کوئی اہم بات پیش آتی مولانا کے دیوان خانے میں جمع ہوجاتے، اور مولانا جب اپنی پیرانہ سالی اور ضعف وناتوانی کے باوجود کمرہ سے اٹھ کر ہال میں تشریف لے آتے تو تمام حاضرین خوشی ومسرت سے جھوم جاتے اور سر پر ان کا سایہ دیکھ کے اطمینان کا سانس لیتے تھے۔

وہ "ملتِ اسلامیہ آندھرا پردیش" کے امیر، دار العلوم حیدرآباد کے مہتمم، جامع مسجد دار الشفاء کے خطیب، "انجمن اسلامیہ" کے صدر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکنِ تاسیسی، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن شوریٰ، دینی مدارس بورڈ اے پی کے صدر، متعدد دینی مدارس کے سرپرست اور مختلف سماجی، اصلاحی اور ملی تنظیموں کے روحِ رواں تھے؛ لیکن ان کی سب سے نمایاں اور ممتاز خصوصیت ان کی دعوت وتبلیغ ہے، سرزمین دکن —— بالخصوص تلنگانہ، مرہٹواڑہ، اور حیدرآباد کرناٹک —— کا شاید ہی کوئی علاقہ ہو جہاں مولانا کے قدم دعوت وتبلیغ کے لیے نہ پڑے ہوں، جس زمانہ میں سفر سخت دشوار گذار عمل تھا، راستے کچے، سڑکیں بوسیدہ، سواریاں خستہ ہوا کرتی تھیں؛ تب بھی مولانا کی ڈائری میں سال کا کوئی دن پروگراموں سے خالی نہیں ہوتا تھا: مدارس ومکاتب کا افتتاح ہو یا مساجد کا سنگِ بنیاد یا عملی آغاز کا معاملہ ہو یا اصلاحِ معاشرہ کا جلسہ، ختمِ قرآن کے جلسے ہوں یا ملی وفلاحی مسائل کی نشستیں مولانا کا نام پروگرام کی زینت بنا ہوا ہوتا تھا، علاقہ کے مخصوص ماحول کی وجہ سے

جب اچھے اچھے علماء بھی بدعات ورسوم کے خلاف بولنے میں مصلحت اور ابہام واشارہ پر اکتفاء کرتے تھے تب بھی مولانا بلاخوف لامۃِ لائم بغیر کسی ابہام کے رسوم کا نام لے لے کر اس کی مذمت کرتے اور دوٹوک انداز میں عقائدِ حقہ کی دعوت دیتے تھے، کتنے ہی مسلمان ہیں جنہوں نے ان کے درد انگیز مواعظ سے متأثر ہوکر بدعات وخرافات سے توبہ کی، اور کتنی ہی عورتوں نے ان کی بے لاگ توجہ دہانی سے حیاء کی خوبصورت چادریں اوڑھیں، کتنے ہی نوجوانوں نے ان کے غیرت دلانے سے گھوڑے جوڑے کی لعنت سے نجات پائی، کتنوں نے ان کے وعظ سے متأثر ہوکر اپنے بچوں کو حافظِ قرآن وعالمِ دین بنایا، کتنوں نے چہروں پر داڑھیاں رکھیں، اوراس سے بھی آگے بڑھ کر کتنے ہی بے ایمان ہیں جنہوں نے ان کے دستِ حق پرست پر توبہ کرکے ایمان کی بیعت کی۔

مولانا کا دوسرا عظیم کارنامہ حیدرآباد میں روافض کو زیادہ سر اٹھانے کی ہمت نہ ہونے دینا ہے، وہ جس مسجد کے خطیب تھے وہ مسجد شیعوں کے اہم مرکز اوران کی گھنی آبادی کے بیچوں بیچ تھی، کوئی نصف صدی تک مولانا اس میں خطاب کرتے رہے، اورڈنکے کی چوٹ پر اہلِ سنت کے عقائد کا پرچار، صحابہ کرامؓ اور خلفاءِ راشدین کی عظمتوں کا اشتہار فرماتے رہے، خاص طور سے دسویں محرم کو جس میدان میں روافض کے مرکزی جلوس تعزیہ کی تیاریاں اور اہتمام ہوتا اسی میدان میں ہزاروں سنیوں کی موجودگی میں مولانا کا جلسۂ عظمتِ صحابہ منعقد ہوتا تھا؛ ان کی ہر گستاخی کا جواب فوری طور پر مولانا کی طرف سے جاری ہوجاتا، شہر میں کبھی کسی شیعہ کی طرف سے کوئی زیادتی ہوتی مولانا فوراً اس کے مقابلہ پرڈٹ جاتے، افسوس! کہ اس میدان میں مولانا کا کوئی ایسا جانشین نہ ہوسکا، ان کی عمر کی درازی اور صحت کی گراوٹ کے ساتھ ساتھ ان دشمنانِ صحابہ کرامؓ کے حوصلے بلند ہوتے چلے گئے اوراب تو بظاہر ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے صاحبزادے کی خطابت کو بالخصوص اس مسئلہ میں ان کا نعم البدل بنادے۔ آمین

اسی طرح مولانا کی علمی یادگار اور صدقۂ جاریہ ''دارالعلوم حیدرآباد'' ہے، اپنی اہمیت،

نافعیت اور پختگی نصاب و مسلک کے اعتبار سے یہ مدرسہ ریاست کی عظیم جامعہ ہے، سینکڑوں طلبہ حافظِ قرآن اور عالمِ دین بن چکے ہیں، تخصصات کے شعبے بھی قائم ہیں، دارالافتاء بھی موجود ہے، ریاست و بیرونِ ریاست کے جید و قابل علماءِ کرام کی خدمات حاصل کی گئی ہیں، اس کے فارغین کے ذریعہ متعدد مدارس و مکاتب ریاست میں قائم ہو چکے ہیں؛ اس نے بے شمار خطیب، ائمہ، مصنّفین و دعاۃ کا ثمرہ امت کو دیا ہے اور دیتا جا رہا ہے، یہ ان کے لیے اتنا بڑا صدقۂ جاریہ ہے کہ کوئی اور صدقہ نہ ہوتا تو بھی ان شاء اللہ یہی کافی تھا، چہ جائیکہ بیشمار صدقاتِ جاریہ انہوں نے بفضلہٖ تعالیٰ اپنی زندگی میں بنائے اور آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تھا، جو یقیناً مابعدِ حیات بھی ان کے رفعِ درجات کا سبب بنتے رہیں گے۔

اواخر عمر میں خصوصیت سے تمام اہل اللہ کی طرح آخرت کی فکر کا غلبہ اور رجوع الی اللہ میں اضافہ تھا، فریش ہو جانے کے بعد وصیت نامہ کا تکملہ لکھا، جس میں اپنے بعد رسوم و رواج سے احتیاط و احتراز کرنے حتی کہ جلسہ ہائے تعزیت منعقد کر کے تعریفوں میں مبالغے کے ذریعہ انہیں عنداللہ آزمائش میں نہ ڈالنے کی تک تاکید رقم فرما دی تھی، بیماری کے زمانہ میں برادرِ محترم مولانا مفتی محمد عبدالمغنی صاحب مدظلہٗ کے ہمراہ عیادت کے لیے حاضری ہوئی تھی، اس موقعہ پر مفتی صاحب نے عرض کیا: تمام محفلیں آپ کے بغیر سونی محسوس ہو رہی ہیں، مولانا نے فرمایا: "اب آپ لوگ ہیں نا" اس دن بھی اور بالکل انتقال سے چند گھنٹے قبل بھی میں نے مولانا پر بہت اطمینان محسوس کیا، سنا پڑھا تھا کہ اہل اللہ اس وقت کے انتظار میں اور لقاءِ حبیب کے شوق میں پابہ رکاب رہتے ہیں، اس کیفیت کا اندازہ مولانا کو آخری وقتوں میں دیکھ کر خوب ہوا، ان کی پیشانی پر بل تک نہ تھا، آنکھوں میں حوصلہ و ہمت کا نور چمک رہا تھا، وہ حسبِ معمول مسکراتے ہوئے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر نقاہت اجازت نہ دیتی تھی، انتقال سے ۱۰ / ۱۲ گھنٹے قبل میں نے عیادت کی تھی، ان کے چہرہ پر اطمینان دیکھ کر یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ آخری وقت ہے، میں سوچنے لگا کہ ڈاکٹروں نے کیوں مایوس ہو کر گھر بھیج دیا ہے، اور آخر آکسیجن کیوں لگایا گیا ہے، وہ سلام کا جواب بھی دے رہے ہیں، پہچان بھی رہے

ہیں، مسکرا کے لقاءِ مسلم کا حق بھی ادا کر رہے ہیں، زبان سے بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں، آخر کیا بیماری ہے؟ خیر! معلوم ہوا کہ انتقال سے نصف گھنٹہ قبل ہی خلق سے منقطع ہو کر خالق کی طرف متوجہ ہو گئے اور کلمہ طیبہ کا ورد شروع فرما دیا تھا اور آخری سانس میں ان کی روحِ مبارک نے اللہ اکبر کے ایک عاشقانہ نعرہ کے ساتھ قید خانۂ جسم سے رستگاری حاصل کر لی، یہ جمعہ کی شب اور صبح ۴ ربجے کا سہانا وقت تھا۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون، ان للہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل شئ عندہ باجل مسمی فلنصبر و لنحتسب۔

فجر سے قبل ہی اطلاع مل گئی تھی، نماز کے بعد حاضری ہوئی، اتنی ہی دیر میں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے، پولیس نے علاقہ کو اپنے نظم میں لے لیا تھا، ان کو جب حجرہ سے باہر لا کر ہال میں دیدار کے لیے رکھا جا رہا تھا، یہ عاجز بھی موجود تھا، برف دان پر لٹا کر جب ان کے چہرۂ مبارک کو زیارت کے لیے کھولا گیا تو لگ رہا تھا کہ وہ زائرین وحاضرین سے گویا فرما رہے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جمعہ کا دن تھا، اخبارات چھپ چکے تھے، لیکن ٹی وی اور آپسی اطلاعات کے ذریعہ شہر اور اطراف میں خبریں پہونچ گئیں، جمعہ ہونے کے باوجود اضلاع سے بھی لوگ جوق در جوق جمع ہونے لگے، شہر کی بڑی مسجد —— مکہ مسجد —— میں جمعہ کے بعد نمازِ جنازہ ادا کی گئی، مسجد، اس کے وسیع صحن کے علاوہ سڑکوں پر دور دور تک موجود ہزار ہا ہزار مسلمانوں کے جمِ غفیر نے نو منتخب امیر ملتِ اسلامیہ حضرت مولانا شاہ جمال الرحمن صاحب مدظلہ العالی کی امامت میں سوگوار دلوں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ نمازِ جنازہ ادا کی، اور ان کے آبائی قبرستان میں عصر سے قبل تدفین عمل میں آئی۔

اللّٰھم اغفر لہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ و ادخلہ الجنۃ برحمتک یا ارحم الراحمین۔ پسماندگان میں ان کے ایک صاحبزادہ جناب جعفر پاشاہ صاحب، ایک

صاحبزادی اوران کی اولاد شامل ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کوصبر جمیل اجر جزیل عطا فرمائے۔ اعظمهم الله الاجر ووفق لهم الصبر۔ آمین

مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ چند مشاہدات وتأثرات

گذشتہ شمارہ میں میں نے امیر ملتِ اسلامیہ حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال پر چند سطور قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی تھیں، آخر میں وعدہ بھی کیا تھا کہ کچھ مشاہدات وتأثرات آئندہ پیش کرونگا، ذیل میں چند مشاہدات جوقابلِ عبرت وسبق ہیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں؛ معذرت خواہ ہوں کہ اپنی متنوع اور متعدد مصروفیات کی وجہ سے کوئی کام مکمل نہیں کرپاتاہوں، پچھلے جومضامین ادھورے اور وعدے باقی ہیں ان کی تکمیل مقدم ہے، اس لیے اب کوئی وعدہ کرنے کی بھی ہمت نہیں ہے؛ مجھے امید ہے کہ دارالعلوم حیدرآباد سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حیات وخدمات اور افکارونظریات کے سلسلہ میں کماحقہ تحقیقی کام سامنے آئے گا۔ انشاء اللہ

❁ ایک مرتبہ حیدرآباد میں کوئی جلسہ ہورہا تھا، مولانا کی صدارت تھی، میری بات بھی طئے تھی، اتفاق سے مولانا سے قبل میں تقریر کررہا تھا، دوران بیان ہی مولانا رونق افروز ہوگئے تھے، جب میری بات ختم ہوگئی تواناؤنسر صاحب نے مولانا کا تعارف کرانے کے لیے اس کا سہارا لیا کہ میں نے بھی مولانا ہی کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی ہے، بات حق تھی مگر مولانا نے ان سے کہا کہ جلدی سے میرا اعلان کرواور یہ غیرضروری باتیں ختم کرو، لیکن وہ اپنے مخصوص انداز میں مقابلہ ومفاضلہ کرتے رہے، جب انہوں نے یہ کہا کہ آپ لوگ اندازہ کریں کہ جن کے مدرسہ میں پڑھ کرمولانا عبدالقوی صاحب اتنے بڑے عالم بنے اور اتنا اتنا کام کررہے ہیں توخود مولانا کا کیا مقام ہوگا؟ توتعریف وتعارف کے اس انداز پر مولانا برہم ہوگئے اور سخت ناراضگی کے لہجہ میں فرمایا: کیافضول باتیں کررہے ہو، بند کرو یہ بکواس، لاؤ ادھر مائیک اور اٹھ کرمقرر کی کرسی پر پہونچ گئے، میری طرف پلٹ کرفرمایا ”کچھ خیال مت کرو مولانا!“ میں نے انہیں کبھی غصہ کی اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا،

حالانکہ یہ کوئی ایسی ناروا بات بھی نہ تھی، مگر مولانا کی تواضع اور کسر نفسی نے اپنے لیے واقعی تقابل وتفاضل کو بھی پسند نہیں کیا، حالانکہ میں کیا مجھ سے کہیں فائق وفاضل علماء بھی ان کے مقام ومرتبہ کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے۔

❁ جب تک ان کی صحت اچھی تھی ان کا معمول رات دیر گئے اور سب سے اخیر میں بیان کرنے کا تھا، وہ اسٹیج پر بھی بہت تاخیر سے آتے تھے، اکثر ایسا ہوا کہ جب وہ بیان کے لیے اٹھنے لگتے تو پلٹ کر بڑی شفقت ومحبت سے فرماتے "آپ جاسکتے مولانا!" اجازت چاہے بغیر ازخود جانے کی اجازت دے دیتے تھے، حالانکہ میں اگر جانا بھی چاہتا تو تہذیب وادب کے خلاف محسوس کر کے کم ازکم کچھ دیر شریک رہنے کا ارادہ کئے ہوئے ہوتا تھا، ان کے اس طرزِ عمل سے واقعی بڑی وسعت وراحت ملتی؛ جب کہ مولانا کا یہ ظرف بہت کمیاب ہے، بہت سے لوگوں کو تو یہ بات گراں بھی گذرتی ہے کہ ان کی بات سنے بغیر دوسرے مقرّرین چلے جائیں۔

❁ سفر میں ان کے ساتھ کچھ اور مقرّرین بھی ہوتے تو اثناءِ راہ بہت بے تکلفی سے رہتے تھے، اپنے مرتبے کا ذرا احساس ہونے نہیں دیتے اور خاص بات یہ کہ جب سفر سے شہر میں واپس آجاتے تو باوجود رات دیر ہوجانے کے اور باوجود ہمارے منع کرنے کے بھی مولانا سب کو ان کے قیام گاہوں سے قریب چھوڑتے چلے جاتے تھے، ایک سفر سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ میں یہیں اتر جاتا ہوں آپ راست تشریف لے جایئے، تو فرمایا "کیوں؟ ہم اُدھر سے بھی نکل جاسکتے ہیں، اب اتنی رات میں آپ کو کونسی سواری ملے گی؟" چنانچہ میری مسجد سے قریب چھوڑ کر تشریف لے گئے؛ ممکن ہے آخر عمر میں جب کہ ضعف ونقاہت بہت ہوگئی تھی معمول بدل گیا ہو مگر جب تک صحت سلامت تھی یہی معمول دیکھنے میں آیا اور دوسروں سے بھی سنا۔

❁ میرے ایک دوست نے بتلایا کہ چالیس سال قبل کی بات ہے جب وہ رکشہ میں بیٹھ کر جمعہ پڑھانے کے لیے جارہے تھے، ان کے گھر اور مسجد کے درمیان راستہ میں کسی

بزرگ کی مزار تھی، جس پر سبز چادر پڑی رہتی تھی، روافض نے جگہ قبضہ کرنے کے لیے اس پر سیاہ چادر اوڑھادی اور دیوار پر سیاہ رنگ کر دیا، علاقہ میں ان کی کثرت کی وجہ سے کسی نے تعرض نہیں کیا؛ لیکن جب مولانا کی نظر اس پر پڑی تو میرے دوست یہ چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا نے رکشہ رُکوایا اور قریب کے ایک چبوترہ پر بیٹھے ہوئے نوجوانوں کو ـــــ جو اوباش قسم کے نظر آرہے تھے ـــــ بلاکر فرمایا "یہ سب کس نے کیا ہے؟ آئندہ جمعہ تک یہاں جیسا تھا ویسا ہو جانا، نہیں تو پھر دیکھ لینا کیا ہوگا" ان لوگوں پر اس کا ایسا رعب طاری ہوا کہ اگلے جمعہ تک پھر ہرا رنگ کر دیا اور ہری چادر اوڑھادی، یعنی مولانا کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ کسی مسلمان کی قبر پر روافض اس طرح قبضہ کرلیں اور جرأت کا یہ عالم کہ کسی کو خاطر میں نہ لایا۔

❁ یہ تو بہت قدیم واقعہ ہے ابھی قریب زمانہ میں مسجد کے سامنے شیعوں نے آبدار خانہ بنادیا تھا، مولانا نے پولیس کو متوجہ کیا، اور مسجد والوں کو ضابطہ کی کارروائی کر کے ہٹا دینے کے لیے فرمایا، مگر علاقہ میں روافض کے اثر ورسوخ کی وجہ سے اس کا اثر نہ ہوا، وہ آبدار خانہ اسی طرح قائم رہا، جب مولانا نے دیکھا کہ متعلقہ افسران بھی ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں تو جمعہ کے بیان میں فرمایا کہ "اگر اگلے جمعہ تک یہ آبدار خانہ مسجد کے سامنے سے ہٹایا نہیں جائے گا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دوں گا پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" فوراً متعلقہ محکمہ حرکت میں آیا اور وہاں سے ہٹانا ہی پڑا۔

❁ ایک جلسہ میں مولانا شریک ہوئے، محلہ میں اہلِ بدعت کا غلبہ تھا ان لوگوں کو یہ جلسہ منظور نہ تھا؛ اِدھر جلسہ ہوتا رہا اور اُدھر انہوں نے مولانا کی گاڑی پر حملہ کر دیا اور پتھر مار کر شیشے توڑ ڈالے، خیر کسی طرح مولانا کو بحفاظت گھر پہونچا دیا گیا؛ ظاہر ہے کہ ایک بڑی دینی وروحانی بزرگ شخصیت کے ساتھ یہ سلوک کسی طرح روا نہ تھا، اور خود مولانا جیسے شفیق ومہربان عالمِ دین کے لیے سخت تکلیف دہ تھا، گاڑی کا نقصان بھی ۲۰ ہزار سے زائد کا ہوا تھا، اس کے باوجود جب مولانا کے سامنے جلسہ کے منتظمین نے ان نوجوانوں کے خلاف ـــــ

کیس بک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مولانا نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ ''میں مسلمان بچوں کے خلاف شکایت درج کراؤں؟ اور انہیں پولیس کے حوالہ کروں؟ ہرگز مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا، چھوڑو جو ہونا تھا وہ ہوا۔''

❁ ایک پروگرام میں اس وقت کے ایک ریاستی منسٹر نے جو دینی تعلیم اور علماء سے چڑھ رکھتے تھے مولانا کو دیکھ کر انہیں اور الرجی ہوئی اور انہوں نے مدارس دینیہ کی ناکارگی اور علماء کی فرسودگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ مولانا بھی مدرسہ چلاتے ہیں اور قوم کا اتنا پیسہ برباد کر کے کہتے ہیں کہ علماء تیار کر رہے ہیں، کتنے علماء تیار کر رہے ہیں انہی کو معلوم ہے، میرے بچوں کو قرآن پڑھانے کے لیے ڈھونڈنے سے بھی کوئی مولوی صاحب نہیں مل رہے ہیں۔ جب مولانا کا نمبر آیا تو مولانا نے بیٹھتے ہی فرمایا بعض لوگوں کو حکومت میں ایک چھوٹی سی سیٹ مل جاتی ہے تو آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور ان کو زمین نظر آتی نہ آسمان دِکھتا ہے، یہ منسٹر صاحب شہر کی کونسی گلی میں رہتے ہیں آج تک عاقل صاحب کو نہیں معلوم تو علماء کو کہاں سے معلوم ہوگا، پھر علماء تو علماءِ کرام ہیں وہ تمہارے گھر ڈھونڈتے ہوئے نہیں پھرتے، تم کو ان کے پاس جاکر ادب واحترام سے درخواست کرنا پڑتا ہے، تم جیسے لوگ وزیر تعلیم بن گئے ہیں تو گورنمنٹ اسکولوں کا سارا نظام برباد ہوگیا ہے، ذرا ہمارے مدرسوں میں آکر دیکھو کیسا نظم ونسق ہے اور کیسی محنت سے تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔ اتنے میں بجلی چلی گئی تو وہ منسٹر صاحب پیچھے سے کہنے لگے یہ بھی ہمارے ہی سر ڈالو، مولانا نے فرمایا ''ذرا ٹھہرو سب بتاتا ہوں کیا کیا ہو رہا ہے''۔ غرض! یہ مولانا کی ہی جرأت تھی کہ کسی بھی اسٹیج پر دینی، ملی اور علمی کسی بھی مسئلہ پر کوئی زبان کھولتا تو وہیں پر صاف اور بے لاگ جواب دے دیتے تھے۔

❁ اسی طرح ''ختمِ نبوت'' کے موضوع پر شہر کے اہم مقام پر ہمہ مسلکی اجتماع تھا؛ مجمع کثیر، موضوع حساس اور تمام ہی مکاتب فکر کے قائدین یک زبان ویک جذبہ تھے، یکے بعد دیگرے تقریریں ہو رہی تھیں، اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پر یہ رنگارنگ اجتماع وحدت کا ثبوت دے رہا تھا؛ اتنے میں ایک بریلوی بزرگ اسٹیج پر آئے تو عجیب وغریب

تماشے ہوئے، پھر انہوں نے اپنے بیان میں وہی اختلاف اور شقاق کی بات شروع کردی، سب ہی کو نا گوار ہوا، انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم لوگ اختلاف کے باوجود آپس میں متحد ہیں اور آپ لوگوں کے درمیان ہی یہ سب فرقے فتنے رہتے ہیں؛ ان کے بعد مولانا نے خطاب فرمایا اور بڑے ہی ظریفانہ انداز میں حق تردید ادا کرتے ہوئے فرمایا آپ لوگوں کا اتحاد ''سنگترہ'' کی طرح ہے کہ اوپر سے متحد مگر اندر الگ الگ، ہمارا اختلاف ''خربوزہ'' کی طرح ہے کہ دیکھنے میں الگ الگ شاخیں مگر اندر سے سب ایک!

❁ شہر کی ایک قدر آور سیاسی شخصیت سے مولانا کو للّٰہ اختلاف ہوگیا، مولانا کھل کر سامنے آ گئے اور اپنے ہر پروگرام میں ان کے خلاف کچھ نہ کچھ کہنے لگے، ہم لوگوں نے ایک سفر کے دوران عرض کیا کہ حضرت آپ اس میدان میں کیوں چلے گئے، بعض بہت پرانے عقیدت مند بھی نالاں ہیں کہ قبلہ اس گندی سیاست میں کیوں جا رہے ہیں؟ مولانا نے بہت تحمل سے سنا پھر فرمایا کہ بھئی برسوں سے ان لوگوں کی زیادتی قوم برداشت کرتی آ رہی ہے، ہم بھی یہی سوچ کے خاموش رہے کہ ہم کیوں اس میں دخل دیں، مگر اب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو ہم ''چنومیاں'' بن گئے۔ اور قصہ سنایا کہ ہمارے بچپن میں محلہ کا بھنگی وقت پر نہیں آ رہا تھا، کئی کئی دن صفائی نہ کرتا، لوگ پوچھنے جاتے تو گندی جھاڑو گھما کر بھگا دیتا، سب لوگ عاجز ہو گئے تو ایک صاحب جو چنومیاں کے نام سے مشہور تھے انہوں نے کپڑے اتار کر تہبند باندھ لی اور اس کے پاس پہنچ گئے کہ آج تو تجھے لے کر ہی جانا ہے، چاہے تو کتنی ہی گندگی پھیلائے، غرض کسی طرح اس کو پکڑ کر لے ہی آئے، تو میں بھی اب چنومیاں بن کر گندی سیاست کے خلاف اُتر گیا ہوں کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا، یعنی قوم کی بھلائی کے لیے وہ اس حد تک بھی کر کے دکھلا گئے۔

❁ میں جب دارالعلوم حیدرآباد پڑھنے کے لیے جایا کرتا تھا کبھی کبھی وہ مدرسہ تشریف لاتے تھے، عموماً ظہر کی نماز مدرسہ کی مسجد میں پڑھتے تھے، میں نے دیکھا انتہائی اہتمام سے اور سنت کے مطابق قبلہ رو وضو کرتے تھے، سننِ قبلیہ و بعدیہ کے علاوہ نوافل بھی پورے ادا

کرتے تھے، نماز میں نہایت خشوع وخضوع اور یکسوئی ودلجمعی ہوتی تھی، سنتیں اور نفلیں جگہ بدل بدل کر ادا کرتے تھے —— اس وقت اس عمل پر تعجب ہوتا تھا مگر بعد میں حضرت حکیم اختر صاحب مدظلہٗ سے سنا کہ علامہ عبدالرؤف مناوی نے اس کو تعددِ شواہد الخیر کا سبب بتا کر محمود قرار دیا ہے —— نماز کے بعد دعا بھی اہتمام سے کرتے تھے، نماز کا یہی حال اسفار میں بھی دیکھنے کو ملا، گھر والوں سے معلوم ہوا کہ گھر میں بھی جب وہ نوافل ادا کرتے تو اسی شان اور کیفیت سے ادا کرتے تھے، میرے نزدیک فی زمانا یہ ذوقِ عبادت بالخصوص اہلِ علم کے لیے قابلِ قدر و لائقِ تقلید ہے۔

❁ اعترافاتِ خدمات کرکے دل بڑھانا اور حوصلہ دلانا ان کا خاص وصف تھا، کہیں بھی ملاقات ہوتی بہت محبت سے ملتے، مدرسہ کے بارے میں پوچھتے اور ایسے الفاظ میں ہمت افزائی کرتے کہ گویا میرا ہر کام ان کے سامنے ہے؛ بلکہ اگر وہاں کوئی بڑی شخصیت یا مہمان ہوتے تو ان سے تعارف کراتے؛ یہ کوئی میرے اکیلے کے ساتھ نہ تھا، ان کا مزاج تھا کہ معاصرین کو عزت تو دیا ہی کرتے تھے اصاغرین کو بھی صغیر نہیں رہنے دیتے تھے؛ کبھی ان سے ملنے میں ناراضگی یا خفگی کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا، اَنْ تَلْقَ اَخَاکَ بِوَجْہٍ طَلَقٍ کا عملی نمونہ تھے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے۔

تنگیٔ وقت کے مدِنظر بس ان چیدہ چیدہ واقعات پر اکتفا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک نے انہیں جس طرح زندگی میں عظیم وعمیم خدمات کی توفیق سے سرفراز فرمایا تھا اپنے حضور پہونچنے کے بعد اس سے کہیں زیادہ اجر وثواب سے عزت افزائی فرمائے۔ آمین

محترم عابد بھائی رحمۃ اللہ علیہ

رمضان المبارک کے بعد سے کچھ ایسی مشغولیات رہیں کہ لکھنے پڑھنے کا موقعہ بالکل نہ مل سکا، اسی اثناء میں کئی اہم شخصیات کی رحلتیں بھی ہوئیں، ان کے بارے میں بھی ذہنی یکسوئی نہ ہونے کی وجہ سے جی چاہنے کے باوجود بھی کچھ رقم نہ کرسکا؛ ان مرحومین میں علاقے کی ایک اہم شخصیت داعی الی اللہ محترم عابد بھائی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں؛ موصوف حیدرآباد ہی سے تعلق رکھتے تھے اور دعوت وتبلیغ کے سرگرم کارکن اور ریاستی مرکز کے ذمہ داروں میں شامل تھے، کالج لائف ہی میں ان کو اس جماعت سے وابستگی کا موقعہ ملا تھا اور اس دور میں ملا تھا جب کہ یہ کام حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی امارت وسرکردگی میں عروج وشباب کے مراحل طئے کررہا تھا، عابد بھائی کو بھی اس کام میں کام کے بڑوں اور بابصیرت لوگوں کی سرپرستی حاصل رہی، انہوں نے اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، دور اور دیر کے لئے نکلتے رہے، یورپین اور عربین ممالک کے علاوہ خود ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کام کیا، اس کے لئے طویل اسفار اور شدید مجاہدات کا سامنا کیا۔ بقدر ضرورت علم دین سے آراستہ تھے، اپنے ذوق وشوق سے قرآن مجید مکمل حفظ کرلیا تھا، اکابر کی کتب بالخصوص ان کی سوانح کا وسیع مطالعہ تھا، "حیات الصحابہؓ" تو گویا انہیں ازبر تھی، اس کام کی برکت سے تقریر وخطابت کا ملکہ بھی حاصل ہوگیا تھا، پھر ان کے اخلاص وللّٰہیت کی برکت سے اس میں اتنی ترقی ہوئی کہ بفضلہٖ تعالیٰ بڑے بڑے اجتماعات میں بلاتکلف گھنٹوں خطاب کرلیتے تھے، تقریر کا ایک منفرد انداز تھا، واقعاتِ صحابہؓ وحکایاتِ اولیاء سناتے ہوئے وہ خود بھی اشکبار ہوجاتے سامعین کو بھی تڑپا کے رکھدیتے تھے، اسی وجہ سے ان کے بیانات کے بعد

تشکیل مضبوط ومؤثر ہوا کرتی تھی۔

بلاشبہ ہزاروں خاندان اور لاکھوں مسلمان ان کی سعی بلیغ اور مؤثر دعوت سے بے دینی کی راہوں سے نکل کر دین کے میدان میں آئے، جس کی وجہ سے انہیں دعوت کے حلقے میں قبولیتِ عام بھی حاصل تھی، جسے حدیث پاک میں قبولیت کا نقد انعام فرمایا گیا ہے؛ بیانوں کے اختتام پر دعا بھی بہت سوز وگداز سے کرتے تھے جس سے قلوب اور بھی نرم پڑ جاتے، دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں کے ساتھ اہل اللہ سے تعلق اور سلوک وتزکیہ کی اہمیت سے غافل نہ تھے، اس سلسلہ کی ابتداء اکابر نظام الدین کی تربیت میں کی اور انتہاء شیخ المشائخ حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر ہوئی، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اجازت بیعت وارشاد بھی مرحمت فرمائی تھی، چنانچہ اخیر زمانے میں وہ بیعت وتلقین کی طرف بھی اہتمام کے ساتھ متوجہ رہے۔

ہر ایک کا اکرام اور علماء ومشائخ کی تعظیم کرتے تھے، حج وعمرہ اور زیارتِ مدینہ کا ذوق بہت تھا، مواقع بھی ماشاء اللہ بہت ملے، وہاں بھی دعوت کی اپنی دھن سے غافل نہ ہوتے تھے، روزانہ کہیں نہ کہیں پروگرام رہتے تھے، مدت العمر جامع مسجد مشیر آباد کے مقبول خطیب رہے، عیدگاہِ بلالی میں عیدین کے موقعہ پر فکر انگیز خطاب فرماتے اور دعوت کی اہمیت نیز اصلاح وتربیت کی ضرورت پر روشنی ڈالتے رہے، اپنے معمولات میں تلاوتِ کلام پاک ،اذکار واشغال، مناجاتِ مقبول کی ہر حال میں پابندی کرتے تھے، تہجد اور دیگر نوافل کی مواظبت بھی مثالی تھی، خلافِ شرع محافل میں شرکت سے گریز کرتے تھے، نکاح کی جن مجالس میں اہل تعلق کے اصرار پر شرکت کرتے ان میں اگر منکرات دیکھتے تو جرأتِ ایمانی اور غیرت وحمیتِ اسلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت نکیر فرماتے تھے، راقم سطور نے خود کئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

کئی برس سے گردوں کے عارضے میں مبتلاء تھے، آخر میں ڈائلیسس پر جی رہے تھے، سو مرتبہ سے زائد انہیں اس تکلیف دہ علاج سے گذرنا پڑا، ۲۳ر اگست کو بستر پر پڑے،

ہفتہ بھر بے ہوشی رہی بالآخر ۶ ستمبر ۲۰۱۲ء م ۱۸ شوال ۱۴۳۳ھ ہجری جمعرات کی صبح جان جان آفریں کے حوالے کردی، انا للہ وانا الیہ راجعون؛ اسی دن ۳ بجے عیدگاہِ بلالی میں ہزاروں مسلمانوں نے ____ جن میں بڑی تعداد علماء وصلحاء اور مشائخ کی تھی ____ ریاستی امیر جماعت محترم نعیم اللہ خان صاحب کی امامت میں نمازِ جنازہ ادا کر کے باچشم نم سپرد خاک ____ کئے گئے، پسماندگان میں اہلیہ ____ جو خود بھی علیل وفریش ہیں ____ کے علاوہ ۲ لڑکے اور ۴ لڑکیاں شامل ہیں۔ اللہ پاک غریقِ رحمت فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد فاروق مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ

کوئی نصف صدی قبل کی بات ہوگی جب کہ ضلع رنگاریڈی سے تعلق رکھنے والے ایک سلیم الطبع کاشتکار وزمیندار غیر مسلم اپنی بیوی، بیٹی اور تین بچوں سمیت دکن کے معروف عالم وعارف حضرت مولانا حمید الدین عاقل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر دین اسلام سے مشرف ہوئے؛ اسلام لانے کے بعد بھی دو اولادیں ہوئیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی، ماشاء اللہ سب ہی مستقیم المزاج اور اسلام میں مضبوط ومستحکم رہے؛ یہ حضرات علاقے کی نہایت ہی بافیض وصاحبِ ارشاد بزرگ شخصیت حضرت صوفی غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کسبِ فیض کرتے رہے؛ بزرگوں کے مشورہ سے بڑے بیٹے کو اپنے کاموں میں شریک رکھا، دوسرے اور تیسرے کو پھر چوتھے کو بھی دین کی تعلیم میں مشغول کیا، تینوں بفضل الٰہی عالم دین ہوئے، دونوں بیٹیوں کی بھی پختہ اسلامی تربیت کرا کے اچھے گھرانوں میں بیاہا، جو ماشاء اللہ سے شاد وآباد ہیں۔

تین عالم بیٹوں میں سب سے بڑے حضرت مولانا محمد فاروق صاحب مفتاحی ہیں، جنہیں اب سے مدظلہٗ کے بجائے رحمہ اللہ کی دعا سے یاد کیا جائے گا؛ مولانا مرحوم کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے حضرتِ عاقل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت وصحبت میں طویل عرصہ گذارا، حتی کہ گھر ہی کے ایک فرد کی حیثیت ہوگئی تھی؛ جب ابتدائی تعلیم سے آراستہ ہوگئے تو شمالی ہند کی معروف درسگاہ مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد پہونچے، اور حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ فضیلت تک تعلیم حاصل کر کے وہیں سے سندِ فراغت حاصل کی؛ فراغت کے بعد پھر مولانا عاقل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہونچ کر ان کے قائم کردہ جامعہ دار العلوم حیدرآباد میں

خدمات انجام دینے لگے، دارالعلوم میں انہوں نے انتظامی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں اور تعلیمی ذمہ داریاں بھی نبھائیں؛ وہ عزم کے پختہ اور ارادے کے مضبوط آدمی تھے، اعمال واخلاق کی عمدگی، قلب ونظر کی پاکیزگی، اکابر دیوبند کے مسلک ومشرب میں پختگی مثالی تھی، طبعاً ظریف وبے تکلف واقع ہوئے تھے، چھوٹوں، بڑوں ساتھیوں سب ہی میں گھل مل جاتے تھے۔

دارالعلوم کے زمانہ تدریس ہی میں انہیں پتہ چلا کہ وطن کے قرب وجوار میں عیسائی مشنریز سرگرم عمل ہو کر بھولے بھالے اور ان پڑھ مسلمانوں کو اپنے دام تزویر کا شکار کر رہی ہیں، کئی مسلمان ان کے زیر بار قرض ہو جانے کی وجہ سے چرچوں کی حاضری اور مذہب کی تبدیلی کے مجرم ہوئے ہیں، تو انہیں علاقے کے مسلمانوں پر رحم آیا، دھیرے دھیرے مقامی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر وطن چلے گئے اور اطراف واکناف میں دعوتی وتعلیمی جد وجہد میں مشغول ہو گئے؛ مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے چرچ کے مقروض مسلمانوں کو سمجھا بجھا کر اور ان کے قرضے ادا کروا کر انہیں اس مصیبت سے نجات دلائی، مسجدوں سے جوڑ کر نمازی بنایا، جگہ جگہ مسجدیں تعمیر کروائیں؛ ایک مسجد میں درس قرآن اور جمعہ کے خطاب کا سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعہ لوگوں میں دینی شعور بیدار ہونے لگا، گاؤں میں مدرسہ پہلے ہی سے قائم تھا، اسکی توسیع وترقی کروائی، اس کے علاوہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدرسۃ البنات کا قیام عمل میں لایا؛ ماشاء اللہ اس وقت دونوں مدارس چل رہے ہیں علاقے کے طلبہ وطالبات بڑی تعداد میں مستفید ہو رہے ہیں، وقتاً فوقتاً مختلف عنوانات پر مدرسہ میں جلسے کرواتے اور اطراف واکناف کے مسلمانوں کے لئے استفادہ کا انتظام کرتے رہے۔

مولانا مجلس علمیہ کے سینئر اراکین میں سے تھے، عاملہ کے رکن بھی ہو گئے تھے، مولانا نے مجلس علمیہ کا اجلاس شوریٰ اپنے مدرسہ میں رکھوایا تھا، سو سے اوپر علماء ریاست بھر سے مجتمع ہوئے، اجلاس کے اختتام پر آنے والے علماء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رو پڑے کہ اتنے چھوٹے سے گاؤں میں ہماری دعوت پر اتنے سارے علماء جمع ہوئے ہیں؛ پھر شرکاء

کے اصرار پر علاقے کے حالات بہت ہی سوز ودرد سے سنائے کہ پہلے کیا حالات تھے اور اب کیا انقلاب وتبدیلی واقع ہوئی ہے، ان حالات کو سن کر خود علماء کرام آب دیدہ ہورہے تھے، اوران کی بلند حوصلگی وعالی ہمتی اور حکیمانہ جدوجہد پر تحسین وتبریک پیش کررہے تھے۔

اپنے تلامذہ سے اپنے بچوں کی طرح سلوک کرتے تھے، آخری دن بھی معلوم ہوا کہ ہاسپٹل میں ڈائیلاسیس کے واسطے کاغذات پر دستخط کیلئے مطالبہ کیا جارہا ہے تو اس وقت وہاں موجود ایک شاگرد نے کہا: ”میں ان کا بیٹا نہیں ہوں، ان کے بیٹے ابھی آنے والے ہیں“ مولانا نے یہ سن کر اس سے کہا کہ کیوں تم میرے بیٹے نہیں ہو؟ میں نے تم کو پڑھایا نہیں ہے؟ تم دستخط کردو۔

اس واقعے کے کچھ ہی دیر بعد مولانا اس دنیا سے رخصت کرگئے، ازیں قبل جب ان کی علالت کی اطلاع ملی تھی تو میں عیادت کے لئے گھر پہونچا تو اس وقت صحت بہت ناساز تھی، بول وبراز دونوں موقوف تھے، مگر لیٹے لیٹے ہی بہت بشاشت سے ملے، بار بار کہتے رہے کہ اب بہت اچھا ہوں، الحمدللہ اب طبیعت اچھی ہے؛ چاء منگوا کے پلائی، گھر سے متعلق کچھ تفصیلات سناتے رہے، محسوس ہونے بھی نہیں دیا کہ طبیعت اس قدر ناساز ہے۔

راقم عاجز نہ ان کا ہم عمر ہے نہ ہم درس پھر بھی ملاقات پر بڑی بے تکلفی اور خلوص ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے، محض اس وجہ سے کہ بچپن میں ان کے بھائی بہن کی تعلیم مدرسہ فیض العلوم میں ہمارے ساتھ ہوئی تھی، ان کی چھوٹی بہن کو تو بچپن میں ہمارے گھر ہی میں رکھا تھا، معلوم ہوا کہ اپنے گھر میں اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، اسی نسبت سے والدہ محترمہ کو بھی یاد کرتے اور بڑا احترام فرماتے تھے۔

الخیر! ادھر کچھ عرصہ سے علاقے کے حالات میں منفی تبدیلی اور بعض داخلی مسائل سے دوچار ہوگئے تھے، جس کی وجہ سے کافی متأثر تھے، دل کے مریض بھی تھے پھر شوگر، پیشاب وغیرہ امراض نے مزید مضمحل کردیا تھا، بالآخر ۲۶/نومبر ۱۲ء بروز پیر دن میں دیڑھ بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نمازِ جنازہ بعد نمازِ عشاء دارالعلوم حیدرآباد میں علماء وطلباء کے کثیر تعداد نے حضرت شاہ جمال الرحمن صاحب مدظلہٗ کی امامت میں ادا کی، بعدہٗ ان کے وطن کشٹا پور لے جایا گیا، جہاں بعد نمازِ فجر ان کے بڑے صاحبزادے حافظ ابوذر صاحب نے جو سعودی عرب سے اسی وقت پہونچے تھے دوبارہ نماز جنازہ پڑھائی، اطراف واکناف سے آئے ہوئے سینکڑوں متعلقین نے اس میں شرکت کی، علاقے کے ہندو مسلم عوام سب ہی مغموم تھے او رمولانا کا ذکر خیر ہر چھوٹی بڑی زبان پر یکساں تھا۔ تغمدہ اللہ بغفرانہ۔

پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صبر وشکیب کے ساتھ مولانا کی چھوڑی ہوئی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

حضرت حاجی عبدالستار صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۱۳؍دسمبر ۲۰۱۱ بروز شنبہ طویل علالت کے بعد محترم ومکرم الحاج حضرت عبدالستار صاحبؒ کا وصال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اسی دن بعد نمازِ عشاء مسجد النور مدرسہ فیض العلوم میں بہت بڑے مجمع نے ـــــ جس کی اکثریت حفاظ وعلماء اور طلبہ وصلحاء کی تھی ـــــ نمازِ جنازہ ادا کر کے دائرۂ سلطان کرما گوڑہ میں سپردِ خاک کردیا۔

حاجی صاحب مرحوم اللہ تعالیٰ کے باتوفیق اور سعادتمند بندوں میں سے تھے، ماشاء اللہ علم وعمل اور ورع وتقویٰ کی جیتی جاگتی مثال تھے، جب تک صحت نے ساتھ دیا دین کی خدمت کرتے رہے اور جب قویٰ مضمحل پڑ گئے تو یادِ الٰہی میں مشغول رہ کر دارِ آخرت کی طرف روانہ ہوگئے۔

وہ حیدرآباد سے کوئی دیڑھ سو کیلومیٹر دور واقع ضلع ورنگل کے قصبہ مرماموں سے تعلق رکھتے تھے، والد زمیندار اور متمول آدمی تھے، اور عام زمینداروں کی طرح کھیتی باڑی میں لگے رہتے تھے، دین کی طرف کوئی خاص رجحان نہ تھا، البتہ بچوں کو تعلیم دلانے کا اہتمام تھا، حاجی صاحبؒ بھی اسکول میں شریک کئے گئے اور اس زمانے کی اصطلاح میں منشی تک تعلیم حاصل کی، جسے اب ’’بی اے‘‘ کہا جاسکتا ہے۔ ہائی اسکول پڑھتے وقت میں کوئی استاذ دین پسند اور باعمل مزاج کے مل گئے، ان کی نصیحت اور صحبت کی برکت سے آپ میں دینداری کا شوق پیدا ہوا، جو مسلسل بڑھتا اور پروان چڑھتا رہا، وہ چونکہ بزرگوں کے احوال اور دین کی باتیں سنایا کرتے تھے اس لیے ان کے ساتھ زیادہ رہنے لگے، رات دیر گئے گھر آتے تھے جو والد صاحب کو گوارا نہ تھا، اس لیے خفا ہوجایا کرتے اور کبھی ناراضگی سے گھر کا دروازہ بھی

بند کرلیا کرتے تھے تاکہ کسی طرح وہ ان استاذ صاحب کی صحبت ومعیت ترک کردیں، لیکن حاجی صاحبؒ کے مزاجِ صالح اور ذوقِ دل کی تسکین چونکہ وہیں ہوتی تھی اس لیے وہ سب کچھ گوارا کر کے بھی ان مولوی صاحب سے استفادہ کرنے اور عملی زندگی میں دینی رنگ پیدا کرنے میں مشغول رہے۔ البتہ ان کی والدہ صاحبہ ماشاء اللہ پابندِ صوم وصلوٰۃ، دین پسند، باحیا اور پاکدامن خاتون تھیں، اور ماموں تو جامعہ نظامیہ کے فارغ عالم دین تھے۔ غالباً یہ انہی کے گود کے اثرات تھے کہ آگے چل کر ان کی اولاد سب کی سب دینی علم اور دینی خدمات میں جڑ گئی۔ اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ اور ان کے بھائی بہنوں کی تقریباً سبھی اولاد پورے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کا خاندان دین کی خدمات میں ایک ممتاز خاندان کی حیثیت رکھتا ہے۔

تعلیمی سلسلہ ختم ہوا تو ملازمت حاصل کرنے کی طرف دھیان گیا، اس زمانے تک ریاست حیدرآباد کا سقوط نہیں ہوا تھا، ملازمتیں مسلمانوں کو بہ سہولت مل جایا کرتی تھیں، حاجی صاحبؒ کو بھی ایک ملازمت ماہانہ پچاس روپئے مشاہرہ پر مل گئی، اس وقت کے حساب سے ابتدائی مشاہرہ پچاس روپئے کچھ کم نہ تھا مگر ان کے والد صاحب کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے اسے اپنے معیار اور شان کے خلاف سمجھتے ہوئے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ پچاس روپئے کی کیا نوکری کروگے میں پچپن روپئے ماہوار دیا کرونگا تم تجارت میں لگو، چنانچہ حاجی صاحب مرحوم نے تجارت کا ارادہ کرلیا۔

قریب میں واقع ایک شہر ہنمکنڈہ میں کرانے کی دوکان کھول کر تجارت کا آغاز کیا، ساتھ ہی ایک دوسرے قصبے ربرتی میں کپڑوں کا کاروبار لگایا، اور علاقے کے دیگر تاجروں کے ساتھ چھ ماہ پربھنی اور جالنہ وغیرہ کے علاقے میں جو اس وقت ریاست حیدرآباد ہی کا ایک حصہ تھا پارچے کی تجارت کرتے تھے اور چھ مہینے گھر کے پاس کاروبار چلایا کرتے تھے۔ نکاح قریب ہی کے ایک اور قصبہ مدّور میں جناب وزیر علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوا، یہاں کے لوگ دین ودیانت میں نسبتاً ممتاز تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں جو دینی ذوق عطا فرمایا تھا یہ اسی کی برکت تھی کہ جوانی ہی سے شخصی زندگی میں تقویٰ وطہارت کے اہتمام کے علاوہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ بھی بہت حاصل ہو گیا تھا، چنانچہ عملاً تبلیغی جماعت کی دینی محنت سے وابستہ ہو کر حتی المقدور اصلاحِ امت کی کاوشوں میں شریک ہو گئے تھے، اسی زمانے میں آپ کے دل میں حج بیت اللہ کا داعیہ پیدا ہوا، مادّی وسائل تو مہیا تھے ہی، آپ نے اس داعیے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فوری طور پر تیاری شروع کی اور ۳۰/۳۲ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اُس زمانے میں کم ہی لوگ اس شرف سے مشرف ہوا کرتے تھے اور کڑی جوانی میں اس زمانے کی صعوبتوں اور مشقتوں کے باوجود حج کی توفیق ہو جانا تو اور بھی کمیاب ونادر شرف تھا، اپنے گاؤں کے پہلے حاجی کی حیثیت سے جب سفر سے واپس ہوئے تو گاؤں والوں نے زبردست خیر مقدم کیا اور روایتی استقبال کا مظاہرہ کر کے مبارکباد دی۔ کہتے ہیں کہ وہ جس دن حیدرآباد پہونچے وہ تاسیس آندھرا پردیش کا پہلا دن تھا۔

سفر حج کے دوران مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں تبلیغی جماعت کی دعوتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے، ایک دن مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس کے قریب تعلیم کا حلقہ لگا ہوا تھا، حضرت حاجی صاحبؒ بھی اس میں شریک ہو گئے، اس میں یہ دیکھ کر بہت تعجب اور تکلیف محسوس کی کہ شرکاءِ حلقہ کو کلمہ طیبہ بھی صحیح طور پر تلفظ کرنا نہیں آ رہا تھا، سکھانا پڑ رہا تھا، اس صورتحال کا ان کی حساس طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا اور دل میں ٹھان لیا کہ وطن پہونچ کر ایک مدرسہ کھولونگا، تاکہ علاقے کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہو سکیں اور کلمے نماز درست کرنے، تلاوتِ قرآن اور دین سے واقفیت حاصل کرنے میں مسلمان بچوں کو دشواری پیش نہ آئے۔ چنانچہ یہی سچا داعیہ اور عزم مصمم آگے چل کر مدرسہ فیض العلوم کی صورت میں رونما ہوا۔

دینی شعور کی پختگی اور دعوت وتبلیغ سے وابستگی کی وجہ سے جہاں تدینِ ظاہری کی فکر تھی وہیں اصلاحِ باطن اور روحانی ترقی کا احساس بھی نصیب تھا، اس ضرورت کی تکمیل کے واسطے

احباب سے مشورہ کے بعد اس وقت کے معروف اور بافیض عالم دین شیخ طریقت ابوالحسنات حضرت عبداللہ شاہؒ کی خدمت میں ان کی قیام گاہ حسینی علم حیدر آباد پہونچے، ماحول میں انس ویگانگت نظر نہ آئی، تھکے ہارے تھے مسجد ہی میں ایک طرف کو سو گئے، اٹھے تو دل میں خیال آیا کہ حضرت تو کافی ضعیف ہو گئے ہیں میری عمر کم ہے اور بہت طویل تربیت وصحبت کی ضرورت ہے اس لیے مجھے جواں عمر شیخ تلاش کرنا چاہیے، اس قلبی واردے کے بعد واپسی کا ارادہ کرلیا اور وطن چلے آئے، یہاں پہونچے تو مدور میں جناب حافظ عبدالمعز صاحبؒ سے ملاقات ہوئی جو حضرت مولانا محمد امام صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے اور ہردوئی میں زیر تعلیم تھے، انہوں نے اطلاع دی کہ محی السنۃ حضرت شاہ ابرارالحق صاحبؒ حکیم الامتؒ کے خلیفہ اور بڑے اللہ والے بزرگ ہیں اور یہاں آئے ہوئے ہیں، فلاں صاحب کے گھر پر قیام ہے، حاجی صاحبؒ فوراً ملاقات کے لیے پہونچے تو حضرت محی السنۃؒ سے بہت مرعوب ومتاثر ہوئے، اور اپنی طبیعت میں غیر معمولی انس و مناسبت محسوس کی، طئے کرلیا کہ یہی میرے شیخ ہوں گے۔ حضرتؒ کو بھی ان کی قدردانی اتنی پسند آئی کہ حضرت نے ان کے وطن کے بارے میں دریافت کیا اور جب معلوم ہوا کہ یہیں قریب میں ہے تو چلنے کا ارادہ ظاہر کر کے ان کے ہمراہ مرماول پہونچے۔ حاجی صاحبؒ نے یہیں حضرت محی السنۃؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور عمر بھر اس بیعت کی لاج رکھنے اور حقِ وفا ادا کرنے میں مشغول رہے۔ اسی دن سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر کے تکمیل و ترقی کی سعی کرتے اور دعائیں لیتے رہے۔ کوئی پچاس سال تک یہ سلسلہ چلا، بالآخر حضرت محی السنۃؒ نے ۱۴۱۱ھ میں مکہ مکرمہ سے اجازتِ صحبت پھر تین سال بعد ۱۴۱۴ھ مدینہ منورہ سے اجازتِ بیعت وارشاد عطا کی۔

اپنے علاقے میں دینی مدرسہ کے قیام کی فکر میں بھی حسبِ توفیق لگے رہے، ان کے بچے تو چھوٹے تھے، اپنے بڑے بھائی جناب احمد محی الدین صاحب مرحوم کے بچوں احمد عبدالعلیم، احمد عبدالوارث اور احمد عبدالرب صاحبان کو صحیح تعلیم وتربیت دلانے کے لیے

اشرف المدارس ہردوئی روانہ کیا۔

۲۹ محرم ۱۳۷۷ھ کو حاجی صاحب نے حضرت محی السنۃؒ کو ایک اصلاحی خط روانہ کیا، جس کے آخر میں مدرسہ کے قیام سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

> "بعض دفعہ بہت جوش ہوتا ہے اس نواح میں ایک مدرسہ عربیہ قائم کرنے کا، پھر اپنی بے بضاعتی پر مجبور ہو جاتا ہوں، اس لیے کہ نہ میں عالم ہوں کہ خود درس جاری کروں اور نہ اتنا مالدار ہوں کہ ایک مدرسہ قائم کر کے اس کا انتظام ہاتھ میں لوں، دعا فرمائیے اور کوشش فرمائیے کہ ریاست حیدر آباد میں ایک مدرسہ دینیہ قائم ہو جائے"۔

اس کے جواب میں حضرت محی السنۃؒ نے بقلم خود جواب تحریر فرمایا:

> "بہت مبارک خیال ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل جلد ہوگی، آپ ارادہ رکھیں، یہ کام دعوۃ الحق کی طرف سے انشاء اللہ تکمیل کو پہونچے گا، کوشش اس کی جاری ہے، احباب کو متوجہ کر رہا ہوں۔" والسلام ابرار الحق
>
> ۱۲ ر صفر ۷۷ھ

غالباً ۱۳۷۹ھ میں حیدر آباد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہوا، اس میں جماعت میں جانے کے لیے نام لکھوا کر مرکز نظام الدین پہونچے تو وہاں انہیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ انہی سے دریافت کیا کہ مجھے ہردوئی جانا ہے، اس کا راستہ اور ٹرینوں کے نام بتلائیے۔ مولاناؒ نے راستے اور سواریوں کی نشاندہی فرمائی تو اس کے مطابق ہردوئی پہونچے۔ یہاں پہونچ کر جب مدرسہ کے گیٹ میں داخل ہوئے تو ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر نووارد مہمان کا استقبال کیا، خیر خیریت اور تبادلۂ خیالات کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اپنے ہی علاقے کے رہنے والے مولوی حافظ عبد الغنی صاحب ہیں۔ پردیس میں دیس کے آدمیوں کا مل جانا بڑی خوشی ومحبت کا سبب ہوتا ہے، حضرت حاجی صاحبؒ بھی بہت مسرور ہوئے اور انہوں نے حضرت محی السنۃؒ کو اپنے علاقے

میں دعوۃ الحق کی شاخ قائم کرنے کے لیے درخواست دی تو اس میں یہ تجویز بھی رکھ دی کہ مولوی عبدالغنی صاحب ـــــ جو ہمارے ہی علاقے کے ہیں ـــــ کو طے کردیا جائے تو قیام مدرسہ میں سہولت رہے گی۔ حضرت محی السنۃؒ نے ان کی درخواست پر غور اور مشورہ کرکے یہ تحریری جواب مرحمت فرمایا:

''مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وہاں (حیدرآباد) کی مصالح کو مقدم رکھتے ہوئے سردست عارضی طور پر تین چار ماہ کے لیے مولوی عبدالغنی سلمہ کا تبادلہ آپ کے ہاں تجویز کیا گیا ہے۔ (آگے تنخواہ اور کرایہ وغیرہ کی شرائط ہیں کہ وہ بھی آپ کے ذمہ رہیں گے) اگر اس طرح کا معاملہ وہاں کے مصالح کے خلاف نہ ہو تو فوراً مصارف روانہ کیے جائیں۔.......... ورنہ فوری اطلاع کردیں۔'' والسلام

ابرارالحق ۱۱ربیع الاوّل ۱۳۹۷ھ

حاجی صاحبؒ وہاں سے واپس آگئے، گاؤں کے احباب ورفقاء سے مشاورت کی اور تائید حاصل کرنی چاہی مگر وہاں کے لوگ بجائے ہمت افزائی وتحسین اقدام کے الٹا کسر ہمت اور حوصلہ شکنی کی باتیں کرنے لگے، بلکہ بعض تو مخالفت پر اُتر آئے۔ البتہ جناب بشیرالدین صاحب نامی ایک ساتھی نے نہ صرف یہ کہ تائید کی بلکہ ہمت افزائی کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے شش وپنج کی سی صورتحال ہوگئی، ماحول سازگار کرنے کی فکر میں کافی وقت نکل گیا، تاآنکہ خود حضرت محی السنۃؒ کی جانب سے یہ مراسلہ پہونچ گیا:

''مکرمی! السلام علیکم

نقل خط سابق مرسل ہے، غالب خیال تھا کہ جواب اثبات میں آئے گا اور مصارف آتے ہوں گے، اسی لیے مولوی عبدالغنی صاحب کی جگہ کے لیے ایک صاحب کو دوسری جگہ سے بلالیا گیا تھا، اس کا بار مدرسہ پر پڑ رہا ہے، اجتماع (دعوۃ الحق) ۱۰راکتوبر کو ہے، اگر اس وقت اجراءِ مدرسہ کی

مصلحت نہ ہو تو بھی تار سے اطلاع کی جاوے، مضمون یہ کافی ہے ''ابرار الحق اشرف المدارس ہردوئی، عبد الغنی کو بھیج دیجئے'' اس تار کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ پرچہ محررہ کی سب باتیں منظور ہیں اور صرفہ منی آرڈر سے بھیجا جارہا ہے۔ اگر اس وقت اتنے مصارف کی گنجائش نہ ہو تو تار میں لکھ دیجئے کہ ''خط کا انتظار کریں'' اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ اجراءِ مدرسہ کی تجویز ملتوی ہے۔'' والسلام ابرار الحق ۲۹ ؍ ربیع الاوّل ۹۷ھ

حضرت محی السنۃؒ کی اس تحریر کا ایک ایک جملہ حسنِ انتظام اور مخاطب کی رعایت اور تسہیل کا عکاس ہے۔

اس مراسلہ سے حضرت حاجی صاحب بہت متفکر ہوئے اور جلد از جلد حضرت محی السنۃ کو مطلع کر دیا کہ اجراءِ مدرسہ کا ارادہ مصمم ہے، شرائط بھی منظور ہیں اور یہ کہ مولوی عبد الغنی صاحب کو بھیج دیا جائے۔

اس تار کے پہونچنے کے بعد حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ نے (والدِ ماجدؒ) مولوی عبد الغنی صاحب کو تیاری کرنے کی ہدایت دیدی اور وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو کر پہلے حیدر آباد پہونچے، بال بچوں کو یہاں چھوڑ کر ۲۷ ؍ ربیع الثانی ۹۷ھ کو سلاخ پور پہونچ گئے، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے یہیں پر کرایہ کی ایک عمارت حاصل کر کے یکم جمادی الاولیٰ سے مدرسہ کا آغاز کروا دیا، اس مدرسہ کی نوعیت اقامتی تھی، انہوں نے اپنے محسن و مربی جناب فیض الدین صاحب دوکاندار ــــــ جن کی رہبری و فکری تربیت نے انہیں دین کی یہ دیوانگی عطا کی تھی ــــــ کی نسبت سے ''فیض العلوم'' نام رکھنے کی رائے حضرت محی السنۃ کی خدمت میں پیش کی جو پسند فرمائی گئی۔ اس مدرسے میں طلبِ علم کے لیے سب سے قبل اپنے لختِ جگر مولانا احمد عبد اللہ طیب صاحب کو شریک کیا، پھر دور و نزدیک سے متعدد طلبہ نے داخلہ حاصل کیا، ابتدائی طالبِ علموں اور اوّلین حفاظ میں حافظ ثناء اللہ صاحب، حافظ زعیم الدین صاحب، حافظ غوث الدین صاحب، حافظ دولت النساء صاحبہ اور خود حاجی

صاحب کی صاحبزادی حافظہ نفیس صاحبہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مدرسوں وہ بھی اقامتی مدرسوں کا قیام آج بھی بڑا صبر اور حوصلہ شکن کام ہے، اُس زمانے میں جب کہ مدارسِ دینیہ کا تصور بھی دکن کے علاقے میں نادر تھا کتنا کچھ مشکل رہا ہوگا ہم اندازہ نہیں کر سکتے ہیں، اخراجات کی پابجائی کے لیے انہوں نے دوسری تدبیروں کے علاوہ ایک تدبیر یہ بھی نکالی کہ اپنی تجارت میں سے دوآنے مدرسہ کے لیے مختص کر دئے، اپنی اہلیہ محترمہ کو ایک خوشحال گھرانے کی خاتون ہونے کے باوجود کافی عرصے تک طلبہ کے پکوان کی خدمت سپرد کی، مختصر یہ کہ کسی نہ کسی طرح اجراءِ مدرسہ کی دیرینہ آرزو کو نباہتے رہے، تقریباً دو سال مختلف احوال سے گذرتے ہوئے مدرسہ فیض العلوم چلتا رہا، پھر وہاں سے ''مشتیال'' منتقل کر دیا گیا، لیکن ایک تو یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی، دوسرے مقامی لوگوں کا تعاون بھی میسر نہ آیا تو مدرسہ کو یہاں سے بھی منتقل کر کے ''جنگاؤں'' لایا گیا۔ یہاں بھی حالات سازگار نہ تھے، بالآخر یہ طئے پایا کہ حیدرآباد منتقل ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ حیدرآباد میں اس جگہ کا انتخاب عمل میں آیا جہاں اب تک مدرسہ فیض العلوم قائم اور فیض بیز ہے اور اللہ نے چاہا تو قیامت تک بافیض رہے گا۔ دیکھتے دیکھتے یہ مدرسہ علاقے کا نمایاں اور ممتاز مدرسہ بن گیا، خود دعوۃ الحق کے مدارس میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہو گیا تھا، حضرت محی السنۃؒ کی عنایت و توجہ اور بار بار کی تشریف آوری نے تو چار چاند لگا دئے، حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ کی اس مدرسہ کی جانب زیادہ توجہ اور خصوصی عنایات کا سبب انہی دو حضرات حضرت حاجی صاحب اور حضرت مولوی عبدالغنی صاحب رحمہما اللہ کا حضرت والا سے والہانہ اور عاشقانہ تعلق نیز ان کے ساتھ حاضراً و غائباً وفاداری و حق شناسی کا معاملہ ہے۔

حاجی صاحبؒ نے بہر حال اپنی پوری زندگی اس مدرسہ کے لیے وقف کر دی تھی، بعد میں تو اپنا کاروبار بھی ترک کر کے مدرسہ ہی کے ہو رہے، اپنے شیخ اور مدرسہ کے ناظم کے ساتھ پوری خیر خواہی اور وفاداری کرتے رہے، اطاعتِ کاملہ اور فرمانبرداری کے سامنے اپنی حیثیت و شخصیت کو قربان کر دیا۔ چاہتے تو وہ اپنے آپ کو بانی و ناظم کہہ کے حق جتا سکتے

تھے، مگر کبھی اس کا تصور بھی نہ کیا، مدرسے کے جس کام پر لگایا گیا لگ گئے، ہٹایا گیا ہٹ گئے، ان کے نزدیک شیخ کے حکم سے ناظم بننے اور جاروب کشی کرنے کے درمیان کوئی فرق نہ تھا، منصب ومرتبے پر نظر نہ تھی خوشنودیٔ شیخ مدنظر ہوا کرتی تھی۔ راقم کی زندگی کا بڑا حصہ تو فیض العلوم ہی میں گذرا، میں نے اپنی آنکھوں سے مدرسہ فیض العلوم میں انہیں مستنظم کی حیثیت سے بھی دیکھا، محاسبی کرتے ہوئے بھی دیکھا، طلبہ کے نگران کے طور پر بھی نظر آئے، سفارت کا کام کرتے بھی دکھائی دئے۔

واقعی جب آدمی رضائے الٰہی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصود نہیں ہوتا تو پھر اس کے لیے سب کچھ آسان ہوجاتا ہے، ان کی زندگی کا یہ وصف وہ خاص وصف ہے جو پہلے بھی خال خال ہی نظر آتا تھا اب تو عنقا ہے۔ حاجی صاحبؒ کے تعارف وتذکرہ میں ان کے روحانی مقام کو سمجھنے کے لیے یہی ایک وصف کافی ہے، کیونکہ تمام صفاتِ حسنہ کی تخلیق اسی فنائیت وبے خودی کے بیج سے ہوتی ہے۔ پھر بھی چند صفات کا سرسری تذکرہ کیا جاتا ہے، واقعات وتجربات کی روشنی میں صاحبزادگان زیدمجدہما ان کے حالات وصفات پر اگر تفصیلی مضمون لکھیں تو خدامِ دین اور سالکین کے لیے بہت کام کی چیز ہوگی۔

حاجی صاحب رحمہ اللہ اتباعِ سنت کے معاملے میں اپنے شیخ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، کسی معاملے میں خلافِ سنت بلکہ خلافِ مسلک بھی ان کو گوارا نہ تھا، اگر ایسی کوئی بات پیش آتی تو ڈٹ جاتے پھر اس میں کسی کی رورعایت گوارا نہ فرماتے تھے، حضرت محی السنۃؒ سے تعلق کا ابھی ابتدائی دور ہی تھا جب کہ ان کی صاحبزادی نکاح کے قابل ہوئیں، دین ودیانت کی بنیاد پر رشتہ طے کیا اور انتہائی سادگی سے شادی کردی، حتی کہ رخصتی کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہ سمجھی، فیض العلوم کے طلبہ کو منتقل کرنے کے لیے جو بس حیدرآباد آرہی تھی اسی میں پیچھے اپنی دلہن بیٹی کو بٹھا کر روانہ کردیا، اسی طرح اپنے دوسرے بچوں اور اپنے قریبی اعزہ کے نکاحوں میں بھی اپنا موقف برقرار رکھا۔ رسوم ورواج سے کوسوں دور تھے بلکہ ایسی جگہوں اور تقریبوں میں کسی نے ان کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔

نماز کا بڑا اہتمام تھا، ظاہر ہے کہ جو دیگر سنن کا اتنا پابند ہوگا وہ نماز میں کیسے غفلت برت سکتا ہے؟ ایک تو نماز کی پابندی ہے اور ایک نمازوں کا خشوع وخضوع اور سنن ونوافل کے اہتمام کے ساتھ ادا کرنا ہے، حاجی صاحبؒ کو اللہ پاک نے دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ نماز کی تکمیل طہارت کی تکمیل پر موقوف ہے، وہ مسئلہ طہارت میں بھی پچھلے بزرگوں کے ہم مزاج اور ورع وتقویٰ کے رمز شناس تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور معمولاتِ سلسلہ کی پابندی بھی بہت تھی، تہجد گذار اور سحر خیز تھے، دعا دل لگا کر اور عبدیت وانابت کے ساتھ کیا کرتے تھے، اخیر عمر میں گریہ وبکاء کا غلبہ ہو گیا تھا، جو ملتا اس کو ڈھیر ساری دعائیں دیتے اور خود اس سے دعا کی درخواست بڑی لجاجت سے فرمایا کرتے تھے۔ ہم لوگوں سے بڑی محبت فرماتے تھے، ملاقات پر خوش ہوتے تھے، رونے لگتے تھے، بار بار یہ کہتے رہتے کہ آپ کے والد صاحب میرے استاذ ہیں، خدمات پر خوشنودی کا اظہار کرتے اور دعاؤں سے سرفراز کیا کرتے تھے، ایک دفعہ تو اصرار کر کے اسی حالت میں بچوں کے ہمراہ خود ہی مدرسہ پہونچ گئے جب کہ اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہو رہا تھا، بہت دعائیں دی اور فوراً واپس ہو گئے۔

اکل حلال کا زندگی بھر اہتمام کیا، معاملات کی صفائی اور معاشرت میں اتباعِ سنت اور حقوقِ اسلامی کا لحاظ فرمایا کرتے تھے، جس زمانے میں مدرسہ کے لیے وصولی سرمایہ کا کام کرتے تھے بمبئی وغیرہ کے علاقوں میں جانا ہوتا تھا، معرفت وپہچان کی وجہ سے بعض حضرات سے ہدایا مل جایا کرتے تھے تو انہیں اس وقت تک استعمال نہیں کرتے تھے جب تک کہ اپنے شیخ اور مدرسے کے ناظم حضرت محی السنۃؒ کو مطلع کر کے حکم نہ معلوم کرلیں، وہاں سے اجازت ملنے کے بعد اپنے لیے جائز سمجھتے تھے۔ شخصی زندگی میں زہد وتقشّف کا غلبہ تھا، اخیر عمر میں مدرسہ فیض العلوم سے چند سو روپئے وظیفہ مل جاتا تھا، بس کے کرایہ پر جو صرف ہو جاتی صرف کر کے بقیہ رقم دونوں بچوں کو ہدیہ کر دیتے تھے، اسے بھی اپنے پاس رکھنا گوارا نہ تھا۔ بقدرِ ضرورت لباس پر اکتفاء کرتے تھے، بچے اگر سلوا بھی دیتے تو خفا ہوتے تھے کہ مرنے والا ہوں کیوں پیسہ ضائع کرتے ہو، دوا بھی زیادہ مقدار میں لا کر رکھنے کو بے ضرورت سمجھتے

تھے کہ کہیں مرنے کے بعد بے کار نہ ہو جائے۔ عمر کے اخیر دس سال میں معلوم ہوا کہ اپنی ملکیت میں کوئی چیز نہیں رکھی ہوئی تھی۔

اپنے بچوں کے لیے دینی علم سے آراستہ کرنے کا جہاں اہتمام کیا وہیں انہیں طریقت وتصوف سے وابستہ رکھنے کی بھی بڑی فکر فرماتے رہے۔ انہیں اللہ پاک نے تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا فرمائی تھی، بڑے لڑکے مولانا احمد عبداللہ طیب صاحب مدظلہٗ ہیں جو فیض العلوم کے ابتدائی طلبہ اور میرے والدِ ماجد کے چہیتے تلامذہ میں سے ہیں، ابتدائی درسیات ہردوئی میں پڑھیں پھر باندہ گئے اور فراغت دارالعلوم دیوبند سے کی۔ سلوک وتربیت حضرت باندوی رحمہ اللہ کے زیر نگرانی طئے کی، حضرت باندوی رحمہ اللہ اور شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب مدظلہٗ سے اجازت وخلافت رکھتے ہیں، ماشاء اللہ بافیض عالم دین ہیں، تعلیمی واصلاحی دونوں سلسلے جاری ہیں۔ دوسرے صاحبزادے میرے رفیق درس حافظ قاری عبیداللہ طاہر مرحوم ہیں جو جواں عمری میں یرقان کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے، خوش الحان قاری ونعت خواں تھے۔ تیسرے صاحبزادے مولانا احمد عبیدالرحمن اطہر ہیں جن کی ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن مدرسہ فیض العلوم میں ہوا پھر دارالعلوم حیدرآباد میں کچھ دن پڑھا، وہاں سے باندہ گئے، دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عربی ادب کی سند حاصل کی۔

انہیں ابتداءً تصوف وسلوک سے مناسبت کم تھی، حضرت حاجی صاحبؒ کو اس کی بڑی فکر لاحق تھی، بزرگوں سے دعائیں کرواتے اور خود تڑپتے رہے توجہ دلاتے رہے، ''بنیادِ اصلاح'' نامی رسالہ جس میں تزکیہ وسلوک کی اہمیت سے متعلق اہم مضامین ہیں انہی کی خاطر سے جمع کیا تھا، بہرحال ان کی فکر دعائیں اور جستجو رنگ لائی اور مولانا کا قلبی رجحان مشائخ سلسلہ کی طرف ہوا۔ حضرت حکیم اختر صاحبؒ کی کتب سے متاثر ہوئے، ان سے بیعت کی، پھر باندہ میں تعلیم کے دوران حضرت باندوی رحمہ اللہ سے رجوع رہے، فراغت کے پانچ برس بعد حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ سے وابستہ ہو گئے اور ماشاء اللہ خوب ترقی کی، حضرت حکیم

کلیم اللہ صاحب مدظلہٗ نے اجازت عطا کی، اس وقت مدرسہ امداد العلوم حیدرآباد کے ناظم، مسجد ٹین پوش کے خطیب ہیں۔

شہر بلکہ ریاست میں ان کا بھی تعلیمی و اصلاحی فیض جاری ہے۔ اخیر عمر میں حاجی صاحبؒ انہی کے گھر رہ گئے تھے، وہیں سے دواخانہ منتقل کئے گئے تھے جہاں سے زندہ واپس نہ آسکے۔ حاجی صاحبؒ کی صاحبزادی صاحبہ بھی مدرسہ فیض العلوم کی پہلی حافظہ میرے والدِ ماجد کی تلمیذہ اور میرے ماموں مولانا حافظ سید حماد بن ذکی کی اہلیہ اور متعدد حفاظ کی والدہ سعیدہ ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ سے دعا ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی مغفرت فرما کر ان کے درجات کو بلند فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل کے ساتھ ان کی دکھائی ہوئی راہِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محترم نواب باقر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

محترم نواب محمد باقر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، نواب صاحب نوابان حیدرآباد میں ایک اہم مقام رکھتے تھے، ان کے والد گرامی نواب محمد عبدالباسط رحمۃ اللہ علیہ صوبیدار سابق ریاست دکن علم پرور اور علماء نواز آدمی تھے، حکومتِ حیدرآباد کی جانب سے باسط یار جنگ کا خطاب پایا تھا، اسی سے معروف تھے، ریاست کی جانب سے دارالعلوم دیوبند کے رکنِ شوریٰ تھے، ان کی کوٹھی حیدرآباد میں اکابر دارالعلوم کی فرودگاہ اور مستقل مہمان خانہ بنا ہوا تھا؛ راقم سطور نے انہیں تو نہیں دیکھا مگر نواب باقر خان صاحب کو اپنے بچپن سے اس عمر تک دیکھتا رہا، مرحوم نوابانہ شان وشوکت کے حامل تھے، انتہائی وجیہ، لحیم وشحیم خوب رو اور بارعب شخصیت کے حامل تھے؛ ہمارے بچپن میں وہ حیدرآباد کی سیاست میں بھی دخیل تھے، کارپوریشن بھی لڑا تھا، عصری تعلیم یافتہ تھے، دین کا بھی قابل لحاظ علم تھا، پہلے سوٹ بوٹ میں ملبوس اور کروفر سے رہا کرتے تھے، پھر محی السنہ حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے وابستگی کے بعد یہ شان دینی وجاہت سے بدل گئی تھی؛ ان کے والد اور دادا کا چونکہ دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے علماء سے گہرا تعلق تھا، اسی لئے نواب صاحب مرحوم بھی ان علماء کے بہت ہی قدرداں اور ان کے خدمت گذار تھے، کوٹھی کا ایک حصہ گویا اکابر ہی کے لئے مخصوص تھا؛ حافظ محمد احمد ابن حجۃ الاسلام نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے والد کے گہرے مراسم تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس گھر میں قدم رنجہ فرما چکے تھے، خود میں نے حکیم الاسلام حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، قطب الاقطاب حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، رئیس التبلیغ حضرت مولانا ارشاد احمد

صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مفسر قرآن حضرت مولانا محمد نعیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، داعیٔ حق حضرت محمد پالن حقانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد سالم صاحب وحضرت مولانا محمد اسلم صاحب مدظلہما، حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بیسیوں اکابر کوان کی کوٹھی میں قیام پذیر دیکھا، محی السنہ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تو ــــ مدرسہ فیض العلوم کا مہمان خانہ بننے سے قبل تک ــــ ہمیشہ انہی کے ہاں قیام رہا، بلکہ اس کے بعد بھی ان کے شکوے پر ایک مرتبہ اور ان کے ہاں قیام کیا۔

ان کا عظیم الشان بنگلہ اپنی تعمیر اور خوبصورتی کے اعتبار سے علاقے میں ممتاز مانا جاتا تھا، نہایت ہی خوشنما محل عظیم الشان باغات سے گھرا ہوا اور قیمتی اشیاء سے سجا ہوا تھا، دسیوں نوکر کام کرتے تھے، جب موٹریں شاید وباید تھیں تب نواب صاحب موٹرنشین تھے، بنگلے کا دالان ہمیشہ واردین وصادرین سے آباد رہتا تھا، وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی تو بنگلے کے سامنے موٹروں کی دوطرفہ قطاریں لگ جاتی تھی، جوان کے دولتمند خانوادے اور ذی اثر حلقۂ احباب کا ثبوت پیش کرتی تھیں۔

جب مدرسہ فیض العلوم ورنگل سے حیدرآباد منتقل ہوا، اس سے قبل ذمہ داران مدرسہ حیدرآباد میں مناسب جگہ کی تلاش کررہے تھے، کئی جگہوں میں سے اس گھر کا انتخاب کیا گیا جونواب صاحب کا آبائی مکان تھا اور موجودہ محل میں منتقل ہوجانے کی وجہ سے ویران پڑا ہوا تھا، مگر ان کی باؤنڈری کے اندر ہی تھا؛ ان سے اس سلسلہ میں بات کی گئی توانہوں نے ماہانہ غالباً سوروپے کرایہ پر مدرسہ کو دیدیا، چنانچہ اسی میں مدرسہ فیض العلوم منتقل ہوکر کام کرنے لگا، مدرسہ والوں نے منتقلی کے اخراجات وغیرہ کے مدنظر کرایہ کی ادائیگی کے لئے دوماہ کا وقت حاصل کرلیا تھا، دوماہ کے بعد جب کرایہ لے کر ذمہ داران مدرسہ ان کے پاس پہونچے تو ــــ وہ مدرسہ کے نظام اور طلبہ کے ماحول سے اس قدر متاثر تھے کہ ــــ انہوں نے کرایہ لینے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ ایسے اچھے کام کا ہونا میری اور میرے گھر کی سعادت وخوش بختی ہے، میں اس کا کوئی کرایہ اور معاوضہ نہیں لوں گا؛ یہی نہیں اس پورے مکان کو جو

متعدد بڑے بڑے ہالوں، حجروں، صحن اور چھوٹے چھوٹے علاحدہ مکانات پر مشتمل تھا مدرسہ کے لئے للہ وقف فرمادیا، کچھ عرصے بعد اس عمارت اور اپنے بنگلے کے درمیان جتنی جگہ تھی وہ بھی مدرسہ کے لئے وقف کر دی، اسی اثناء میں ان کے بہنوئی کو جائدادی مخاصمت میں شہید کر دیا گیا تو بہن کی زمین جو مدرسہ سے متصل تھی مسجد کے لئے وقف کروادی، اس کے علاوہ بھی تابہ حد مقدور مدرسہ کی ہر طرح سرپرستی کرتے رہے، کمال یہ ہے کہ اتنی بڑی جائداد جو اسوقت بھی وقیع تھی اور آج تو بیسیوں کروڑ کی ہوگئی ہے اپنی طرف سے مدرسہ کو ہبہ کر دینے کے باوجود کبھی مدرسہ کی تولیت یا اس میں شرکت کا دعویٰ نہ فرمایا اور نہ کبھی اس کے داخلی وانتظامی معاملات میں ادنیٰ مداخلت کو گوارا کیا، جو اس دورِ خودنمائی وخودغرضی میں خلوص وللٰہیت کی نادر مثال ہے۔

مدرسہ سے تعلق کے بعد جب حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی حیدرآباد تشریف آوری ہوئی تو انہیں بصد احترام اپنا مہمان بنایا، ان کے دست حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور عمر بھر ان کی غلامی وخدمت کو سعادت سمجھتے رہے؛ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ سب جانتے ہیں کہ نہایت ہی اصول پسند اور حساس مزاج تھے، ادنی بے اصولی وبے تہذیبی کے روادار نہ تھے، ادھر یہ مرید ریاست ونوابیت کا پروردہ، زمیندار اور خودمختار تھا مگر مجال تھی کہ کبھی شیخ کے سامنے بھی اس کا اظہار ہو جائے؟ بلکہ اس کے برعکس کبھی نواب صاحب سے معاملت وخدمت میں بے اصولی ہو جاتی ــــــ اگرچیکہ حضرت حفظ مراتب کا برا لحاظ رکھتے تھے ــــــ تربیت واصلاح کی خاطر اس نواب مرید پر اچھی خاصی ڈانٹ پڑ جاتی اور بسا اوقات تو برسر عام ماخوذ کئے جاتے تھے؛ ایسے وقت میں نے اپنی آنکھوں سے نواب صاحب مرحوم کو اشکبار آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے قدم پکڑ کر معذرت کرتے ہوئے دیکھا ہے؛ اللہ اکبر! للٰہیت وبے نفسی کا کیا عالم تھا، آج اچھے اچھے اہل علم واہلِ صلاح میں حوصلہ نہیں رہ گیا ہے کہ اس قدر فنافی الشیخ ہو جائیں، اور اہل علم وکمال تو پھر بھی اسبابِ کبر رکھتے ہیں معمولی اور بے حیثیت مرید بھی آج اپنی مریدیت کو شیخ پر احسانِ عظیم سمجھ رہا ہے، فالی

اللہ المشتکی !

ایک مرتبہ نواب صاحب نے ''پارکر پن'' کا بہت قیمتی سیٹ ـــــــ جو اس زمانے میں امراء ورؤساء کے جیبوں کی زینت ہوا کرتا تھا ـــــــ حضرت کو بڑے احترام کے ساتھ پیش کیا مگر موقع مناسب نہ تھا، حضرت والا نے خفگی کے ساتھ رد فرمادیا کہ جب ہدیے کے آداب نہیں معلوم اور تہذیب نہیں تو ضرورت کیا ہے ہدیہ دینے کی، پہلے آداب سیکھنے کی فکر کریں، نواب صاحب نے قطعاً خفت وسبکی محسوس نہ کی، دوسرے وقت تحریر لے کر آئے کہ میری بے تہذیبی سے حضرت کو ناراضگی ہوئی عفو ودرگذر کا خواستگار ہوں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پھر دلداری کے کلمات فرمائے اور سینے سے لگایا۔

ایک مرتبہ وہ حضرت کو لینے کیلئے اپنی گاڑی لے کر ریلوے اسٹیشن پہونچے، حضرت والا سے قبل وہ بعض اور لوگوں کو پیچھے بیٹھ جانے کے لئے کہہ رہے تھے، حضرت ناراض ہوئے اور فرمایا میرے ساتھ سواری میں کون ہوگا وہ میں طئے کروں گا، آپ کو کیا حق ہیکہ میرے رفقاء کی تعیین کریں، آپ کی سواری میں نے تو نہیں منگوائی تھی، آپ لائے ہیں تو میری مرضی کے مطابق استعمال ہوگی، فوراً غلطی کا اعتراف کر کے معذرت پیش کی، سبحان اللہ! یہ تھے نواب باقر خان۔

حالانکہ ان کی نوابیت وریاست کا یہ عالم تھا کہ پٹرول پمپ پر جاتے تو سیٹ نہ چھوڑتے، سیٹھ دوڑتا ہوا آتا اور خود ہی سب کام کر کے سلوٹ مارتا تھا، دوکان پر جوتا خریدنے جاتے تو اسٹیئرینگ بھی نہ چھوڑتے تھے، سیٹھ خود موٹر پر لاکر جوتے پہناتا تھا، کبھی نوٹ دیکر بقیہ رقم واپس نہ لیتے تھے، بڑی سخاوت اور داد ودہش تھی؛ غیر مسلم ہاتھ جوڑتے اور پولیس والے اٹھ کر کھڑے ہوتے تھے، اس زمانے میں اور ان حالات میں ان کا اپنے شیخ کے سامنے اپنے آپ کو مٹانا اور فنا کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا، بڑے دل گردے کی بات تھی! بالآخر شیخ نے بھی اس فنائیت اور پختگیٔ فکر وعمل کو سند اعتبار بخشتے ہوئے انہیں اپنی طرف سے اجازتِ صحبت عطا کی کہ ان کی صحبت ورفاقت طالبانِ اصلاح کے لئے مفید ہے۔

میرے بچپن کی بات ہے کہ وہ ایک خط لے کر مدرسہ میں حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے مولانا! میں نے حضرت کو خط لکھا تھا جواب آیا ہے مگر حضرت کا خط شکستہ مجھ سے پڑھا نہیں جا رہا ہے، آپ پڑھ کر سنا دیجئے؛ اس خط میں ان کی باتوں کے جواب کے علاوہ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی تحریر کیا تھا ''مکرمی نواب صاحب، السلام علیکم، ایک بات آپ سے یہ دریافت کرنی ہے کہ آپ کے چہرہ پر نور نبوت کا کب ظہور ہوگا؟'' مولانا نے پڑھ کر سنایا اور بتلایا کہ حضرت داڑھی کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں، انہوں نے کہا، اچھا اب تو رکھنا ہی ہوگا، وہیں ارادہ کیا اور عمر بھر مسنون داڑھی رکھے رہے، ان کی نوابانہ تہذیب میں اور مخصوص ماحول میں ابتداءً وہ داڑھی خود ان کے گھر میں موضوعِ مذاق بنتی اور بے احترامی کا شکار ہوتی رہی مگر یہ بندہ ایسا باعزم وحوصلہ تھا کہ ذرا متاثر نہ ہوا۔

نواب صاحب کا کوئی کاروبار نہ تھا بے حساب زمینوں کے مالک تھے، فروخت کر کے عیش وآرام سے زندگی گذارتے تھے، دھیرے دھیرے زمینیں بھی ختم ہوگئیں، جورہ گئیں وہ مقدمات ومسائل میں پھنس گئیں، تو نواب صاحب مرحوم پر تنگدستی نے قبضہ کیا، وہ وقت بھی آیا کہ اپنی عظیم الشان کوٹھی گورنمنٹ کو کرایہ پر دے کر کسی دوسرے محلے میں معمولی گھر کرایہ پر لے کر گذر اوقات کرنی پڑی؛ اگرچہ زیادہ دن یہ صورتِ حال نہ رہی، آسائش وفراخی کی راہیں کھلیں مگر ہماری آنکھوں نے اس اللہ کے بندے کے دونوں حال دیکھے اور دونوں حالات میں وہ راضی بہ رضا اور متوکل برخدا رہے، ان مشکلات ومصائب میں ان کی دینداری اور خدا پرستی پر آنچ آنے نہیں پائی، کبھی ان کی زبان سے شکوہ وشکایت سامنے نہ آئی۔

سردیوں کے موسم میں ان کا دماغی توازن بگڑ جاتا تھا، کبھی زیادہ ہی سیریس ہوجاتے تھے، مگر نمازوں کا اہتمام اور معاملات معاشرت کی صفائی برقرار رہتی تھی، ایک دفعہ ایسی ہی کیفیت میں آٹو میں بیٹھ کر میرے پاس آئے اور کھڑے کھڑے ہی کہا کہ سو روپئے دیجئے، اتنے بڑے آدمی کا یہ مطالبہ کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، میں نے فوراً نکال کر دیدئے، ان کے علو

مقام کے مدنظر کبھی انہیں یاد بھی نہیں دلایا واپس لینے کا ارادہ بھی نہیں تھا، تقریباً ایک سال بعد وہ مدرسہ آئے، جیب سے سو روپئے نکال کر دیئے کہ یہ آپ رکھ لیجئے، بعد میں بات کروں گا، فون پر بتلایا کہ یہ وہی مستعار لی ہوئی رقم ہے۔

لکھنے کو بہت سی باتیں ہیں مگر فرصت وہمت اجازت نہیں دیتی، عبرت حاصل کرنے کو ان کی زندگی کا یہ مختصر سا تعارف بھی بہت ہے؛ نواب صاحب کا ۱۹ر ستمبر ۱۲ء جمعہ کے دن صبح ۱۰ بجے انتقال ہوا، اسی دن بعد نمازِ مغرب مدرسہ فیض العلوم کے صحن میں طلبہ واساتذہ عوام وخواص کے ایک بڑے مجمع نے نمازِ جنازہ ادا کر کے ان کے آبائی قبرستان واقع ریاست نگر میں سپرد خاک کیا، وصیت تھی کہ نمازِ جنازہ کی صفِ اول میں طلبۂ مدرسہ ہوں۔

اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے، سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے۔ آمین

استاذی الشفیق الکریم

حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب

الی رحمۃ اللہ![1]

مسند احمد (۴/۱۸۸) میں ہے کہ دو دیہاتی مسلمان نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے یہ سوال کیا کہ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ؟ سب سے اچھا آدمی کون ہے؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: طُوْبىٰ لِمَنْ طَالَ عُمْرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ "خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی عمر لمبی اور اعمال اچھے ہوں" حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ قریب سے اور غور سے دیکھنے والے ہر شخص کے نزدیک اس ارشادِ مبارک کی اس دور میں بہترین تعبیر اور عملی تفسیر کہے جا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی لمبی عمر اور بہت پیاری زندگی نصیب فرمائی تھی، بلا شبہ ان کی زندگی لَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً کا مظہر تھی۔

یہ تو قارئین اشرف الجرائد کو معلوم ہی ہو چکا کہ استاذ الاساتذہ، شیخ المشائخ، نمونۂ اسلاف اور قدوۂ اخلاف حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب مظاہری رحمۃ اللہ علیہ، خلیفۂ اجل شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ یکم ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۴ر فروری

(۱) اس عاجز نے اس مضمون میں شخصی و خانگی تعلقات کا ہی ذکر کیا ہے، مستقلاً حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات وصفات سے بحث نہیں کی ہے، میں اس کا اہل بھی نہیں، البتہ ان باتوں اور یادوں میں سے بھی ان شاء اللہ ان کی شخصیت جھلکے گی اور ان کی بہت سی صفات وخصوصیات نظر آئینگی، منشا بھی یہی ہے۔

۲۰۱۲ء شب جمعہ کی پچھلی پہر انابت وخشیت اوراذ کار وادعیہ کے مستحسن شغل کے دوران اس دارِفانی کو چھوڑ کر اپنے خدا اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ إناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ مستند عالمِ دین، قاریٔ کلامِ مبین، شیخِ طریقت اور معلمِ کتاب وسنت تھے، بہار کے قصبۂ سیوان میں پیدا ہوئے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں نابغۂ روزگار اساتذہ سے علومِ دینیہ اسلامیہ کی تکمیل کی، وہیں پر فن تجوید وقرأت میں مہارت حاصل کی، جامع مسجد ہردوئی میں اپنے اساتذہ کے مشورہ سے امام کی حیثیت سے تشریف لائے، پھر محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش پر مدرسہ اشرف المدارس منتقل ہوئے اور تادمِ واپسیں اسی ادارے سے وابستہ رہے؛ مستقل شیخ طریقت اور ہزاروں معتقدین کے محبوب مقتدا ہونے کے باوجود ستر برس تک کسی اور معاصر شیخ کے ماتحت رہ کر نہ صرف کام کرنا بلکہ ایک عام ملازم کی طرح پابندِ احکام وہدایت بن کر رہنا حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عظیم کرامت اور خلوص وللٰہیت کی نادر علامت ہے۔

تدریس میں وہ اپنی نوعیت کے منفرد مدرس تھے، ہزاروں تلامذہ نے ان سے علم حاصل کیا، اور بڑے بڑے مراتب پر پہونچے، ان کے شاگردوں میں سینکڑوں شاگردِ دین کے بڑے بڑے کام انجام دے رہے ہیں اور نام ور خدمات میں لگے ہوئے ہیں، مگر وہ شروع سے اخیر تک ابتدائی عربی وفارسی کی کتابیں ہی پڑھاتے رہے، یہ ان کی دیانت وامانت کی بات تھی کہ بڑی سے بڑی کتابیں پڑھانے کے مواقع بلکہ مطالبوں کے باوجود حق ادا کرنے کا اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کرتے تھے، جس کام کا حق ادا کرنے کا انہیں یقین نہ ہوتا وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تھے۔

علم ظاہر کی تکمیل کے ساتھ ساتھ نورِ باطن کی تحصیل کی فکر بھی شروع ہی سے لگی ہوئی تھی، طالبِ علمی ہی کے زمانے میں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے تھے، ان کے وصال کے بعد برکۃ العصر اور مجمع بحار السلاسل شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے رجوع ہوئے، سلوک وطریقت کی اصل ''خودکشی وفنائیتِ نفس کا

ملکہ اور ذکر و حضوری کا مرتبہ حاصل ہو جانا'' ہے، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ کے فضل سے دونوں مقامات بتمامہٖ وکمالہٖ حاصل تھے، اس کی شہادت اصاغر و معاصر تو کیا ان کے اکابر نے بھی دے دی تھی۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

ایک عرصے تک انہوں نے درس وتدریس کے لبادے میں اپنے کو مستور رکھا؛ لیکن جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اللہ رب العزت نے انہیں شہرت کی چادر اڑھا کر عوام وخواص کا مرجع بنا دیا، قبولیتِ عامہ حاصل ہوئی، ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے مختلف ممالک میں آپ کا فیض عام ہوا اور آپ کے سلسلہ کے ذریعہ ان شاء اللہ آئندہ بھی ہوتا رہے گا؛ تمام اہلِ حق کیا علماء اور کیا عوام سب ہی ان کے قدرداں تھے اور ان سے سچی محبت رکھتے تھے یہ محبوبیتِ ارضی حدیث کے مطابق امید ہے کہ قبولیتِ عرشی ہی کا ثمرہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات کو بلند سے بلندتر فرمائے۔ آمین

آخر میں قارئین کرام سے معذرت ہے کہ بہت سے احباب کی اس فرمائش کو کہ یہ عاجز حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھے۔ اپنی مصروفیات اور کثرتِ اسفار اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی نااہلی ونالائقی کی وجہ سے پورا نہ کرسکا؛ البتہ خانگی تعلقات اور شخصی احسانات پر مشتمل کچھ واقعات متفرق طور پر جو ذہن میں آتے گئے سپردِ قرطاس کرکے ہدیۂ ناظرین کررہا ہوں، ممکن ہے کسی کو اس سے نفع ہو جائے۔ یہ عاجز تو اپنے مایۂ ناز وتاریخ ساز اکابرین کی کچھ قدر کرسکا نہ کچھ زیادہ سیکھ سکا۔ إنما أشکو بثی وحزنی إلی اللہ، البتہ ان بزرگوں سے سچی عقیدت وقلبی محبت ضرور نصیب ہے۔ وللہ در القائل

أحب الصالحین ولست منهم

لعل اللہ یرزقنی صلاحا

اب سن وتو بالکل یاد نہیں مگر منظر آنکھوں میں اب بھی گھوم رہا ہے کہ اب سے تقریباً پچاس سال قبل جب کہ اس عاجز کی عمر پانچ سات سال کی رہی ہوگی مدرسہ فیض العلوم میں حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لانے والے تھے، گھر میں مدرسہ

میں سب طرف اسی کے چرچے تھے، کھانے کا نظم چونکہ ہمارے گھر میں ہوا کرتا تھا اس کی بھی بڑی زور شور سے تیاریاں چل رہی تھیں، ایک عید اور جشن کا سماں تھا۔ والدہ نے ایک دن مجھے تیار کر کے اور ادب سلیقے کی تلقین کر کے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بھیج دیا جو بالکل بازو کے کمرہ میں چل رہی تھی۔ گفتگو کی تفصیل تو زیادہ محفوظ نہیں۔ جو منظر محفوظ ہے وہ یہ کہ ایک بڑا سا ہال جس میں بالکل نیا اور خوبصورت فرش کیا گیا تھا، درمیان میں ایک چار پائی جس پر ایک دم سفید بستر بچھا ہوا تھا، اس کے ایک طرف ٹیبل فیان رکھا ہوا تھا (جو میرے لیے بالکل نئی چیز تھی) اس چار پائی کے سامنے سفید غلاف چڑھے ہوئے گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر ایک نہایت ہی حسین وجمیل اور بارعب شخصیت تشریف فرما تھی۔ یہ حضرت محی السنہ شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کے سامنے چند معتبر لوگوں کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی، میں چونکہ کم سن تھا اور کم سنوں کو گویا باریابی کا اذنِ عام یا حق لازم حاصل ہوتا ہے اس لیے اس شاہی دربار میں براہِ راست پہونچ گیا تھا، ان حاضرین مجلس میں شہ نشین کے سرہانے ایک گورے چٹے ضخیم وعظیم اور بلند قامت بزرگ تشریف فرما تھے، پائنتی کی طرف بالکل لاغر ونحیف مگر انتہائی حسین وجمیل شخصیت دوزانو اور بالکل سکڑ کر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے بادشاہ کے دربار میں کوئی مجرم! پہلی شخصیت حضرت حبیب الحسن حنان شروانی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی (۱) اور دوسری حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی۔ مجھے اس دوسرے سراپا میں بڑی کشش وجاذبیت محسوس ہوئی، انہیں کے قریب بیٹھ کر مزید قریب ہونے کی کوشش کرتا رہا، اس چھوٹی سی عمر میں اظہارِ محبت کا طریقہ کیا جانتا، بس نزدیک جا کر پیروں

(۱) حضرت شروانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۱۴-۱۹۷۳) افغانی النسل رئیس ڈھولنہ تھے، یہ علاقہ ان کی موروثی ریاست تھا، انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بزرگوں سے بڑا تعلق تھا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چار خلفاء سے یکے بعد دیگرے تربیت پائی تھی، ان میں سے حضرت شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت بھی عطا فرمائی تھی، حضرت محی السنہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت قریبی تعلق تھا، اس عاجز نے بس اسی سفر حیدرآباد میں پہلی اور آخری دفعہ انہیں دیکھا، کم سنی کے باوجود ایک خدمت کا تین دن تک موقعہ ملا، حضرت شروانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان دنوں صرف چنے کے آٹے کی ایک عدد روٹی کھاتے تھے، یہ آٹا ان کے ساتھ ایک ڈبے میں تھا، ایک روٹی کی بقدر آٹا خود اپنے ہاتھ سے نکال کر دیا کرتے تھے، ←

کو چھوتا اور انگوٹھے کو دبا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا، انہوں نے پہلی دفعہ تو پلٹ کر دیکھا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور اسی طرح مجسمۂ تہذیب وادب بنے بیٹھے رہے۔ خیر! میں تھوڑی دیر بیٹھ کر وہاں سے سرک لیا، پھر کیا ہوا معلوم نہیں۔ حضرت محی السنہ کے چند روزہ اس قیام میں حضرت قاری صاحب بہت کم نظر آئے، ممکن ہے امتحانات میں مصروف کر دئے گئے ہوں، البتہ روانگی کے دن کا ایک واقعہ اور یاد رہ گیا، وہ یہ کہ مدرسہ والوں نے کوئی رقم حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کو پیش کی، (کرایہ وغیرہ ہوگا) حضرت نے اسے اپنی صدری میں اندرونی جیب میں رکھا، پھر وہ صدری حضرت قاری صاحب کو یہ کہتے ہوئے دی کہ ''قاری صاحب! آپ اس پر نظر رکھیں'' پھر مسکراتے ہوئے حضرت شیروانی صاحب سے فرمایا ''ہم قاری صاحب پر نظر رکھیں گے'' سب لوگ ہنس پڑے، مجھے ان جملوں کی حقیقت وحلاوت بہت بعد میں ملی۔

یہ تھی حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی یادداشت کے مطابق سب سے پہلی زیارت وملاقات کی ایک دھندلی سی جھلک! اور آخری ملاقات اس وقت مقدر ہوئی جب کہ آپ اِسی سال حج سے قبل حیدرآباد تشریف لائے ہوئے تھے، صحت انتہائی ناساز اور ضعف ونقاہت قابلِ رحم حد تک تھی، معلوم ہوا کہ ملاقات سے بھی منتظمین نے ممانعت کر رکھی ہے،

← والدہ پلیٹ دے کر بھیجتیں تو میں لے کر آتا تھا، اس خدمت کا فائدہ یہ ہوا کہ جس دن واپسی ہو رہی تھی اور سب لوگ موٹر میں بیٹھ چکے تھے، میں مجمع کے بیچ میں سے جھانک کر یہ منظر دیکھ رہا تھا، اتنے میں حضرت کی نظر پڑ گئی اور موٹر سے اُتر کر قریب آئے، بہت کیم شحیم بلند وبالا قد کے آدمی تھے، مجھے اٹھا کر سینے سے لگایا محبت کے کلمات فرمائے اور دعائیں دی۔ الحمد للہ ولا فخر۔ کافی عرصہ کے بعد جب میں فیض العلوم میں پڑھاتا تھا استاذِ محترم حضرت حافظ اسحاق صاحب مدظلہ اپنے ساتھ ڈھولنہ لے گئے تھے، وہاں حضرت شروانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حویلی، مسجد اور ان کی ریاست کے باقیات دیکھنے اور تفصیلات جاننے نیز حضرت حکیم اختر صاحب مدظلہ کا لکھا ہوا رسالہ ''حیات شروانی'' پڑھنے کا موقعہ ملا تو اندازہ ہوا کہ ان کا مقام ومرتبہ اہل اللہ کی نظر میں کتنا بلند تھا۔ اس عاجز کو اپنی قسمت پر ناز ہوتا ہے مگر اس میں اپنا کوئی کمال نہیں، حق تعالیٰ کا فضل وکرم اور میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی دین کی خاطر کی جانے والی قربانیوں کا صدقہ ہے کہ آنکھوں کو بڑے بڑے اللہ والے اس وقت سے دیکھتے رہے جب سے کہ یہ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ کاش کہ اتباع کی توفیق بھی ہو جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

طبیعت ملنے کو مضطرب تھی، ادھر میرا سفر بھی تھا، فجر کے بعد ہمت کر کے قیام گاہ پہونچا، کوئی بھی نہ تھا، بھائی سعید احمد صاحب انجینئر چائے پلا رہے تھے، سلام کر کے خاموش بیٹھ گیا، حضرت آنکھیں بند کر کے چائے نوش فرما رہے تھے، سعید بھائی نے زور سے نام لے کر اطلاع دی تو متوجہ ہوئے، آنکھ کھول کر دیکھا، آواز نہیں نکل پا رہی تھی، چائے کی پیالی جو ہاتھ میں تھی وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا ''یہ آپ پی لیجئے'' میں فوراً ہاتھ بڑھا کے لے لیا اور پینا شروع کر دیا، بہت ہی نحیف وناتواں آواز میں فرمایا ''مولانا قاسم نانوتویؒ ایک گھنٹہ پہلے سے نماز کی تیاری فرماتے تھے، آخر کچھ تو کرنا پڑتا ہوگا، آج ہم نماز کا اہتمام نہیں کرتے'' ایک دو باتیں اور فرمائیں جو سمجھ میں نہ آسکیں، بے جوڑ سی تھیں، پھر خود ہی فرمایا ''بول بھی نہیں پا رہے ہیں ضعف بہت ہو گیا ہے'' میں نے عرض کیا: حضرت! آرام فرمائیں، آپ کی زیارت بھی بہت کافی ہے، کہا اچھی بات ہے، پھر دعائیں دیتے ہوئے رخصت فرمایا۔ ''آپ بہت کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے، فیض کو عام فرمائے، اللہ تعالیٰ حاسدوں سے حفاظت فرمائے اور آپ کی مدد فرمائے'' اور بھی چند کلمات فرمائے جو آواز کی پستی کی وجہ سے سنائی نہیں دئے، لیکن یہ دعائیں کیا کم نعمت تھیں؟ ایک تو تبرکِ حسی یعنی پس خوردہ عطا فرمایا، دوسرے اپنی مقبول ومستجاب دعاؤں سے سرفراز فرمایا، جس کی گذارش کی بھی اس پیرانہ سالی اور ناتوانی کی حالت میں مجھے تو ہمت نہ تھی، طبیعت باغ باغ اور قویٰ مضبوط ہو گئے، سچ عرض کرتا ہوں کہ وہ دن یوم العید کی طرح گذرا، سعید بھائی خاص مدرسہ آکر مجھے ان دعاؤں پر مبارک باد دے گئے۔ **فالحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔**

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس عاجز کی وہ پہلی ملاقات تھی تو یہ آخری ملاقات، اس کے بعد پھر نہ اس مبارک سراپا کو دیکھ سکا اور نہ ہی وہ بابرکت آواز سن سکا۔ ان دونوں ملاقاتوں کے درمیان تقریباً نصف صدی پر محیط عرصہ ہے، جس میں ان کی نوازشوں، مہربانیوں، تعلیم وتربیت، تنبیہ وتادیب، خفگی وخوشنودی کا اور اپنی غفلتوں وناقدریوں کا ایک

لمبا سلسلہ ہے جس کے تذکرے کو فرصت اور یکسوئی یا پھر برکتِ وقت وسلیقۂ ضبط کی دولت چاہیے، جو شامتِ اعمال سے مجھے میسر نہیں ہے۔ پھر ان کی صفاتِ عالیہ اور مقاماتِ رفیعہ پر تو مقربینِ بارگاہ اور اولیاء آگاہ ہی کلام کرسکتے ہیں؛ میں ذیل میں چند بیتے ہوئے واقعات کے تذکرہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

○ جیسا کہ میں نے عرض کیا پہلی زیارت تو بہت کم سنی میں ہوئی تھی، اس کے بعد سے برابر ہوتی رہی، جب میں مدرسے میں پڑھنے لگا تو تقریباً ہر سال ہی حضرت قاری صاحب امتحان کے لیے تشریف لاتے تھے، حفظ شروع ہونے کے بعد کئی مرتبہ میں نے بھی حضرت کو امتحان دیا، امتحان بہت ادب سے لیتے تھے، ایک زانو بیٹھے ہوتے، ایک پیر کھڑا ہوتا، گھٹنے کے اوپر قرآن مجید کو سہارا دے کر بہت خشوع وخضوع اور غایتِ احترام سے صفحات پلٹاتے اور مکمل تجوید کی رعایت کے ساتھ کوئی آیت پڑھ کر سوال فرماتے۔ ایک دفعہ پہلی منزل کے امتحان میں پہلے پارے کا سوال فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ سے، دوسرے پارے کا يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ سے، تیسرے پارے کا یاد نہیں، چوتھے پارے کا يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ سے کیا تھا، پورا صفحہ سنتے تھے، طالبِ علم دور بیٹھا ہوتا تھا، پورے امتحان میں نظر اٹھا کے اس کی طرف ایک دفعہ بھی نہیں دیکھتے تھے، بغیر اس کی طرف دیکھے ہی سوالات فرماتے، نتیجہ لکھ لیتے اور روانہ کردیتے تھے۔ کم سن اور نوعمر بچوں سے یہ غایت احتیاط تمام اولیاء اللہ کی شان ہے؛ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو یوں بھی بہت ہی باحیا اور شرمیلی طبیعت کے حامل تھے، اس میں معلمینِ مکاتب ومدارس کے لیے بڑی عبرت ہے۔

○ جس سال میرا حفظِ قرآن مکمل ہوا مدرسہ فیض العلوم میں اسی سال شعبۂ عالمیت کا پہلی دفعہ آغاز ہوا اور خوش نصیبی یہ کہ اس شعبے کے لیے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عارضی تبادلہ فرمادیا تھا، دارِ قدیم میں مدرسہ کی قدیم گیٹ سے متصل ایک چھوٹے سے حجرہ میں حضرت کا قیام اور اسی سے متصل ایک بڑے حجرے میں عربی سالِ اوّل کی جماعت ہوا کرتی تھی! حمد باری، فارسی زبان کا قاعدہ، عربی زبان کا قاعدہ، عربی صفوۃ

المصادر وغیرہ سب حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی پڑھایا کرتے تھے، میں بارہا عرض کرتا رہتا ہوں کہ وہ پڑھاتے کیا تھے گویا گھول کے پلا دیتے تھے؛ سبق سناتے وقت طالبِ علم ذرا رکتا تو آگے کا جملہ خود ہی بول دیتے تھے، ان کو ہر کتاب از بر تھی، اب یہ ان کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے کہ ان ہی کی مدد سے سنایا ہوا یہ سبق بالکل پختہ اور حافظے میں محفوظ ہوجاتا تھا؛ میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا، دیگر ساتھی بھی یہی محسوس کرتے تھے۔

○ کھانے کا انتظام اس قیام کے دوران ہمارے گھر ہی میں تھا، کھانا کھلانے کی خدمت کا موقعہ ملتا رہتا تھا، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شروع ہی سے بہت کم غذا تھی، اس زمانے میں جب قویٰ مضبوط اور صحت بہت اچھی تھی تب بھی مختصر سا کھانا کھاتے تھے جو تعجب انگیز تھا، کوئی فرمائش اور خواہش نہیں تھی، البتہ ایک دفعہ جمعہ کے دن مجھ سے پوچھا آج کیا دن ہے؟ پھر خود ہی فرمایا: الیوم یوم الجمعۃ۔ اس کے بعد فرمایا جمعہ کے دن گوشت پک جایا کرے تو اچھا ہے، سبحان اللہ! سال بھر میں کل ایک فرمائش وہ بھی دین کی نسبت سے، یعنی خواہشاتِ نفسانیہ کا کوئی دخل عمل ہی نہیں، جو کام تھا جو عادت تھی اور جو پسند تھی وہ سب دین اور سنت کی نسبت سے تھی، للّٰہیت کے جذبے سے تھی؛ اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے اس اخلاص وللّٰہیت کا؟

○ قیامِ حیدرآباد کے دوران اتوار کے دن تبلیغی جماعت کے ہفتہ واری اجتماع میں شرکت کے لیے مرکز تشریف لے جانے کا اہتمام تھا، حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الحدیث کی نسبت سے آپ کو اس کام سے اور نظام الدین کے اکابر کو قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق تھا، اخیر زمانے میں تو مرکز نظام الدین اور مرکز حیدرآباد کے بہت سے اکابر حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی سے روحانی طور پر وابستہ ہوگئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اسی قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں تبلیغی جماعت کا ایک بڑا اجتماع بارکس میں ہوا تھا، حضرت قاری صاحب بھی اس میں تشریف لے گئے، مرکز کے اکابر سے بھی ملاقات ہوئی، اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ انہیں اپنے ساتھ اسٹیج پر لے گئے، اپنے بیان

میں حضرت کا تعارف کراتے ہوئے ان کے قیام حیدرآباد کو غنیمت سمجھنے اور فائدہ اٹھانے کی برسرِعام تاکید فرمائی تھی، حالانکہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ جماعتوں میں باقاعدہ وقت لگاتے بھی نہیں تھے۔ اس سے جہاں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مقام ومرتبے کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اکابرینِ تبلیغ کے اعتدالِ مسلک ومشرب کو بھی سمجھا جاسکتا ہے جس کی آج کل بہت کمی محسوس ہورہی ہے۔

○ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ علماءِ کرام کا بہت احترام فرمایا کرتے تھے، دارالعلوم، مظاہر علوم اور ندوۃ العلماء کے اساتذہ اسی طرح مشائخ دیوبند سے وابستہ حضرات سے بڑی محبت ہی نہیں ان کی انتہائی تکریم بھی فرمایا کرتے تھے، یہی معاملہ ان علماء اور بزرگوں کی جانب سے حضرت کے ساتھ ہوتا تھا۔ حیدرآباد میں علماء کی تشریف آوری ہوتی تو حضرت قاری صاحب میرے والدِ ماجد اور بعض دیگر لوگوں کو لے کر ان کے بیان میں شرکت اور ملاقات کے پروگرام بناتے تھے، اسٹیشن پر کبھی استقبال کے لیے کبھی رخصت کرنے کے لیے بھی پہونچ جاتے تھے، کئی دفعہ یہ عاجز بھی ساتھ رہا۔ ایک واقعہ اس سلسلہ میں یاد آگیا جو سبق آموز ہے، دارالعلوم دیوبند کے استاذ حضرت مولانا انظر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ[1] ان دنوں حیدرآباد تشریف لائے تھے اور مدرسہ کے قریب ہی نواب باقر صاحب زید مجدہٗ کے بنگلے میں مقیم تھے، مدرسہ میں کوئی خطاب نہ ہوا تھا۔ چند دن بعد حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کمرے میں بتلایا کہ حضرت ناظم صاحب (محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ) کا مراسلہ آیا ہے کہ مولانا کا بیان مدرسہ میں کیوں نہیں ہوا؟ الفاظ تقریباً یہ تھے:

''خارجاً مسموع ہوا ہے کہ مولانا انظر شاہ صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند حیدرآباد آئے اور نواب صاحب کے ہاں قیام رہا، تعجب ہے کہ آپ وہاں ہیں پھر بھی مولانا کا مدرسہ میں کوئی بیان نہیں ہوا''۔

---

[1] میں نے اس وقت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو پہلی دفعہ بنگلے کے سامنے بعد فجر تیز گامی کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت دبلے اور چھریرے بدن کے تھے۔ بعد میں بار بار دیکھا اور سنا بھی، فالحمد للہ علی ذالک

اس مواخذہ کا حضرت قاری صاحب کافی پر اثر رہا؛ اس واقعہ میں حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی وسعتِ ظرفی اور بالغ نظری بھی قابلِ توجہ ہے، بالخصوص ان لوگوں کے لیئے جو بزرگوں کو قریب سے زیادہ دیکھے اور مزاج کو پرکھے بغیر ہی اپنے تصور وتخیل سے ان کے مزاج کی تعیین بلکہ اسی کی تشہیر کرنے لگتے ہیں۔

○ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حفظِ مراتب بہت تھا، مواخذہ ومطالبہ گو ہر ایک سے کرتے تھے مگر مرتبوں کی رعایت کے ساتھ کرتے تھے، یہ بہت ہی نازک کام ہوتا ہے، ایک دفعہ حضرت قاری صاحب حیدر آباد تشریف لائے اور صحت ناساز تھی، حضرت حیدر آباد میں بہت اچھے رہتے تھے، آب وہوا کو اپنے مزاج کے مطابق بتلاتے تھے، اسی نسبت سے میں نے عرض کیا: حضرت! اب آپ حضرت ناظم صاحب سے کہہ کر حیدر آباد ہی تبادلہ کرالیجئے، یہاں آپ کی صحت نسبتاً اچھی رہتی ہے، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تکئے کے نیچے سے ایک پوسٹ کارڈ نکالتے ہوئے فرمایا ''میرا جی بھی یہی چاہتا ہے مگر حضرت میرے ساتھ ضابطے کا تعلق نہیں رکھتے ہیں، اگر ایسا کرتے تو میں ایک ملازم ہوں، درخواست دے دیتا اور کہیں بھی چلا جاتا، دیکھو! ابھی واپسی میں کچھ تاخیر ہوگئی تو حضرت کا یہ خط آگیا ہے، خط مجھے دیا، اس میں لکھا ہوا تھا:

''مکرمی قاری صاحب زید لطفکم　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہاں شدت سے آپ کی کمی محسوس ہورہی ہے، آپ کب تک واپس تشریف لائیں گے؟'' والسلام ابرار الحق

خط سنانے کے بعد حضرت قاری صاحب فرمانے لگے ''اب بتاؤ، گئے بغیر چارہ نہیں ہے، حضرت یہ کہتے کہ مزید رخصت نہیں ملے گی، تو میں بھی ضابطے کا جواب دے سکتا تھا، مگر اب فوری ٹکٹ بنوا رہا ہوں'' خیر! یہ تو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی باتیں ہم لوگوں سے محبت کی وجہ سے سنا دیا کرتے تھے مگر اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان حضرات نے ایک دوسرے کے احترام اور حقِ مرتبہ کی رعایت میں کتنے کڑوے گھونٹ پئے ہوں گے اور

کتنی تلخیوں کو چکھا ہوگا؟ اس کے باوجود حاضراً وغائباً ایک دوسرے کے خیر خواہ تھے؛ ذاتیات پر ملت کے مفاد کو مقدم رکھتے ہوئے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اشرف المدارس میں تقریباً پون صدی کی خدمات طرفین کی وسعتِ ظرفی، عالی حوصلگی اور کمالِ اخلاص کے وہ تابندہ نقوش بن گئیں جو اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔

○ اس ایک سال کے بعد حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہردوئی واپس ہو گئے، یہاں شعبۂ عالمیت بھی بند ہوگیا اور ہم لوگوں کے لیے ہردوئی روانگی تجویز ہوئی، ہردوئی پہونچ کر پھر حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی نصیب ہوگئی، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ عمر بھر ابتدائی جماعتوں ہی کو پڑھاتے رہے، ان کے مقام ومرتبہ اور علمی استعداد وتدریسی پختگی کے مدِنظر انتہائی جماعتوں تک تدریس کے مواقع بلکہ مطالبے تھے، مگر قاری صاحب کبھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے، البتہ جو کچھ پڑھاتے تھے دلجمعی بلکہ دلسوزی سے پڑھاتے تھے، لگ لپٹ کے پڑھاتے تھے، طالبِ علم کو پڑھنا ہو یا نہ ہو، حضرت کو پڑھانا ضرور ہوتا تھا۔ ہفتہ بھر تو پڑھاتے ہی تھے جمعہ کے دن بھی ناغہ گوارا نہ تھا، اس دن بھی اسباق پورے کر لیتے تھے؛ ایک سال مدینہ منورہ میں قیام کے بعد جب واپس تشریف لائے تو روزمرہ کی گفتگو میں عربی محاورے اور عربی جملے بولتے بھی تھے یاد بھی کراتے تھے؛ گنتی بھی خوب رٹاتے تھے۔ پھر ان کا پڑھانا نرا پڑھانا نہیں تھا، وہ معلم خشک کے بجائے مربی مشفق ومہربان بھی تھے، شاگردوں کو نماز کی تاکید، اس کی پابندی کی نگرانی، سنن ونوافل کی مشق اور دیگر اخلاقِ حسنہ کی تاکید وتلقین لازماً ومستمراً فرمایا کرتے تھے۔

○ ہردوئی میں میری صحت ناساز ہوئی تو معالج نے واپس حیدرآباد بھیج دینے کی رائے دی، حضرت قاری صاحب کا سفر حیدرآباد طے تھا، نائب ناظم صاحب نے مجھے ان کے ہمراہ کر دیا، میرے پاس ایک صندوق اپنے سامان کا تھا اور ایک بستر، ایک ساتھی نے اپنا صندوق گھر پہونچانے کے لیے میرے حوالے کر دیا تو میں نے بستر اس میں رکھ لیا، اس طرح دو

صندوق میرے پاس ہو گئے، حضرت قاری صاحب (۱) نے رکشے پر سامان رکھواتے وقت میرا اسامان دیکھ لیا اور بہت خفا ہوئے کہ تم طالب علم ہو یا کاروباری؟ اتنا سامان طلبہ کے پاس ہوتا ہے؟ ہم لوگ ہردوئی سے لکھنؤ پہونچے، لکھنؤ سے حیدر آباد! پورے راستے مختلف موقعوں اور وقفوں سے حضرت اس مسئلے کو اٹھاتے اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی سادگی کے اور بے سروسامانی کے ساتھ پڑھنے کے واقعات سناتے رہتے، یہاں تک کہ مدرسہ پہونچ کر والدِ ماجد سے بھی ذکر فرمایا، لیکن ان کی اس خفگی میں بڑی شفقت تھی؛ خیر خواہی، دلسوزی اور درد مندی اس قدر نمایاں تھی کہ اس ڈانٹ ڈپٹ میں ناگواری وگرانی تو کیا ہوتی مزہ آتا رہا، اور بڑی عبرت ونصیحت ملتی رہی، اپنی طالبِ علمی کے واقعات، سفر حج کی سادگی کا واقعہ وغیرہ بہت کچھ سنایا تھا؛ فرمایا کہ مجھے طالبِ علمی کے زمانے میں ایک قرآن مجید خریدنے کی ضرورت ہوئی اور قیمت معلوم کی تو ایک روپیہ بتلائی گئی، میں نے اس کے لیے سو دن تک مظاہر علوم کی گیٹ پر دربانی کی، فی یوم ایک پیسے کے حساب سے انعام ملا تو اس ضرورت کی تکمیل کر سکا۔ وغیرہ

○ والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق تھا، جس وقت والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ کالج کی تعلیم ترک کر کے دینی تعلیم کے لیے ہردوئی پہونچے تھے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہاں بحیثیت مدرس تشریف فرما تھے، والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ تو نوجوان تھے ہی حضرت قاری صاحب کا سن بھی سبزہ آغاز ہی تھا (۲) والدِ ماجد پڑھنے کے ساتھ دفتر کے کام بھی کرتے تھے، نورانی قاعدہ

(۱) جنہوں نے مدت العمر کوئی الماری تو کیا کپڑے رکھنے کے لیے ایک صندوق بھی اپنے پاس نہ رکھا تھا، تکیے کے غلاف سے کام چلا لیا کرتے تھے۔

(۲) جب تک والد ماجد کا قیام ہردوئی میں رہا، دونوں ہم نوالہ وہم پیالہ بھی تھے، گاڑھی چھنتی تھی، والدہ فرماتی ہیں کہ حضرت قاری صاحب کا کھانا بوجہ گھر والے ساتھ نہ ہونے کے مطبخ سے جاری تھا اس لیے والدِ ماجد اپنے گھر سے کھانا لے جا کر دونوں وقت حضرت قاری صاحب کے ہمراہ ہی کھاتے تھے، رات میں دس دس بجے تک محفل جمتی تھی اور سیکھنا سکھانا ہوتا رہتا تھا، والدِ ماجد کے ساتھ اس تعلق کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ خیال رکھا۔

والد صاحبؒ کو حضرت نے ہی پڑھایا تھا، مگر والد صاحبؒ کے طریقِ تدریس پر انہیں بہت اعتماد تھا، اپنے متعلقین کو سختی سے تاکید کرتے تھے کہ مولوی عبدالغنی صاحبؒ سے قرآن مجید پڑھنا سیکھ لیں۔ ہر سفر میں کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور عطا فرماتے تھے، بیماری کے زمانے میں بھی ہر سفر میں وقت نکال کر گھر تشریف لاتے، تھوڑی دیر کے بعد رفقاء کو باہر بھیج کر بہت خلوص سے مالی تعاون فرماتے تھے۔ میری ایک بہن مطلقہ ہے اس کے بارے میں ضرور پوچھتے اور علاحدہ امداد فرمایا کرتے تھے، یہ سلسلہ والد صاحب کے انتقال کے بعد بھی قائم تھا کہ ہم لوگوں کے ذریعے والدہ اور بہن کے لیے ہر سفر میں کچھ نہ کچھ نوازش فرمادیا کرتے تھے؛ یہ ایک مثال ہے ورنہ ان کی خفیہ نوازشات اور اہل تعلق کی فکروں کے واقعات بے شمار ہیں، آج زبانی ہمدردی بھی ایک دوسرے کو مشکل سے مل رہی ہے، تعلق والوں کا دل وجان سے خیال رکھنا آسان کام نہیں ہے، بلند حوصلہ و بلند کردار لوگوں ہی کی شان ہوسکتی ہے۔

○ والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے خانگی مسائل معلوم کرتے رہتے اور بچوں کی شادیوں کے سلسلہ میں خود بھی فکر فرماتے تھے، والدِ ماجد کے تذکرہ میں لکھ چکا ہوں کہ بڑی بہن کے لیے رشتے کا انتخاب حضرت قاری صاحب ہی نے فرمایا تھا، اور محض نماز کے خشوع وخضوع کی بنیاد پر فرمایا تھا، دوسری چوتھی اور پانچویں بہن کی شادیاں بھی حضرت قاری صاحب ہی کے مشورہ اور سرپرستی میں ان کی ہدایات کے مطابق انتہائی سادگی سے سرانجام پائیں، یہ سب خیر وبرکت کے ساتھ مستقل خاندان بن گئے ہیں؛ عجیب بات ہے کہ اس کے برخلاف صرف ایک رشتہ جو ہم لوگوں نے جمایا تھا اور اہتمام سے شادی کی مگر وہ بہ تقدیرِ الٰہی ٹوٹ گیا۔ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ جھٹ پٹ اس طرح رشتے کروادئے کہ سنبھلنے سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا مگر ان کی دعا وتوجہ سے سب پھل پھول رہے ہیں؛ واقعی! ان کی دعاؤں میں بڑی برکت تھی۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء**

○ والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک حادثے میں زخمی ہوگئے تھے، طویل علالت کے بعد ہم لوگوں نے کام سے انہیں روک لیا تھا، حیدرآباد میں ان کا اپنا کوئی مکان نہ تھا، شروع ہی سے مدرسہ کے مکان

میں رہتے تھے، اسی میں رہ رہے تھے؛ ظاہر ہے کہ مدرسہ کا مکان مدرسہ کی مصالح کے لیے ہوتا ہے، منتظمین مدرسہ تخلیہ کرا کے کسی اور کو الاٹ کرنا چاہتے تھے، یہ تجویز مرکز ہر دوئی پہونچی جس پر حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے مخصوص احباب کو مشورہ کے لیے طلب کیا، ان میں حضرت قاری صاحب بھی شامل تھے، حضرت کے علاوہ دیگر حضرات نئے تھے، غالباً والد صاحب کے احوال اور قدیمی خدمات سے باخبر بھی نہ ہوں گے۔ یہ بات حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے خود فرمائی اور میں نے بھی انتظامی معاملات کی وجہ سے اب تک کسی سے نہیں کہی، مگر حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مخلصانہ احسانات کے ضمن میں اب لکھ دوں تو خلافِ مصلحت نہیں ہوگا، حضرت نے فرمایا کہ ''سب لوگوں نے یہی رائے دی کہ جب کام نہیں کر رہے ہیں تو اصولی طور پر مکان خالی کروا لینا چاہیے مگر مجھ سے رہا نہ گیا، میں اگرچہ انتظامی لائن کا آدمی نہیں اور حضرت کے سامنے رائے دینے کا مزاج بھی نہیں مگر میں نے صاف طور پر عرض کیا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے؟ ایک آدمی آپ کی وفاداری میں جوانی سے بڑھاپے تک پہونچ گیا، اب کام کے قابل نہیں رہا، آپ اس کو تنخواہ نہیں دیتے تو نہ دیں مگر مرنے تک سر چھپانے کو ٹھکانہ تو دیں'' چنانچہ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فیصلہ فرمایا: سبحان اللہ! خلوص و وفا وہ بھی علی ظہر الغیب کی عجیب مثال ہے۔

○ یہی نہیں کہ ایک غائبانہ حمایت پر اکتفا کر لی بلکہ اس کے بعد جب حیدرآباد تشریف لائے تو والد صاحب سے معلوم کیا کہ آپ نے جو پلاٹ خریدے تھے ان کا کیا ہوا؟ والد صاحب نے بتلایا کہ اب ان کا ملنا مشکل ہے، بظاہر کوئی شکل نہیں ہے، یہ سن کر بہت متفکر ہو گئے، اپنے بعض متوسلین کے ذریعے متعلقہ سوسائٹی سے ربط کیا، نامہ و پیام کا سلسلہ چلاتے رہے، سوسائٹی کے ذمہ دار سے خود ملے، ترغیب دی، خوشامد کی، اتنی فکر اور سعی کی کہ ہم لوگ بھی نہیں کر سکتے تھے، یہاں تک کہ اسے اس پر آمادہ کر لیا کہ پوری نہ سہی جتنی بھی جگہ دینا چاہیں دیدیں، اپنی موجودگی میں اس سے زمین نپوا کر اسی وقت باؤنڈری کا کام شروع کروا دیا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے، آج والد صاحب کے ترکہ میں وہی ایک قطعۂ ارض ہے جو حضرت قاری صاحب کا رہینِ منت اور یادگارِ احسان ہے۔ یہ بھی ایک مثال ہے ورنہ اپنے متعلقین کی پریشانیاں دور کرنے کے سلسلہ میں اُن

سے جو تدبیر ہوسکتی اور جس کے ذریعے کام نکل سکتا انتہائی فکر واہتمام کے ساتھ اس کی مدد میں لگ جاتے تھے؛ ابھی انتقال سے چند دن قبل ہی کی بات ہے کہ برادرم مفتی سہیل احمد صاحب حیدرآباد میں کئی دن کے لیے مقیم تھے، اور جگہ جگہ نظر آرہے تھے، میں نے وجہ دریافت کی تو یہی بتلایا کہ حضرت قاری صاحب کے حکم سے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں؛ فلاں صاحب کا ایک غیر مسلم کے ساتھ کورٹ میں کیس چل رہا ہے، حضرت چاہتے ہیں کہ مصالحت کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہوجائے، اور غالباً ہو بھی گیا تھا۔ خدا جانے ان کے اعمال نامے میں ایسی کتنی حسنات ہوں گی اور کتنے ہاتھ ان کے بعد ان کے لیے دن رات اٹھے ہوئے ہوں گے؛ دیکھنے میں ایک بوریہ نشین وعزلت گزین فقیر اور کارنامے وہ جو اچھے اچھے سماجی خدمت گذاروں سے بھی نہ ہوسکیں۔

○ توجہات اور احسانات کا یہ سلسلہ والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ ان کی اولاد (ہم لوگوں) پر بھی ہمیشہ قائم رہا، جب بھی ملاقات ہوتی بہت شفقت ومحبت ہی نہیں اکرام کا معاملہ فرماتے تھے، ہر دوئی حاضری ہوتی اور آپ موجود ہوتے تو کمرہ پر بلا کر کچھ نہ کچھ کھلاتے پلاتے تھے؛ کبھی موقع نہ ہوتا تو کچھ رقم دے دیتے تھے کہ راستے میں کچھ کھالینا، کوئی اور آپ کے پاس موجود ہوتا تو اپنی شاگردی کے حوالہ سے تعارف کراتے اور خدمات کا بھی ذکر کرتے، ہمارا غائبانہ ذکر ہوتا تو بھی فرمادیتے کہ ہمارے شاگرد ہیں، کام کررہے ہیں وغیرہ، یہ سب اصلاً والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے دیرینہ اور محبانہ تعلقات کا ثمرہ تھا، ورنہ ہماری کیا حیثیت؟

○ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں تنہا تھا، قدیم مسجد میں نماز ادا کرنے کے ارادہ سے کوشش کرکے اندر پہونچا، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اکثر نمازیں مسجدِ نبوی کے سب سے قدیم حصے میں ادا ہوتی تھیں، حضرت وہاں نظر آگئے تو میں قریب جاکر بیٹھ گیا، معمولات سے فارغ ہوئے تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور کچھ نصیحتیں فرماتے رہے، پھر معلوم کیا کہ پہلی دفعہ آئے ہو؟ میں نے عرض کیا ایک دفعہ اور صرف چند گھنٹوں کے لیے آسکا تھا، یہ سن کر فرمایا: اچھی بات ہے میں دکھاتا ہوں مسجد، پھر اس قدیم مسجد کے ایک ایک گوشے میں لے گئے اور اس کی تاریخی نسبتیں بتلاتے رہے، ستونوں کا تعارف کرایا، اس سے متعلقہ واقعات سنائے، دروازوں کے پاس لے گئے اور ان سے متعلقہ

معلومات دیں، صفہ پر لے گئے اس کا تعارف کرایا، پھر ہاتھ پکڑ کر باہر لائے، پوچھا: احد پہاڑ جانتے ہو؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی، فرمایا: یہ بالکل سامنے جو پہاڑ نظر آ رہا ہے یہی احد ہے۔(۱)

پھر حضرت اپنی قیام گاہ لے گئے جو غالباً دار الخیر کے نام سے مولانا خیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کی موقوفہ عمارت تھی، اس کے بالائی حصے پر ٹین کا ایک بڑا شیڈ بنا ہوا تھا جس میں ایک طرف مطبخ اور اس سے متعلقہ اسباب رکھے ہوئے تھے، دوسری جانب بہت بڑی قالین بچھی ہوئی تھی، درمیان میں ایک چارپائی پر بہت ہی معمر بزرگ لیٹے ہوئے تھے، حضرت نے بہت ہی احترام سے ان سے ملاقات کی، پھر مجھے بھی ملوایا اور ادب سے نیچے بیٹھ گئے، میں بھی بیٹھ گیا، فوراً دستر خوان لگا اور قسم قسم کے کھجور اور مختلف النوع اطعمہ چن دئے گئے، لوگ آتے تھے، سلام کرتے اور دستر خوان سے مستفید ہو کر چلے جاتے، کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی، بلکہ یوں لگا کہ بعض لوگ بس اسی قدر کام کے لیے آتے ہیں؛ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بتلایا کہ یہ شب و روز کا سلسلہ ہے، میں نے حضرت قاری صاحب سے چپکے سے پوچھا ان کے پاس آتا کہاں سے ہے؟ حضرت نے زور سے ان بزرگ سے دریافت کیا یہ ہمارے شاگرد پوچھ رہے ہیں کہ آپ کے ہاں یہ سب آتا کہاں سے ہے؟ انہوں نے فرمایا: مجھے بھی پتہ نہیں، بس اتنا دیکھ رہا ہوں اِدھر سے آ رہا ہے اور ادھر جا رہا ہے؛ یہ بزرگ حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خادم تھے، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بعد میں ان کے بارے میں بہت تفصیل سے بتلایا اور بہت اونچے مقامات کا تذکرہ کیا، جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ مجھے صرف یہ بتلانا ہے کہ اتنی بڑی شخصیت کا اپنے ایک معمولی شاگرد اور خادم کو لے کر اس قدر نوازشیں اور احسانات فرمانا اتنا وقت لگانا اور اس قدر گھومنا کیسی محبت اور شفقت کا پتہ دیتا ہے۔

○ نکاحوں میں سادگی پر بہت زور دیتے تھے، جو ان سے مشورہ کرتا اس کے لیے نکاح اتنا ہی آسان ہوتا جتنا عہدِ صحابہ میں آسان تھا، ان کو بھنک بھی لگ جاتی کہ رشتہ طئے ہو رہا ہے تو طرفین

(۱) اس وقت تک اصل میں مدینہ منورہ کے مبارک اور عاشقانہ ماحول پر مصنوعی سلفیت کا مکروہ غبار نہیں چھایا تھا، یہ سب زیارتیں بہت اطمینان سے ہو رہی تھیں، اللہ پاک پھر ایک دفعہ مدینے منورہ میں خشکیت کا خاتمہ کر کے عشق و وفا کا ماحول عام فرما دے۔ آمین

کو بلوا کر نہ صرف طئے کراتے بلکہ اکثر نکاح بھی کروا دیتے تھے۔ اپنی بہنوں کے سلسلے میں تجربے تو تھے ہی، ابھی چند دن قبل کا واقعہ ہے کہ میرے بہنوئی بچی کے سلسلہ میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے آئے، ساتھ میں لڑکے کے والد کو بھی لائے، وہ بھی میرے تعلق والے تھے، مشورہ میں یہ طئے پایا کہ رشتہ مناسب ہی رہے گا میرے بہنوئی گھر گئے، والدہ سے ذکر کیا، انہوں نے کہا: حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود ہیں ان سے بھی مشورہ کرلو، میرے سامنے بات آئی تو میں نے کہا لڑکے والے کچھ اعذار کی وجہ سے تھوڑا وقت چاہتے ہیں اور آپ کو بھی ابھی جلدی نہیں ہے، یا تو یہ امور طئے پانے کے بعد حضرت سے ذکر کرو یا ابھی کرنا ہے تو پھر فوراً نکاح کرنے کے لیے تیار ہو کر جاؤ، انہوں نے کہا کہ صرف دعا کی درخواست کے لیے جانا ہے، ابھی فوراً تو نکاح مشکل ہے۔ یہاں عصر بعد آئے تھے، وہاں مغرب بعد پہونچے، عشاء کے بعد یہ خبر لے کر آئے کہ حضرت نے فرمایا ہے میں پرسوں صبح جا رہا ہوں، کل عصر بعد نکاح ہو جائے گا؛ مزید کچھ کہنے سننے کا موقعہ نہ تھا، یہ لوگ کوئی بھی عذر بتلاتے حضرت اس کا حل فرما دیتے، چناں چہ اگلے دن نکاح ہو ہی گیا؛ اس طرح خدا جانے اپنی عمر میں انہوں نے کتنے نکاح کروا دئے اور کتنے والدین کا بوجھ ان کی بدولت ہلکا ہو گیا۔

نکاحوں میں اس قدر سادگی کے اہتمام سے بہت فوائد ہیں، حقیقت میں آج اس سلسلہ کے جتنے مسائل ہیں اور اس کے لیے جو کچھ کہا لکھا جا رہا ہے ان سب کے مقابلے میں نکاح میں جلدی کرنا، خرچ میں کمی کرنا اور تکلّفات سے بچنا کامیاب حل ہے۔ بہت عرصہ قبل کی بات ہے جب حضرت کا قیام حیدر آباد تھا، ان کے ایک شاگرد نے نکاح پڑھانے کی درخواست کی، حضرت نے شرط رکھی کہ بارات نہیں جائے گی، لڑکی کے گھر صرف پانچ آدمی جائیں گے، کوئی دعوت اور تکلف نہیں ہوگا، مطالبات نہیں ہوں گے، ولیمہ سنت کے مطابق سادگی سے کیا جائے گا تو میں نکاح پڑھاؤں گا؛ مخلص لوگ تھے، سب مان گئے، حالانکہ ان کے والد محکمۂ پولیس کے آفیسر تھے، لیکن بہر حال نکاح اسی طرح ہوا؛ بعد میں معلوم ہوا کہ اسی ہفتہ اس محلّے میں سات لڑکیوں کے اور نکاح ہو گئے، لوگوں نے کہا جب اتنے بڑے آفیسر اس سادگی کے ساتھ شادی کر سکتے ہیں تو ہمارے

پاس تو ہے بھی نہیں، ہم کیوں اپنی بچیوں کی عمر خراب کریں؟

○ اس سلسلہ میں حضرت کسی کی رعایت نہیں فرماتے تھے، اپنی دی ہوئی ہدایات ـــــ دوسرے لفظوں میں شرعی احکامات کی ـــــ ادنیٰ خلاف ورزی گوارا نہ تھی، بعد میں کوئی خلاف ورزی معلوم ہوجاتی تو نظر انداز نہ فرماتے بلا کر سخت تنبیہ کرتے، اس قدر خفا ہوتے کہ عمر بھر یاد رہ جائے؛ دوسروں کے واقعات کو چھوڑ کر یہاں بھی شخصی واقعہ پر اکتفا کرتا ہوں، دوسری بہن کا نکاح حضرت ہی کی سرپرستی میں ہوا تھا، دولہے کے ساتھ اس کے دو چار گھر والوں کو کھانا کھلا کر دلہن کو رخصت کردینا طئے پایا تھا؛ اس زمانے میں میں پرانے شہر کی ایک مسجد میں امامت کرتا تھا، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اور بیان میں شرکت کرانے کی غرض سے مسجد کمیٹی والوں کو مدعو کرلیا تھا، انہوں نے ازراہِ خلوص اصرار کیا کہ ہم تو امام صاحب کے ہاں کھانا کھا کر ہی جائیں گے، ایسا موقعہ پھر تھوڑا ہی ملے گا، میں نے بھی بعض مصالح کے تحت مناسب یہی سمجھا کہ ان لوگوں کی بات رکھ لی جائے اور کھانے پر بلالیا؛ حضرت کو علم ہوا تو کمرہ پر مجھے اور برادر محترم مفتی صاحب کو بلا کر اس قدر خفگی و ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ بیان سے باہر ہے، میں نے کچھ کہنا بھی چاہا تو حضرت نے فرمایا یہ سب کچھ نہیں تم لوگوں کو ہدایت کی خلاف ورزی کی جرأت ہی کیسے ہوئی؟ اسی وقت واپسی کا سفر بھی درپیش تھا، ہم نے معافی مانگی، منت سماجت کی کہ درگذر فرمادیجیے، آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی، مگر حضرتؒ بگڑتے ہی رہے؛ بعد میں خط وکتابت کے ذریعہ معاملہ صاف ہوا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ اپنوں کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ حق سمجھتے تھے کہ ان سے غلطی منوا کر اس کی اصلاح کئے بغیر نہ چھوڑیں، چشم پوشی ونظر اندازی آسان کام ہیں، تربیت مشکل کام ہے؛ آج شخصی حق تلفیوں پر ناراض ہونے والے تو بہت ملیں گے مگر دینی غیرت اور اسلامی حمیت میں اللہ کے لیے خفا ہونے والے کم سے کم ہوگئے۔ فالی اللہ المشتکی

○ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے ممتاز صفت تواضع وعبدیت کی صفت ہے، ہر ایک کی زبان وقلم پر آپ اس کا ذکر ضرور پائیں گے، تواضع کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ پورے ملک میں اپنے متعلقین کی دعوت پر سفر فرماتے رہتے تھے مگر اکثر تن تنہا سفر ہوتا تھا، نہ سامان کی بہتات

نہ خادم کی ضرورت، جہاں جاتے انہیں کوئی رخصت کر کے چلا جاتا تھا اور اگلی منزل پر کوئی لینے آ جاتا تھا، اخیر زمانے میں البتہ خدام و متعلقین کی طرف سے زبردستی کوشش کی جاتی رہی کہ کوئی نہ کوئی ساتھ ہو؛ اسباب کی زیادتی سے بہت گھبراتے تھے، ان کے کمرہ میں بھی سامان بس ایک مسافر خانہ سے زیادہ نہ تھا، یا تو کتابیں تھیں، یا پھر انتہائی ضرورت کے اسباب ہوا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں نے مدینہ منورہ میں مسجد سے آتے ہوئے ایک دوکان پر متوسط قسم کا رومال خریدا جو عمدہ پیکنگ میں تھا، ان دنوں ناشتہ حضرت کے ساتھ ہی ہورہا تھا، ناشتے کے بعد ہدیہ پیش کیا تو لے لیا مگر دیکھ کر فرمایا: یہ بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے، میں اس قابل کہاں؟ آپ کے لیے ہی اچھا رہے گا؛ میں نے عرض کیا: آپ کی شان کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہے قبول فرمالیں، تو دعائیں دیں اور سرہانے رکھ لیا؛ پورے خاندان پر اپنے ہزاروں احسانات کے باوجود بھی ایک چھوٹی سی خدمت کا مستحق اپنے کو نہ سمجھا اور بڑی مشکل سے گوارا فرمایا، یہ کس قدر عجیب شان ہے کہ ہزاروں بندگانِ خدا جس کو دیکھنے ملنے اور قدم چومنے کو ترستے ہوں وہ ایک معمولی سے رومال کے بارے میں یہ کہہ دے کہ میں اس کے قابل کہاں؟ اور یہ چیز حضرت رحمۃ اللہ علیہ میں تکلف و تصنع کے قبیل سے ہرگز نہ تھی، ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

○ طبعی طور پر یکسوئی پسند تھے، الجھنوں اور بکھیڑوں سے بہت گھبراتے اور دور رہتے تھے، ابتداءً انہیں حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ اشرف المدارس میں انتظامی ذمہ داری سونپی تھی، چند ہی دن میں انہوں نے محسوس کرلیا کہ یہ ذمہ داری نبھنی والی نہیں، ایک اہل اور موزوں شخصیت حضرت مولانا بشارت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو آمادہ کر کے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا، اپنی ذمہ داری انہیں دلوا کر خود یکسو ہوگئے اور تدریس و تعلیم کو اپنا مشغلہ بنالیا، کبھی حضرت نائب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے کسی انتظامی الجھن کی شکایت کرتے یا مشورہ فرماتے تو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمادیا کرتے تھے کہ یہ جھمیلے میرے بس کے ہوتے اور سنبھل سکتے تو آپ کے حوالے کیوں کرتا؟ آج عہدوں اور مناصب کے لیے دینی اداروں اور معتبر حلقوں میں تک کیا کچھ ہورہا ہے کسی سے مخفی نہیں، یہ کیسے باخدا لوگ تھے اور کیسی دیانتدار ہستیاں تھیں کہ ملے ہوئے

مناصب کو خوش اسلوبی اور خندہ دلی سے خود ہی دوسروں کے حوالے کر رہے ہیں، واقعی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نہ مال و منال کی خواہش تھی نہ جاہ و جلال کی ہوس! عمر بھر کُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ کے مصداق بنے رہے۔

○ درمیان میں ایک سال جب کہ ان کے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے تھے تو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کوشش کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے؛ وہاں کے بعض مقامی رئیس لوگ حضرت سے کافی متاثر تھے، کسی نے حضرت کے لیے اقامے کی سہولت دلوانے کا پیش کش کیا تو حضرت بہت خوش ہو گئے اور اپنے شیخ کی معیت، اس سے بھی بڑھ کر اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب دیار میں قیام کر لینے کا ارادہ فرما لیا، ایک عام مسلمان بھی اس سعادت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، کسی عاشقِ رسول کو کب گوارا ہوتا؟ مگر جب حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کو علم ہوا اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ ”پیارے! میں تو یہاں مرنے کو آیا ہوں، تمہارے تو ہندوستانی مسلمان زیادہ مستحق ہیں، وہیں جا کر دین کی خدمت میں لگ جاؤ“ تو شیخ کے حکم کو اپنی تمنا پر ترجیح دیتے ہوئے بہ خوشی واپس ہو کر حسبِ سابق مدرسہ اشرف المدارس میں رجوع بکار ہو گئے۔ ان کی یہ بے نفسی اور اطاعتِ شیخ بھی کیسی سبق آموز ہے!

○ آپ کی طبیعت میں غیر معمولی شرم و حیا تھی، کہا جا سکتا ہے کہ کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ با حیا تھے، کسی کی طرف نظر بھر کے دیکھتے بھی نہیں تھے، نہانے دھونے حتیٰ کہ لباس کے بدلنے میں بھی بے حد احتیاط برتتے تھے، وہ عربی جبہ پہنتے تھے، اس کے ساتھ کمرہ میں تو تہبند باندھے ہوتے اور باہر نکلتے وقت پاجامہ استعمال کرتے تھے، عام طور سے ایسے وقت ایک طرف کو ہو کر پاجامہ پہن ہی لیا جاتا ہے مگر تہبند باندھتے یا پاجامہ پہنتے وقت بھی بے چین رہتے، غایتِ حیا کی وجہ سے دوسرے کمرے میں یا پردہ کے پیچھے چلے جاتے تھے، ایسا موقع نہ ملتا تو طبیعت پر غیر معمولی گرانی و شرمندگی کے آثار نظر آتے تھے، حد یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوسروں سے غسل و کفن میں بے احتیاطی کا اندیشہ بھی انہیں شرمندہ کرتا تھا، معلوم ہوا کہ مولوی قطب الدین صاحب کو اس سلسلہ میں تاکید فرمائی تھی کہ میں عمر بھر بہت حیا سے رہا ہوں غسل و کفن میں اس کا خاص خیال رکھنا۔

○ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس عاجز کی طالبِ علمی کے زمانے میں خط وکتابت بھی ہوتی رہتی تھی مگر ان خطوط کی حفاظت کا اہتمام نہیں رہا، اپنے کاغذات میں چند خطوط قدیم و جدید مل گئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض جوابات ہدیہ ناظرین کر کے اپنا قلم روکتا ہوں، تاکہ حضرت والا کی ذرّہ نوازیوں اور مقامِ عبدیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

۱) چوتھی بہن کا نکاح حضرت والا کی نگرانی میں بڑی عجلت میں طئے پا کر بہت ہی سادگی سے تکمیل بھی ہو گیا تھا اور حضرت والا اس کے معاً بعد ہردوئی روانہ ہو گئے تھے، میں نے بذریعہ خط حضرت کا شکریہ ادا کیا، نیز اپنی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں بھی دعا کی درخواست کی، دونوں باتوں کے سلسلہ میں جواب ارقام فرمایا جو غایتِ تواضع وشفقت کا عکاس ہے۔

"عزیزم سلّمہ زید رشدہٗ (۱) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط کل موصول ہوا، پڑھ کر اور خیریت معلوم کر کے سکون ہوا، آپ نے انتہائی محبت سے یاد کیا، فجزاک اللہ خیرا، یہ ناکارہ تو کچھ نہیں ہے، آپ کے اور والدین کے حسنِ ظن اور خلوص کی وجہ سے حق تعالیٰ نے مجھے بہانہ بنا کر اس عقد کی صورت کر دی، ورنہ مجھے بھی خود حیرت ہوئی کہ (یہ تقریب) اس قدر سادگی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہونچی، لڑکے کے خاندان والے بھی حیرت میں رہ گئے کہ اتنی عجلت، سہولت اور اتباعِ سنت کے ساتھ ہو گیا۔ بہر حال مالک کے نزدیک کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ آپ کے آپریشن کا حال معلوم ہوا، دل وجان سے دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ راحت وسکون سے سارے کام کرا دے آمین، جب آپریشن کے لیے جائیں تو پہلے دو رکعت نماز پڑھ کے دعا کر لیں اور یا اللہ یا رحمن یا رحیم کا ورد رکھیں۔ انشاء اللہ قلب میں چین وسکون محسوس ہوگا۔"

---

(۱) حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہر خط پر چاہے مستقل ہو یا جواباً سب سے اوپر "از بندہ امیر حسن، اشرف المدارس ہردوئی" لکھا ہوتا تھا اور اس کے بعد تاریخ بھی مرقوم ہوتی تھی۔

۲) ایک اور بہن کے نکاح میں حضرت نے کچھ دیر بیان فرمایا تھا، میں نے اس کو نوٹ کر کے حضرت والا سے ماہنامے کے ذریعہ اشاعتِ عام کی اجازت چاہی اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا، اس کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ان کی فنائیتِ نفس اور عجز وانکسار کا شاہکار ہے۔

''عزیزم سلّمہ زید علمہ وعملہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''آپ نے اور والد صاحب نے انتہائی محبت وخلوص سے یاد کیا ہے جس کا یہ ناکارہ مستحق نہ تھا، مزید برآں آپ نے اس ناکارہ کے بیان کو شائع کرنے کی اجازت چاہی ہے تو عرض ہے اس ناکارہ کا بیان اشاعت کے لائق نہیں، اس لیے کہ کوئی ربط بھی نہیں ہوتا، کہیں کچھ کہیں کچھ، ادھر ادھر کی باتیں سنا دیتا ہوں، ایسا (بے ترتیب) مضمون آپ کے رسالہ کے مناسب نہیں معلوم ہوتا، غور کر لیں، محترم والد صاحب سے مشورہ کر لیں، جہاں تک اجازت کا تعلق ہے اگر نافع ہو تو اجازت کی ضرورت نہیں ہے، باقی میرے جیسے انسان کے بیانات اشاعت کے کیا قابل ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ نہ علم ہے نہ عمل تو کسی پر کیا اثر ہوگا؟''

۳) حضرت کی اہلیہ محترمہ کے وصال پر تعزیتی عریضہ ارسال کیا تو جواب میں ارقام فرمایا:

''عزیزم سلّمہ زید علمہ وعملہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا نوشتہ عنایت نامہ کل صبح موصول ہوا جو مشتمل بر تعزیت تھا، اور تسکینِ قلب کا باعث ہوا، فجزاک اللہ خیراً، آں عزیز نے اپنی محبت اور اخلاص سے یاد کیا اور مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب ودعائے مغفرت کا اہتمام کیا، یہ میرے اوپر بہت بڑا احسان ہے، حق تعالیٰ آں عزیز کو دین ودنیا کی ترقیات سے مالا مال کرے، آمین۔ مدرسہ کو قائم ودائم رکھے اور اخلاص سے خدمت کی توفیق دے کر فیض کو عام وتام کرے، آمین۔ یہ ناکارہ بھی دعاؤں کا محتاج ہے، دعا کریں کہ اپنے وقت پر حسنِ خاتمہ کی توفیق ہو، آمین۔ والدین سے سلام اور دعا کے لیے

کہیں، میں سب کے لیے دعا گو ہوں۔''

۴) جب اس عاجز نے دار العلوم حیدر آباد سے رسمی طور پر نصاب کی تکمیل کر لی تھی، ان دنوں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواب میں زیارت ہوئی، حضرت شکوہ فرما رہے تھے کہ ''تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟'' احقر نے اس خواب کو اور تکمیل نصاب کی خوشخبری کو تحریر کر کے یہ عرض کیا تھا کہ میرے یہاں تک پہونچنے میں آپ کی پڑھائی ہوئی ابتدائی کتب ہی مددگار رہیں، ورنہ بعد کی تعلیم تو وقفے وقفے سے اور بے ڈھنگے طریقے پر تکمیل پاتی رہی، اس شفقت واحسان کا شکر یہ میں کسی طرح ادا نہیں کر سکتا، عریضے کے آخر میں کچھ نصیحت کی بھی درخواست کی تھی، اس کے جواب میں حضرت کی جو تحریر موصول ہوئی ہر پڑھنے والا شرم سے پانی پانی ہو جائے گا۔

''عزیزم سلّمہ زید علمہ وعملہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ سب حالات آپ کے محبت وخلوص کا ثمرہ ہیں، ورنہ یہ ناکارہ تو کچھ نہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، یہ قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں، باقی سب آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ اپنا حال تو ظاہر ہے، بس حسن خاتمہ کے لیے اور زندگی میں اللہ کی مرضیات کے اتباع کی توفیق کے لیے دعا فرمادیں۔

اس ناکارہ نے تو جوانی اور غفلت میں آپ کو ڈانٹ ڈپٹ بہت کیا ہے، زیادتی بھی ہوئی ہوگی اس وقت، اب یاد بھی سب باتیں نہیں ہیں، البتہ یہ یاد ہے کہ روک ٹوک ضرور کرتا تھا، خدا تعالیٰ معاف کرے، آپ بھی سب درگذر کر دیں۔ دل سے دعا گو اور دعا جو ہیں۔ میں آپ کو کیا نصیحت کروں جو خود محتاجِ نصیحت ہوں؛ باقی تعمیلاً وہ نصیحت کر دیتا ہوں جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو فرمائی تھی یعنی ''انسان اپنے سفر اصلی اور وطن اصلی سے غافل نہ رہے'' والد صاحب سے سلام کہیے اور دعا کی درخواست بھی۔ والسلام امیر حسن''

۵) احقر کو علاقے میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک سہ روزہ سفر میں شریک رہنے کا موقعہ ملا، اثناءِ سفر جو بیانات ہوئے اس کو میں نے نوٹ کر لیا تھا، جسے مرتب کر کے ''حسن

الامیر فی الوعظ والتذکیر'' کے نام سے شائع کیا، اس کے کچھ نسخے خدمتِ مبارکہ میں ارسال کئے تو میل وشارم کے معتکف سے یہ تحریری جواب موصول ہوا۔

''عزیزم سلّمہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ کی دعا سے پہلے سے بہتر ہے، یہ بس آپ کے حسن ظن کا ثمرہ ہے (ورنہ) میری باتیں کہاں ایسی تھیں کہ شائع کی جائیں، آپ نے جمع کر کے شائع کر دیا، جس کا وہم وگمان بھی مجھ کو نہ تھا، حق تعالیٰ آپ کے فیض کو عام وتام کرے، زیادہ سے زیادہ نفع مخلوقِ خدا کو ہو آمین، خوشی ہوئی، دعا کرتا ہوں، یہاں ساڑھے بارہ سو کا مجمع ہے جو میرے پاس آتے ہیں انہیں پیش کر دیتا ہوں، جزاک اللہ خیر الجزاء فقط والسلام''

مختصر وقفے میں اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں، ایک تو یہ کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے کلام کے بجائے میرے جمع کرنے کی طرف نسبت کر کے میرے فیض کے عام وتام ہونے کی دعا فرمارہے ہیں، کیا ٹھکانا ہے اس فنائیت کا، ایک ایک جملہ پڑھ کر شرم سے ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے زحمت کے خیال سے صرف سو نسخے بھیجے تھے، وہاں کے مجمع کا اندازہ بھی نہ تھا، مخصوص لوگوں کو بھی دیتے تو نا کافی ہوتے مگر مزید ضرورت کا کوئی اشارہ کئے بغیر صرف مجمع کی تعداد رقم فرمادی، حالانکہ اس فرمائش کا انہیں پورا حق حاصل تھا مگر یہ حضرات سوال کیا شبہِ سوال سے بھی کوسوں دور رہتے تھے۔

۶) ایک دفعہ حضرت حیدرآباد دو مرتبہ تشریف لائے اور احقر دونوں موقعے میں سفر پر تھا، ملاقات نہ ہوسکی؛ ملاقات نہیں ہوتی تو اکثر دیگر متعلقین سے پوچھ لیتے تھے کہ کہاں ہے؟ بعد میں دو تین حضرات نے یاد فرمائی کی اطلاع مجھے دی تو میں نے ایک معذرت نامہ بذریعہ ڈاک بھیجا، حضرت والا نے جواباً ارقام فرمایا:

''عزیز محترم! زید علمہ وعملہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون آپ کا پرچہ پڑھ کر خیریت وکیفیت سے آگاہ ہوا، آپ

کے جملہ مقاصدِ حسنہ کے لیے دل سے دعا گو ہوں اور اپنے لیے دعا جو ہوں، آپ بالکل فکر نہ کریں، معذرت کی بھی ضرورت نہیں، میں خوش ہوں کہ دینی خدمات میں لگے ہوئے ہیں، حق تعالیٰ مزید ترقیات سے نوازے اور ہر قسم کے شر فتنے سے حفاظت فرمائے اور قبول فرمائے آمین۔ والسلام امیر حسن"

جی چاہتا ہے کہ اس مضمون کا اختتام حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دعائیہ کلمات پر ہی کردوں، وھی ھٰذہ:

اے اللہ! ہمیں اپنا صحیح اور قوی تعلق نصیب فرما، اے اللہ! ہمیں حسنِ نیت اور حسنِ عمل کی توفیق نصیب فرما، اپنے اپنے وقت پر اکمل ایمان پر خاتمہ نصیب فرما، آج ہماری طبیعتوں سے ماننا نکل گیا ہے، نہ باپ کی مان رہے ہیں نہ ماں کی مان رہے ہیں، نہ استاذ کی مان رہے ہیں نہ پیر کی مان رہے ہیں، مان رہے ہیں تو اپنے نفس کی مان رہے ہیں جو سب سے بڑا دشمن ہے، اے اللہ! ہمیں نفس و شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ فرما، اپنی مرضیات کے اتباع کی توفیق نصیب فرما۔

آمین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

حضرت مولانا شاہ حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کچھ یادیں! کچھ باتیں!!

(اداریہ جولائی ۱۳ء)

قارئینِ اشرف الجرائد کو یہ تو معلوم ہو چکا ہوگا کہ شیخ المشائخ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ تیرہ سالہ علالت کا طویل سلسلہ ختم کرتے ہوئے ۲ رجون ۱۳ء مطابق ۲۳ ر رجب المرجب ۳۴ھ شب دوشنبہ ۷ بجکر ۴۰ منٹ پر اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ان کی پیدائش سن ۱۳۴۶ھ میں ہندوستان کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ پرتاب گڑھ میں ایک ملازم سرکار، شریف ووجیہ شخصیت جناب محمد حسین مرحوم کے گھر ہوئی تھی؛ وہ اپنے والدین کی تین اولاد میں سے واحد نرینہ اولاد تھے، بچپن میں جسمانی اعتبار سے نحیف وضعیف تھے، اکثر بیمار رہا کرتے تھے مگر قلبی لحاظ سے بہت متیقظ و بیدار مغز اور دیندار تھے؛ دین کا ذوق اور اہل دین کی محبت گویا فطری طور پر آپ میں موجود تھی؛ ابتدائی تعلیم ساتویں جماعت تک گاؤں کے اسکول میں حاصل کی، پھر والد کی تجویز کے مطابق الٰہ آباد منتقل ہوئے اور باقاعدہ طور پر یونانی میڈیسن کی تکمیل کی۔

شروع ہی سے نماز روزہ کے پابند بلکہ تہجد گذار تھے، دین اور اہل دین کی طرف میلان ورجحان طالب علمی کے دور میں بھی بہت تھا، وہ اگرچہ والد کے تعمیل حکم میں عصری تعلیم پڑھ رہے تھے مگر دل ودماغ ہمیشہ دین کی تعلیم سے مانوس اور اسی کی طرف راغب تھا۔

کالج لائف کے دوران ہی انہیں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ بنام ''راحۃ القلوب'' کہیں سے میسر آ گیا، طبیعت تو پہلے ہی سے دیندارانہ دعاشقانہ پائی تھی اس وعظ کے مطالعے کے بعد یہ جذبہ اور بھڑک گیا، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے غایت درجہ عقیدت ہوگئی، ان سے رجوع ہو کر ایک ساتھ دینی تعلیم اور عملی تربیت حاصل کرنے کا ارادہ فرمالیا؛ اس سلسلہ میں حضرت ؒ کو خط لکھا، مگر چوں کہ وہاں علالت وناسازئ طبع کی وجہ سے طالبین کو رجوع کی اجازت دینا بند کر دیا گیا تھا اس لئے معذوری کا جواب آیا؛ اس کے چند ہی دن بعد حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے وصال فرما گئے، جس کا آپ کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا، اس کے اثر سے آپ کی زبان پر بے اختیار ایک شعر جاری ہو جاتا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''بلبل تو اپنے چمن میں مست ومگن ہے اور اُلّو ویرانوں میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے''۔ اس صدمے سے دل ودماغ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ عین اس روز جبکہ آپ اِلٰہ آباد طبّیہ کالج سے فراغت کی سند لے کر گھر پہونچے والد ماجد کے سانحۂ ارتحال کی خبر آئی، اس خبر نے آپ کو اور نڈھال کر دیا، مگر آپ صبر وثبات کے ساتھ راضی بہ رضا رہے، کسی قبرستان میں چلے گئے اور قبروں کی زیارت کر کے تسلی حاصل کی کہ ایک دن سب ہی کا یہ انجام ہونا ہے۔

چند برس مختلف دواخانوں میں کام کیا مگر علم دین حاصل کرنے کا شوق اس قدر بڑھا کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کے اس کے لئے رختِ سفر باندھ لیا، پھولپور پہونچے اور شیخ المشائخ حضرت شاہ عبد الغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں علم دین حاصل کرنا شروع کر دیا، وفورِ شوق کا یہ عالم تھا کہ آٹھ سالہ نصاب صرف چار سال میں مکمل کر لیا، بخاری شریف کا بھی ایک حصہ شیخ پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ان ہی سے حدیث کی اجازت حاصل فرمائی۔

نکاح آپ نے نہایت سادگی کے ساتھ ضلع اعظم گڑھ کے گاؤں ''کوٹلہ'' میں ایک صالحہ قانتہ خاتون ـــــ جو اگر چہ عمر میں آپ سے بڑی تھیں مگر ورع وتقویٰ اور صلاح وتدیّن

میں پورے گاؤں میں ممتاز تھیں ـــــ سے کیا، یہ خدا کی نیک بندی مدت العمر زہد وقناعت اور صبر واستقامت کا مجسمہ بن کر تنگی دفراخی ہر حال میں بہتر رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں؛ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بیٹا اور ایک بیٹی ان کے بطن سے نصیب ہوئی، زندگی بھر نہ کبھی کوئی شکوہ کیا نہ کبھی کوئی فرمائش ومطالبہ، بلکہ آگے بڑھ کر اپنے شوہر کے دین وایمان کی ترقی میں معاونت ونصرت کرتے ہوئے انہیں پوری آزادی دیدی کہ آپ شیخ کی خدمت وصحبت کو میری راحت پر مقدم رکھئے، میری فکر نہ کیجئے میں صبر واستقامت سے کام لوں گی"؛ گویا اس طرح اس سمجھ دار اور روشن دماغ خاتون نے بالواسطہ حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی طویل خدمت کے شرف اور اس کے ثواب میں خود کو بھی شریک کرلیا، اور واقعی بعض مواقع پر بالخصوص حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت پاکستان کے موقع پر جب کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی خدمت ورفاقت کی ضرورت سے ان کیساتھ ہو گئے تھے، ان کی اہلیہ محترمہ نے حسبِ وعدہ پورے...... سال صبر وثبات اور صدق ووفا کا ثبوت دیا، فجزاھا اللہ احسن الجزاء۔

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مزاج تو گویا فطری طور پر خودفراموشی وخدا پرستی کا پایا تھا، چھوٹی سی عمر میں جب بڑی بہن دعا پڑھوانے کو گاؤں کی مسجد میں انھیں لے جایا کرتی تھیں تو خود فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے مسجد دیکھ کر خوشی ہوتی تھی اور نمازیوں بالخصوص امام صاحب کو دیکھ کر ـــــ جو فی الحقیقت بہت نیک اور صالح آدمی تھے ـــــ ان کی طرف رغبت اور ان کی محبت محسوس کرتا تھا" اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قدرت نے ان کی فطرت ہی میں شانِ ولایت رکھدی تھی؛ چناں چہ نابالغی کی عمر ہی سے تہجد گذار وشب زندہ دار تھے، اپنے گاؤں میں آبادی سے پرے ایک مسجد ویران ہورہی تھی، بچپن میں آپ کو اس کی آبادی کا احساس ہوا، بنا کسی اور کی مدد کے تنہا اس میں تشریف لے جانے اور اذان ونماز کا اہتمام کرنے لگے، اسی پر بس نہ کیا مسجد جاتے ہوئے درمیان راہ واقع مسلمان گھروں پر دعوت دینے اور انہیں مسجد لے جانے کی سعی بھی کی، یہاں تک کہ وہ مسجد مصلیوں سے آباد ہوگئی۔

یہ تو اسکول کے زمانے اور نابالغی کے دور کے کارنامے ہیں، جب آپ الٰہ آباد کالج میں پڑھ رہے تھے تب بھی آپ کا مشغلہ دوستوں اور یاروں کے ٹولوں میں گھومنا یا گپ پاشی کی محفلوں میں محظوظ ہونا نہیں تھا —— جیسا کہ اس عمر کے لڑکوں کا عام رواج ہے —— بلکہ مولائے روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کا مطالعہ کرنا اور اس کے درد انگیز وولولہ خیز اشعار گنگناتے رہنا، نمازیں پڑھنا اور اہل اللہ وصالحین کی زیارتوں سے محظوظ ہوتے رہنا ان کا شوق تھا؛ چنانچہ زمانہ طالب علمی ہی میں اپنے وقت کے صاحبِ نسبت اور سلسلہ نقشبندیہ کے مایۂ نازعالم حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی اور ان کا وعظ سنا تو پھر ان کی خانقاہ میں پابندی سے جانے لگے، روزانہ کالج سے فراغت کے بعد ان کی مجلس میں جاتے اور رات دیر گئے تک وہیں رہتے، بلکہ کبھی کبھی وہیں سوجایا کرتے تھے، حضرت پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس نوجوان کے اندر ودیعت جوہر گراں مایہ اور اس مرد حقانی کے پیشانی پر نمایاں نورِ ایماں صاف دکھائی دے رہا تھا، اس لئے آپ کی اتنی قدر فرماتے تھے کہ جس رات حکیم صاحب کسی وجہ سے گھر نہ جا پاتے تو وہ خود بھی مہمان خانے ہی میں قیام فرمالیتے تھے، جبکہ معمول گھر پر قیامِ شب کا تھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کالج کے ماحول میں زیرِ تعلیم ہونے اور والدین کی نگرانی سے آزاد ہونے کے باوجود اس کھڑی جوانی میں آپ کا طائر روحانیت آسمان ولایت کی کن بلندیوں پر پرواز کررہا تھا؟ اور مستقبل کے شیخ العرب والعجم کی اس کا پروردگار کیسی حفاظت وتربیت فرمارہا تھا۔[۱]

بہرحال آپ کا پہلا مرشد —— یعنی حطامِ دنیا کی چاہت سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی محبت کی طرف متوجہ کرنے کا سبب —— "مثنوی شریف" ہے، دوسرے مرشد قطب الوقت حضرت پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ، تیسرے باقاعدہ مرشد شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ (یکے از خلفائے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ) تھے پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ الٰہ آباد قیام

---

[۱] عصری تعلیم میں مشغول نوجوان جو کالجس کے ماحولوں کا رونا روتے ہیں اور اپنی بے دینی وگمراہی کا اسی کو سبب بنا کر طفل تسلی کا سامان کرلیتے ہیں ان حالات میں غور کریں اور عبرت حاصل کریں تو ذرا ہمت ومجاہدہ کرکے وہ بھی بہت کچھ پاسکتے ہیں۔

کے زمانہ میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک وعظ "راحت القلوب" کے مطالعے کے بعد انہیں تھانوی مذاق ومزاج سے قلبی لگاؤ اور طبعی مناسبت ہوگئی تھی[۱] اسی مناسبت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے فوراً حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک خط روانہ کردیا جس میں اپنی تمنائے رجوع واصلاح پیش فرمائی، مگر تقدیر الٰہی سے یہ وہ وقت تھا کہ دنیائے تصوف کا یہ شہسوار اور اقلیم تربیت کا یہ مجاہدِ اعظم اب تھک کر چور اور بستر مرگ پر دراز ہوچکا تھا؛ اس لئے وہاں سے جواب یہی ملا کہ اہل تعلق میں کسی اور سے رجوع کرلیا جائے؛ ادھر چونکہ مناسبت اسی مذاق سے ہوچکی تھی، نظر اسی سلسلہ کی کسی کڑی کو ڈھونڈھتی پھر رہی تھی، اچانک ان کے قلب کو اپنے ہی قرب وجوار میں اس مذاق ومزاج کی خوشبو محسوس ہونے لگی اور نگاہوں نے اس آستانے کو پالیا جس پر پہونچ کر وہ فدویت کے اس مقام پر پہونچے کہ شیخ تو ایک عرصہ کے بعد انہیں چھوڑ کر راہیٔ آخرت ہوئے مگر انہوں نے شیخ کو عمر بھر نہ چھوڑا، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سترہ سالہ دورِ عشق ومحبت، اصلاح وتربیت اور عہدِ وفا کی تکمیل کا حسین مرقع اور خوبصورت تاریخ ہے؛[۲] جس کی تفصیل باخبر وذی صلاحیت متعلقین ہی بیان کرسکتے ہیں، مجھ جیسے دور افتادہ ارادتمند کی بساط واوقات نہیں کہ اس میدان میں جرأتِ گویائی یا خامہ فرسائی کرے، البتہ اس قدر عرض کروں گا کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ کی اس سترہ سالہ خدمت ورفاقت کے بدلے میں حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی ذات میں جذب فرمالیا تھا؛ وہی عشقِ خداوندی، وہی اتباعِ سنت وحبِ نبوی، وہی خوفِ خدا اور گریہ وبکاء، وہی علم ومعرفت کے اُبلتے چشمے، وہی مولائے روم رحمۃ اللہ علیہ کے چشمۂ صافی وعلومِ الہامی کی والہانہ ترجمانی، وہی غیرت وحیا اور پاکدامنی! میں نے حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو نہیں ہے مگر میرے والد

---

[۱] طریقت میں سارا کام اتباع کامل سے بنتا ہے، اتباع کی توفیق اعتقاد واعتماد کے بغیر نہیں ملتی اور اعتقاد مناسبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اس لئے مشائخ مناسبت کو شرط اول کہتے ہیں، جبکہ یہ مناسبت کبھی دفعۃً ہی کسی سے ہوجاتی ہے اور کبھی مزاولت وملازمت اور معتد بہ تجربہ کے بعد ہوتی ہے، پہلی صورت اذکیاء کا نصیب ہے اور دوسری صورت اغبیاء کا حصہ!

[۲] اگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ خوبصورت تاریخ خود حضرتؒ کی تمام تصنیفات وبیانات میں انہی کی شیریں زبان سے بکھری پڑی ہے، جو اکٹھی ہوجائے تو سالکینِ راہِ طریقت کو روحانی ٹانک کا کام دے گی۔

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی زیارت وصحبت کا شرف حاصل رہا ہے، وہ جو کچھ ان کی چشم دید کیفیات سناتے تھے اور جو کچھ میں نے ان کی کتب سے سمجھا ہے اس کی روشنی میں ضمیر کی آواز پر کہہ رہا ہوں کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا عکسِ جمیل بن گئے تھے۔

خیر! بات ان کے تزکیہ وسلوک اور ان کے مشائخ کرام کی چل رہی تھی، حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ نے وصال سے قبل انہیں تاکید فرمادی تھی کہ وہ ان کے بعد حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور خلیفہ بلکہ نقشِ ثانی محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع ہوجائیں؛ چنانچہ انہوں نے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ سے نہ صرف رجوع کیا بلکہ زندگی بھر والہانہ اور عاشقانہ تعلق رکھا، ان کے مزاج ومنہاج کی پوری رعایت فرمائی ان سے استفادہ اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کا بھرپور حق ادا کیا؛ تقریباً چوالیس سال تک اپنے مقام ومرتبہ سے بے نیاز ہوکر ایک عاشقِ صادق اور طالبِ کامل کی حیثیت سے وابستہ رہے، باوجود اس کے کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے صرف ۷ برس چھوٹے تھے اور حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں مثل رفقاء کے بھی رہ چکے تھے،[۱]

یہاں حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پاکیزہ زندگی پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے کہ بلوغ سے قبل ہی سے وہ شب بیدار و پرہیزگار اور ولایت آثار تھے، بلوغ کے بعد قطبِ وقت حضرت پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ فیض اثر سے روحانیت وللّٰہیت کے جام پینے شروع کئے، وہ بھی طرفین کی عنایتوں کے ساتھ! بیس سال کی عمر میں آستانہ پھولپوری سے وابستہ ہوئے اور سترہ سال تک بلا انقطاع کسبِ فیض فرماتے رہے، جوانی پوری انہی کی خدمت وصحبت پر نثار کرڈالی، ادھیڑ عمر میں یعنی کوئی پینتیس برس کے ہوں گے کہ بارگاہِ محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ میں پہونچے اور پورے چوالیس سال

[۱] حضرت ہردوئی کی ولادت ۱۹۲۱ء میں ہوئی اور حضرت حکیم صاحبؒ کی ۱۹۲۸ء میں۔ سنا ہے کہ حضرت محی السنہؒ اور حضرت حکیم صاحبؒ مشترکہ طور پر حضرت پھول پوری سے بنوٹ یعنی لاٹھی چلانے کی مشق کی تھی، یہ کوئی معمولی اخلاص وایثار کی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے معاصر کو شیخ بنائے اور چالیس سال تک پوری عقیدت ومحبت ہی سے نہیں عجز ونیازمندی سے اس کو نباہے، اخلاص اور صدقِ طلب کی تاریخ میں اس کی مثالیں نایاب نہ سہی کم یاب ضرور ہیں۔

ان سے استفادہ کرتے رہے؛ گویا زندگی کے وہ ابتدائی آٹھ سال جو طفولیت ولاشعوری کی وجہ سے بچپن کی نذر ہو گئے اور وہ آخری آٹھ سال جو پیرانہ سالی اور مسلسل بیماری کی وجہ سے بستر پر پڑے گذر گئے چھوڑ دیئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ حضرتؒ نے اپنی اٹھاسی سالہ عمر کے ۷۲ سال پورے کے پورے راہِ خدا میں گذار دیئے؛ اسے آپ احسان وسلوک کے مقامات کہیئے یا طریقت وتصوف کے منازل پوری عمر جو شخص کاملین کے زیر سایہ چلتا چلا جارہا تھا اور بڑھتا چلا جارہا تھا وہ بالآخر قربِ خداوندی اور نسبتِ الٰہی کے کس مقام پر پہونچا ہوگا؟

رہ گئی بات خلافت واجازت کی تو اگر آج کے زمانے کا معیارِ خلافت سامنے رکھا جائے تو حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے اعمال واخلاق، حبِ الٰہی وعشقِ نبوی اور طریقت سے دلچسپی کے اعتبار سے عنفوانِ شباب ہی میں خلافت کے مقام تک پہونچ گئے تھے؛ تاہم وہ دور ذرا اس سے کٹھن اور مہنگا دور تھا، مشائخ اعطائے خلافت واجازت میں کہا جائے تو بجا ہے کہ ایسے ہی محتاط تھے جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ قبول روایت میں محتاط تھے؛ شیخِ کامل و عارف کی نگہ بلند اپنے مریدِ صادق کے مستقبل میں بہت دور تک دیکھ رہی تھی کہ یہ وہ جوہر یکتا اور دُرِّ بے بہا ہے جو صدیوں میں کبھی پیدا ہوتا اور ایک عالم کو اپنا گرویدہ ووارفتہ بنا کے چھوڑتا ہے، اس لئے اس میں کوئی کسر اور کمی باقی نہ رہنی چاہیے۔ بہر حال! اُنھیں حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے رجوع کے دو برس بعد سن ۱۳۸۷ھ میں اجازت بیعت وتلقین سے سرفراز فرمایا، جبکہ آپ کی عمر مبارک تقریباً چالیس برس کی تھی اور اسی کے کچھ عرصہ بعد حضرت پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کو اپنی طرف سے اجازت وخلافت عطا کر دی۔[1]

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دنیائے طریقت میں جو قبولیت ومحبوبیت حاصل ہوئی ہے اس کے اسباب میں حق تعالیٰ کی توفیق خاص اور ان کے اخلاص کے علاوہ یہ دو اسباب خصوصیت سے نوٹ کرنے کے قابل ہیں کہ آپ چشتیت ونقشبندیت کے مرج البحرین

---

[1] کہتے ہیں کہ اللہ پاک کی سنت بھی یہی ہے کہ وہ انبیاء کرام کو دعوت وارشاد کے کام پر عام طور سے چالیس برس کی عمر ہی میں لگاتا ہے، حضرت حکیم صاحبؒ کو تقدیر خداوندی کے تحت یہ اتفاق بھی حاصل ہوگیا تھا اور اس کی برکات بھی اضافہ وافادہ کی وسعتوں میں بچشم سر دیکھی جاسکتی ہیں۔

اور طب جسمانی اور معالجۂ رُوحانی کے سنگم تھے، جس نے آپ کے مزاج میں ایک عجیب کشش اور اندازِ تربیت میں متعلقین کے طبائع ومراتب کی رعایت کا خاص ملکہ پیدا کر دیا تھا، اسی لئے ہر لائن ہر طبقہ اور ہر عمر کے لوگ آپ کے سلسلہ میں جمع ہوتے چلے گئے، دیکھتے دیکھتے لاکھوں عوام اور ہزاروں علماء کرام آپ کی دکانِ یقین ومعرفت اور خانقاہِ تزکیہ و تربیت سے فیض یاب اور بہرہ ور ہونے لگے اور آپ کے خلفاء کے ذریعہ آپ کی حینِ حیات ہی جو شاخیں نکل کر اقطاعِ عالم میں پھیلیں اس کی نظیر تو کم ہی مشائخ کے حالات میں ملتی ہیں؛

وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاکستان منتقل ہونے کے بعد خود بھی وہیں چلے گئے تھے، اس عاشق ومعشوق کے درمیان رمز ہی کچھ ایسا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے چین رہتے تھے، پھر جب ۱۳۸۶ھ میں حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا وصال بمقام کراچی ہوگیا اور آپ وہیں کے ایک قبرستان میں ہمیشہ کے لئے آسودۂ خاک کر دئے گئے تو حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دل واپس ہندوستان آنے کے لئے تیار نہ ہوا اور آپ نے طئے فرمالیا کہ میں اسی سرزمین پر اپنی بقیہ زندگی گذار لوں گا جس میں میرا شیخ آرام فرما ہے؛ پردیس میں بے اسباب ووسائل کسی شخص کا اپنی فیملی کے ساتھ سٹل ہو جانا کوئی آسان کام تو نہیں تھا مگر اس مردِ درویش وحق آگاہ کو جس ذاتِ عالی کی رزاقیت پر بھروسہ تھا اس نے اس کی بھرپور دستگیری فرمائی؛ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اسباب کے درجہ میں فن طبابت تو تھا ہی جس کو آپ نے شیخ پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت وصحبت کی خاطر برسوں خیر باد کہہ رکھا تھا، اس فن کو آپ نے ضرورت کے اس موقعہ پر کام میں لایا، اس کے علاوہ بھی مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ وہ شروع میں کسی دوست کے ساتھ زمین کے کاروبار میں بھی مضاربۃً شریک ہو گئے تھے؛ الغرض! یہ آزمائش زیادہ دن نہ رہی حق تعالیٰ نے وہ فتوحات عطا فرمائیں جو توکل علی اللہ کے ثمرات دیکھنا چاہنے والوں کیلئے بہترین نمونہ ہیں۔

پاکستان میں آپ نے پہلے ناظم آباد کراچی میں قیام فرمایا، پھر گلشن اقبال منتقل ہو گئے،

وہیں پر "خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ" کے نام سے ایک خانقاہ قائم کی، پھر اس میں مدرسہ اشرف المدارس اور مسجدِ اشرف کی عظیم الشان تعمیرات کروائیں، جو حسنِ ظاہر کے ساتھ علم وعرفان کی بے مثال خدمات کا عالمی مرکز بن گئیں؛ اس وقت خانقاہ میں دسیوں ملکوں کے لوگ اور خود مدرسہ کے سینکڑوں طلبہ واساتذہ روحانی ترقی اور اخلاقی تربیت میں مصروف ہیں اور مدرسہ میں ماشاء اللہ کئی ہزار طلبہ وطالبات زیرِ تعلیم وتربیت ہیں، عظیم الشان دارالافتاء قائم ہے، اسکے علاوہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادۂ محترم اور وارثِ ظاہر وباطن حضرت مولانا حکیم محمد مظہر صاحب مدظلہ العالی خلیفہ محی السنہ حضرت شاہ ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ اور ان صاحبزدگانِ عالی وقار وذی اعتبار مولانا محمد ابراھیم، مولانا محمد اسماعیل اور مولانا محمد اسحاق زید مجدہم مختلف النوع دینی خدمات میں دل وجان سے ہر وقت لگے رہتے ہیں۔

کیمپس میں "مطب" کا سلسلہ بھی ہے اور "کتب خانہ مظہری" کے ذریعہ معتبر ومستند کتب کی اشاعت وفروخت بلکہ للہ تقسیم بھی ہوتی رہتی ہے، مختصر یہ کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے کراچی اپنے شیخ کی خدمت کی غرض سے تنہا گئے تھے مگر جب اس دنیا سے رختِ سفر باندھا تو علماء وصلحاء پر مشتمل ایک بڑا خاندان، مختلف دینی شعبوں پر مشتمل دینی علمی واصلاحی عظیم الشان وتاریخ ساز مراکزِ اسلامیہ، دوسو سے زائد علمی واصلاحی تصنیفات اور ہزارہا وارثینِ علم ومعرفت ووابستگانِ سلسلۂ طریقت کو سوگوار و یادگار چھوڑ گئے، ان کی جاری کردہ یہ سرگرمیاں ان شاء اللہ رہتی دنیا تک جاری وساری رہیں گی۔ فجزاھم اللہ عنی وعن سائر المسلمین احسن الجزاء

یوں تو حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سن ۲۰۰۰ء سے مفلوج تھے، اور گذشتہ چار سال سے کچھ زیادہ ہی معذور ومضمحل ہو گئے تھے، اس سے پہلے تک باوجود بیماری وپیرانہ سالی کے تمام معمولاتِ حضر وسفر جاری تھے؛ تیرہ سال تک مسلسل آزمائشوں اور تکالیف کے شکار رہنے کے باوجود سراپا تسلیم ورضا، پیکرِ صدق وصفا اور مجسمہ جود وسخا بنے رہے، یہ کوئی الفاظ کی تک بندی نہیں ہے ہزاروں آنکھیں ان حقیقتوں کی شاہد اور ہزاروں زبانیں ناطق ہیں؛

فللّٰہ الحمد اولاً و آخراً، خیر آدمی خواہ کتنا ہی باکمال اور فیض رسا ہو ربِ کائنات کی مشیت یہی ہے کہ اسے اس دنیا میں رہنا مختصر ہی ہے، جب امام الانبیاء ومحبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلالیا گیا تو کس کے قیام دنیا کو بقامل سکتی ہے؟ سب کو جانا تھا سب کو جانا ہے، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی لاکھوں قلوب کو مضطرب چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے ان للّٰہ ما اخذو لہ ما اعطی۔ نمازِ جنازہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کی شرکت جن میں علماء وصلحاء ہی کی بڑی تعداد تھی، نیز وہ ہزارہا مسلمان جو شرکتِ جنازہ کے لئے بے تاب تھے مگر ٹریفک جام ہوجانے اور راستوں کے مسدود ہوجانے کی وجہ سے راستوں اور سڑکوں پر محصور ہو کے رہ گئے تھے، ان کی آہیں اور دعائیں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبولیت عند اللہ وعند الناس کی واضح دلیل ہے۔ ۲/جون کو بعد مغرب وصال فرمایا ۳/جون کو صبح ۹ بجے "سندھ بلوچ سوسائٹی" کی خانقاہ میں آپ کی نمازِ جنازہ صاحبزادہ محترم حضرت حکیم محمد مظہر صاحب مدظلہٗ نے پڑھائی اور سنت کے مطابق اللہ کی اس امانت کو اللہ کے سپرد کردیا گیا۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ الجنۃ۔ آمین

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تصنیفات تو ان کے شیخ حضرت پھول پوری رحمہ اللہ کے افادات پر مشتمل تھیں، لیکن ان کی کتاب "معارفِ مثنوی" نے پورے ہندوستان کے دینی وعلمی حلقوں میں ان کو متعارف کرایا اور مقبولیتِ عامہ کا سبب بنی تھی، اس کے بعد سے دنیا کی حقیقت، روح کی بیماریاں اور ان کا علاج، نیز معارفِ شمس تبریز جیسی تصنیفات یکے بعد دیگرے سامنے آتی چلی گئیں، اور خوب خوب مقبول ہوئیں، مواعظ کے سلسلہ سے وہاں کے لوگ براہِ راست خوب منتفع ہورہے تھے مگر دور افتادگاں محروم ایں بادہ رہتے تھے، اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے آپ کے عاشقِ صادق، خادمِ واثق اور منظورِ جگر ونظر محترم میر عشرت حسین جمیل نیگنوی دامت فیوضہم کو کہ انہوں نے حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کو ضبطِ تحریر میں لانے اور شائع کرانے کا اس سلیقے سے بیڑا اٹھایا کہ اسکی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، اس سلسلۂ مواعظ کی اشاعت نے عرب وعجم ہی نہیں یورپ

وامریکہ میں بھی عاشقانِ خدا کی تربیت اوراُجڑے دلوں کی باز آبادی وتعمیر کا ایسا بازار گرم کیا کہ اندازہ کرنا مشکل ہے، پھر جب مولانا محمد ابراھیم صاحب زید مجدہ نے ”خانقاہ ڈاٹ کام“ کے نام سے سائٹ تیار کروائی تو گویا سارے عالم کے متوسلین کو گھر بیٹھے گلشنِ اقبال میں پہونچادیا بلکہ بزمِ اختر میں شامل کرلیا۔

مواعظ وبیانات اور ملفوظات وتصنیفات کی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اسفار بھی بے شمار ہیں، پاکستان میں تو ان کا قیام ہی تھا جہاں اندرونِ ملک متعدد مقامات پر بلائے جاتے، جہاں جاتے محافل رشدوہدایت قائم ہوتی چلی جاتیں، بنگلہ دیش کے بارہا سفر ہوئے اور ہر سفر میں علماء وعوام کی بڑی تعداد آپ کے ہاتھ پر توبہ کرکے سلسلہ میں شامل ہوجاتی تھی، پانچ چھ مرتبہ ہندوستان بھی تشریف لائے، ہندوستان کے کئی صوبوں اور شہروں میں مخلصین و معتقدین کی دعوت پر تشریف لے گئے، قیام اگرچہ مختصر فرمایا مگر مفصل و مسلسل نقوش چھوڑے، حرمین شریفین کی حاضری بھی متعدد بار نصیب ہوئی، اس کے علاوہ ساؤتھ افریقہ، ترکی اور عربی ومغربی ممالک کے متعدد سفر فرمائے اور ؎ جہاں جاتے ہیں ہم ترا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں کے مصداق رہے۔ خود فرماتے تھے ؎

پھرتا ہوں دل میں یار کو مہماں کئے ہوئے
روئے زمیں کو کوچۂ جاناں کئے ہوئے

قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اپنے فضل سے انھیں لمبی عمر، خوب علم وعمل اور بہت ہی قدرداں حلقۂ احباب عطافرمایا تھا؛ ان کے سوزِ دل نے ان احباب کے قلوب کو بریاں اور آنکھوں کو گریاں کردیا، جس سے ان کے اندر بھی دوسروں کے قلوب گرمانے اور بے کیفوں کو تڑپانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی؛ چنانچہ دنیا کے چپے چپے میں اس وقت آپ کے خلفاء آپ کے فیض کو عام کرنے میں مصروف ہیں جن کی تعداد سوا تین سو سے زائد بتلائی جاتی ہے، ہندوستان میں بھی متعدد خلفاء موجود ہیں جن سے فیض اٹھایا جاسکتا ہے اور اٹھانا چاہیے: مثلاً برادرِ محترم مفتی محمد عبدالمغنی صاحب ناظم مدرسہ سبیل الفلاح حیدرآباد، مولانا محمد اسجد قاسمی

صاحب شیخ الحدیث جامعہ امداد العلوم مرادآباد، محترم سید قادر معین الدین صاحب مہتمد اشرف العلوم حیدرآباد۔۔۔[1]

جہاں تک راقم سطور کی حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے معرفت ومحبت کا معاملہ ہے تو اپنے مضامین میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے ہمارا گھرانہ شروع ہی سے ان بزرگوں سے واقف اوران کا دلدادہ رہا ہے؛ میں جب کچھ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا تھا تو میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے سرہانے قرآن مجید اور مناجاتِ مقبول کے علاوہ چند محدود مگر معتبر دینی کتابیں رکھی پاتا تھا؛ ان کا مزاج یہ تھا کہ وہ کوئی چھوٹا سا رسالہ بھی بغیر اپنے شیخ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت کے مطالعہ نہیں کرتے تھے نہ گھر میں آنے دیتے تھے، ان کتابوں میں ایک کتاب ''معرفتِ الٰہیہ'' کے نام سے بھی تھی، جب میں نے اس کو دیکھا تو سب سے پہلے اس کتاب میں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی نظر آیا تھا پھر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے زبان سے ہردوئی کے قیام کے تذکرے جب بھی نکلتے تو حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بھی آتا، اس ضمن میں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ذکر آجاتا تھا، کتابیں جب سمجھ میں آنے لگیں تو میں نے معرفتِ الٰہیہ پوری پڑھ ڈالی، اس کے واقعات تو سمجھ میں آجاتے اور غمیض مضامین سرسری نکل جاتے تھے، مجھے سب سے زیادہ اثر حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کے احوال سے ہوا، وہ اشعار زبانی یاد ہوگئے جو حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کے زبان زد تھے اور بہت تاثر والم سے پڑھا کرتے تھے۔

بہرحال! میرے لئے یہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ابتدائی تعارف اور عقیدت کا نقش اول تھا، پھر جب تکمیلِ حفظ کے بعد عربی تعلیم کے لئے ہردوئی پہونچا تو اس وقت تک باشعور ہوگیا تھا اور ایک سال فارسی عربی بھی پڑھ چکا تھا؛ میں نے دیکھا کہ حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی میز پر جو اہم کتابیں رکھی ہوتی تھیں ان میں پاکستان کی مطبوعہ خوبصورت جلد کی ایک کتاب

---

[1] راقم کو ہندوستانی سب خلفاء کے نام اس وقت فراہم نہ ہوسکے، اس لئے دوسروں کا عدم ذکر صرفِ نظر پر نہیں عدم واقفیت پر محمول کیا جائے۔

"معارفِ مثنوی" کے نام سے بھی تھی، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام دیکھ کر اس کتاب کو پڑھنے کا شوق ہوا، جب موقعہ ملتا اس کا مطالعہ کرتا تھا، فارسی سے مناسبت ہو چلی تھی اور گلستان وغیرہ نصاب میں چل رہی تھیں، ادھر چونکہ مثنوی شریف واقعات وقصص اور امثال و اضراب سے پُر ہے اس لئے اس کے مطالعے میں کافی دلچسپی رہی اور بہت ہی نفع ہوا، نیز حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت ومحبت بھی بڑھتی چلی گئی، جی چاہتا تھا کہ کبھی ان کو دیکھیں اور انہی کی زبان سے کچھ سنیں، مگر ملکی سرحدوں کا تصور اسے ناممکن قرار دے کر مایوس کر دیتا تھا۔

ایک مرتبہ ہردوئی ہی کے قیام میں ساؤتھ افریقہ کے ایک طالب علم "سلیمان گھانچی"[۱] کے ہمراہ "افریقی منزل"[۲] سے ایک بلند قامت، حسین ووجیہ بزرگ بادامی رنگ کے جوڑے (اونچی شلوار، کلی دار کرتہ اور پانچ کلی ٹوپی) میں ملبوس عصر کی نماز کے لئے مسجد کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے؛ ہردوئی میں مہمان بہت آتے تھے، ان میں اکثر باوقار علماء وصلحاء ہی ہوتے تھے، مگر اس شخصیت کا رعب وداب اور وجاہت ووقار کچھ اور ہی ڈھنگ کا تھا؛ پیچھے پیچھے میں بھی ہولیا، نماز کے بعد سلیمان صاحب نے میری طرح دیگر اور لوگوں کا تجسس ختم کرتے ہوئے متعارف کرایا کہ یہ حضرت حکیم محمد اختر صاحب مدظلہٗ ہیں؛ بس کیا تھا برسوں کی تمنا پوری ہوئی، دل خوشی سے کھل اُٹھا اور آنکھیں جذبۂ مسرت سے نم ہوگئیں، فوری گھر پہونچا اور مخدومہ امی جان صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا (اہلیہ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ) کو اطلاع دی کہ حضرت حکیم اختر صاحب تشریف لائے ہیں؛ اس وقت استاذ محترم حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی سفر پر تھے اور حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ بھی نہیں تھے، امی جان رحمۃ اللہ علیہا نے عصرانے کا انتظام کیا اور افریقی منزل ہی میں حضرت کا قیام تجویز ہوا، یہ معلوم ہوکر اور مسرت ہوئیکہ قیام اچھا

۱۔ مولانا سلیمان گھانچی صاحب، مولانا یحییٰ بھام وغیرہ اچھی عمر کے افریقی طلبہ تھے، حفظ کرتے تھے، اس وقت ہم لوگ کم عمر تھے، مولانا سلیمان صاحب پہلے کراچی جاچکے تھے اور حضرت سے واقف تھے۔

۲۔ اس زمانے میں مدرسہ اشرف المدارس میں متعدد طلبہ ساؤتھ آفریقہ اور انگلینڈ وغیرہ کے زیر تعلیم تھے، ان کی رہائش گاہ علاحدہ تھی جو طلبہ میں "افریقی منزل" سے جانی جاتی تھی۔

خاصا رہے گا؛ اگلے روز حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری بھی طے تھی، یاد ہے کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود اسٹیشن تشریف لے گئے اور حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کار کی اگلی سیٹ پر اپنے بازو بٹھا کر لائے، غالباً ایک آدھ ہی روز میں حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی واپسی ہوگئی۔[1]

اس دفعہ ہردوئی میں آپ کا قیام اچھا خاصا رہا، لوگوں کی آمد و رفت کا طویل سلسلہ تھا، آنے والوں میں بڑے بڑے علماء واکابر بھی ہوا کرتے تھے، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مدرسہ کی مسجد میں بعد نمازِ فجر مجلس ہوا کرتی تھی اور عشاء کے بعد اکابر وعلماء کے ساتھ مہمان خانے میں محفل جمتی تھی، کچھ دن کے لئے حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے آئے، ان دنوں تو "افریقی منزل" باغ و بہار بنی رہی؛ راقم سطور اگرچہ طلبہ میں سے تھا مگر خدام میں شامل ہو کر شریک رہتا تھا، ایک رات سخت سردی تھی، حضرت پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ چارپائی کے سامنے لحاف اوڑھ کر دوزانو بیٹھے ہوئے تھے، سامنے انگیٹھی جل رہی تھی، ان کی بائیں جانب دیوار سے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، ان کے بغل میں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ایک طرف حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ایک طرف کامل چائلی، اور باقی کمرہ ودالان میں حسب مراتب مہمان ومقامی علماء موجود تھے؛ واقعی دیکھنے کا منظر تھا، اہل اللہ کا ایک حسین گلدستہ لگ رہا تھا، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد حضرت پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ لحاف ہی میں سے پہلے تھوڑی دیر گنگناتے اس کے بعد آواز سے اپنے اشعار سناتے تھے، پھر خود ہی ان کی تشریح بھی فرماتے تھے، کبھی حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنا کلام پیش فرماتے، کبھی کامل صاحب اجازت حاصل کرتے اور خاص ترنم کے ساتھ اپنا طویل کلام پڑھتے، حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے مگر ان کو اپنے پیر بھائی خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کے عارفانہ اشعار خوب یاد تھے، بیانوں میں بھی دلوں کو لٹوانے والی خوش الحانی سے اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ مجمع پر سناٹا چھا جاتا اور قلوب پر

[1] غالباً دونوں حضرات سفرحج سے واپس ہوئے تھے۔

بے خودی کی سی کیفیت ہو جاتی تھی، اس رات بھی حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ وقفے وقفے سے خواجہ صاحب کے اشعار سنا رہے تھے؛ اور خوب داد پا رہے تھے، درمیان میں نہی عن المنکر اور اصلاح و تربیت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، اس سے ایک اور حالت و کیفیت طاری ہوتی، کبھی کبھی اپنی وارداتِ قلبیہ اور الہاماتِ ربانیہ نہایت عاجزی کے ساتھ اور اس حوالے سے پیش فرماتے کہ میں نے یہ بات حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ[1] کو سنائی تھی انہوں نے بھی اس کی تصویب و تائید فرمائی ہے۔

غرض یہ بڑی پُر لطف و پُر معارف محفلیں ہوتی تھیں جو رات دیر گئے تک چلتی تھیں، آج بھی اس منظر کو سوچتا ہوں تو دل اس طرف کھچا چلا جاتا ہے۔ اسی مجلس میں حضرت پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اپنے تعلق خاص اور نسبت کے اتحاد کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا "جو میرے مریدین ہیں وہ مولانا (حضرت ہردوئی) کے مرید ہیں اور مولانا کے مریدین میرے مریدین ہیں" (مفہوم)

ایک دن حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نماز مغرب پڑھانے کا حکم دیا، نماز کے بعد حسبِ معمول اسی وقت تبصرہ فرمایا کہ "ماشاء اللہ کلام پاک اچھا پڑھتے ہیں، بس ایک آنچ کی کسر ہے"۔ اگلے روز صبح مجھے یاد ہے کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فجر بعد والی مجلس سے فارغ ہو کر سیدھے دفتر پہونچے جس کے ایک گوشے میں مکتبہ بھی قائم تھا، یہاں سے نورانی قاعدہ خریدا اور جب ترانہ شروع ہوا تو طلبہ کی صفوں میں قاعدہ لے کر ٹھیر گئے، ترانہ پڑھا اس کے بعد قاعدہ کے طلبہ کے ساتھ ان کی کلاس میں جا کر بیٹھ گئے اور جس ایک آنچ کی کسی کی طرف شیخ نے اشارہ فرمایا تھا اس کمی کو پورا کرنے میں مشغول ہو گئے، یوں آپ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ شیخ کی خدمت میں حاضری ایک طالبِ صادق اور عاشقِ کامل کی حیثیت سے ہوئی ہے کہ وہ ہر حکم کی تعمیل اور ہر اشارہ پر قربان ہوا کرتا ہے، نہ کہ اکرام و توقیر کا متمنی و منتظر!

[1] حضرت محی السنہؒ کے محبوب استاذ فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ وقفے وقفے سے پورے مدرسہ کا دورہ کرتے رہتے تھے، دن میں بھی راتوں میں بھی، حسب معمول شعبۂ حفظ کے درجات سے گذرے تو دیکھا کہ ایک شیخِ کامل جس کے اپنی جگہ ہزاروں مریدین وطالبین ہیں جو ہر دم اس کی دست بوسی وزیارت کے لئے بے تاب رہتے ہیں اور جس کی مجالس سے خود یہاں سینکڑوں بندگانِ خدا استفادہ کر رہے ہیں، وہ تجوید میں ایک آنچ کی کمی کو دور کرنے کمسن بچوں کے ساتھ بیٹھ کر نورانی قاعدہ کی تصحیح کر رہا ہے تو بہت متاثر ہوئے[1] عصر کے بعد کی مجلس میں اس منظر کا نقشہ کھینچتے ہوئے گلو گیر ہو گئے اور یہ شعر پڑھا۔

این چنیں شیخے گدائے کو بکو
عشق آمد لاابالی، فاتقوا

ایک روز کسی گاؤں سے گنے کا رس طلبہ کے لئے آیا ہوا تھا، بڑے بگھونے میں چبوترے کے سامنے رکھ کر ایک ڈونگے سے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے خود ہی تقسیم فرمانا شروع کیا، طلبہ دوڑ دوڑ کر اپنے برتن لے کر آتے اور لائن میں کھڑے ہوتے جا رہے تھے، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے کمرے میں بیٹھے واردین وزائرین سے محو گفتگو تھے، جب آپ کی نظر پاس کی کھڑکی سے اس منظر پر پڑی کہ شیخ اپنے دستِ مبارک سے تبرک تقسیم فرما رہے ہیں اور طلبہ اس سے محظوظ ہو رہے ہیں تو اچانک حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے، کمرے میں ادھر اُدھر دیکھ کر ایک پیالہ اٹھایا اور جلدی سے باہر آ کے خود بھی لائن میں لگ گئے، جب ان کا نمبر آیا اور حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مسکرائے اور ان کے پیالے میں بھی رس ڈال دیا، مرید صادق کی ان اداؤں سے شیخِ کامل کا دل کتنا خوش ہوتا تھا ہو گا؟ یہ بات یہاں پھر تازہ کر لیجئے کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ عمر میں حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ زیادہ چھوٹے نہ تھے۔

---

[1] حضرت محی السنہؒ نہایت رقیق القلب اور محبت بھری ہستی تھے، خواہ مخواہ ہی یاروں نے انہیں شدید و مدید مشہور کر دیا تھا۔ بقول حضرت حکیم صاحبؒ "میرا شیخ عاشق مزاج ہے مگر شانِ انتقام غالب ہے"۔

ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کسی بات پر ناراض ہو گئے اور اپنے دفتر میں چلے آئے، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک پرچے پر معذرت نامہ لکھ کر اسے پیش کرنے کے لئے دفتر اہتمام پہونچے، اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ تنہا تھے، راقم خدمت میں موجود تھا، حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب اندر داخل ہوئے اور درخواست پیش کرنی چاہی تو حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ پھر ناراض ہو گئے، فرمانے لگے ''باہر اعلان لگا ہے کہ بغیر اجازت اندر نہ آئیں، پھر کیسے داخل ہو گئے؟ بس ہر شخص اپنے کو مستثنیٰ اور مقرب سمجھا ہوا ہے، یہی تو مانع ہوتا ہے ترقی میں'' خوب یاد ہے کہ فوراً حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہر نکل گئے، اور چلمن کے پیچھے کھڑے ہو کر نہایت دبی آواز میں عرض کیا ''اختر حاضر ہونا چاہتا ہے'' اجازت ملی تو تشریف لائے اور عریضہ پیش کیا، حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے لے کر رکھ لیا یا اسی وقت جواب لکھ کر دیدیا۔[1]

اللہ اللہ! کیسی محبتیں تھیں یہ اور کیسا صدق واخلاص! ؎

خونِ دل پینے کو لختِ جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناتیرے دیوانے کو

اللہ پاک ہمیں بھی اس اخلاص کا کوئی حصہ نصیب فرمائے۔ آمین

ایک دن ہم طلبہ نے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ طلبہ میں بھی حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہونا چاہئے، حضرت نے اس کا باقاعدہ انتظام فرمایا، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد نبوی: ''اشراف امتی حملة القرأن واصحاب اللیل'' پر مختصر بیان فرمایا، اس بیان کا یہ جملہ اچھی طرح یاد رہ گیا کہ آپ نے فرمایا تھا: ''اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حافظِ قرآن کو تہجد گذار بھی ہونا چاہیے'' پھر اخلاق واعمال کے تحفظ پر بہت مؤثر باتیں بتا کر دعا کرائی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس چل رہی تھی، ڈاکٹر رفیق بلگرامی

---

[1] حضرت محی السنہؒ کا طریق اصلاح کچھ ایسا ہی تھا جو جتنا قریب ہوتا اس پر خفگی کا اتنا ہی زیادہ حق سمجھتے تھے، اور یہ وہی لوگ ہوتے تھے جن کا عشق شیخ ان کی اس ادائے تغافل وبے التفاتی سے دور نہ ہوتا بلکہ خوب مزے لیتا تھا۔

بھی موجود تھے، ڈاکٹر صاحب خود پختہ گو شاعر اور خوش الحان ہیں، ان سے حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کلام پڑھنے کی خواہش کی گئی تو انہوں نے کھڑے ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار:

نہ گلوں سے مجھ کو مطلب نہ گلوں کے رنگ و بو سے
کسی اور ہی سمت کو ہے مری زندگی کا دھارا

پڑھنے شروع کئے تو اس میں ان سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے ''نہ گلوں سے مجھ کو رغبت'' پڑھ دیا، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً سر اٹھا کر فرمایا: ''مطلب'' کہئے ''رغبت'' نہیں۔ رغبت تو حسن و جمال کی طرف ہم کو بھی ہوتی ہے، کیا اہل اللہ نامرد ہوتے ہیں؟ ان میں بھی حسینوں کی جانب میلان و رغبت فطرتاً پائی جاتی ہے مگر وہ بالقصد اس سے تجاہل وتغافل برت کر اپنے نفس کو حرام لذتوں سے بچاتے ہیں، ''مطلب'' میں اس تجاہل کی ترجمانی کی گئی ہے، مطلب اور رغبت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ راقم عرض کرتا ہے کہ واقعی یہ غیر معمولی فرق ہے جو اہلِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں؛ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کوئی تک بندی اور قافیہ سازی تھوڑا ہی تھی، دل مضطرب اور فکر دردمند کی ترجمانی تھی۔

غرض! بچپن سے نوجوانی تک جس شخصیت کا نام ہمیشہ احترام سے سنا تھا، جس کی تحریریں دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں اور جس کے دیکھنے کو آنکھیں اور سننے کو کان ترستے تھے وہ شخصیت ملی تو ایسی جگہ ملی جو بقعاتُ الہند میں میرے لئے اشرف البقع تھی اور جہاں میرا محبوب شیخ پورے جاہ وجلال کے ساتھ ہر طرف حکمراں وامرکناں تھا؛ بہت مزہ بھی آیا اور بہت نفع بھی ہوا؛ رحمهما الله رحمة واسعة

اس سفر میں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہردوئی شہر کے علاوہ ہندوستان کے بعض دوسرے شہروں میں بھی تشریف لے گئے، اپنے وطن اعظم گڑھ بھی گئے اور حیدرآباد بھی گئے، میرے والد ماجد ــــ جن کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ ہردوئی اپنے شیخ کی خدمت میں چودہ برس رہ چکے تھے، اس زمانے میں حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا ہردوئی میں کافی قیام

رہتا تھا اور کبھی حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ پھولپور چلے جاتے تھے —— کو بھی دونوں جگہ حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کا شرف حاصل رہا، اور اسی نسبت سے حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نیاز حاصل ہوتا رہا۔ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اگر چہ عمر کے اعتبار سے حضرت ہردوئی سے ۴؍ سال چھوٹے تھے مگر حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ا؍سال اور حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ۳؍سال بڑے تھے؛ لیکن چونکہ ان بزرگوں سے انہوں نے علم ومعرفت، اخلاق و تہذیب سب کچھ حاصل کیا تھا اس لئے ان کے سامنے ادنیٰ طالب علم اور کمترین خادم کی طرح رہتے تھے اور رہنا بھی چاہئے تھا؛ کافی عرصہ کے بعد جب حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہندوستان تشریف لانے کا علم ہوا تو حیدرآباد سے ان کی خدمت میں ایک عریضہ لکھ کر ہردوئی روانہ فرمایا، یہ عریضہ اور جواب تبرکاً نقل کر رہا ہوں، اس میں اصاغر کی نیازمندی اور اکابر کی خرداں پروری کی ایک جھلک نظر آئیگی اور بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔

مخدومی مدظلہ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ ناکارہ ہردوئی میں اور پھولپور میں بھی حضرت والا سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے، پھر وہاں سے احقر کا اپنے اس وطن حیدرآباد میں جو تبادلہ ہوا تو اب تک یہیں قیام ہے؛ آپ یاد آتے رہتے ہیں، بہت عاجزی کے ساتھ یہ کمترین آپ سے درخواست دعا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے اور مشکلات دور فرمائے، بزرگوں کی اتباع اور رمضان شریف کے حقوق ادا ہوں، حسن خاتمہ نصیب ہو، آمین۔ احقر عبدالغنی عفی عنہ ۲۲؍شعبان ۹۶ء

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب روانہ فرمایا:

مکرمی مولوی صاحب زید لطفہٗ السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

آپ کا نقش قلب میں محفوظ ہے یعنی آپ کو بھول نہ سکا، آپ کے محبت نامہ سے قلب نہایت درجہ محظوظ ومسرور ہوا، پرانا زمانہ گویا یاد آ گیا، آپ کا قیام ہردوئی میں جب تھا آپ

سے ملاقاتیں خوب یاد ہیں، دعا کرتا ہوں اور آپ سے بھی حسن خاتمہ، مغفرتِ بے حساب اور جنت میں رفاقت مع الصالحین کی دعا کی گذارش ہے۔ تازہ شعر ؎

مدت ہوئی ہے آپ کو دیکھے ہوئے مگر
اب تک ہے میرے دل میں کیوں محفوظ تری یاد

والسلام/محمد اختر عفا اللہ عنہ

اس دفعہ جب حضرت حکیم صاحب حیدرآباد تشریف لے گئے تو یہ راقم عاجز ہردوئی میں ہی تھا، اس لئے اس دورے کی تفصیل معلوم نہیں، البتہ واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ شہر کی مختلف مساجد میں ان کے بیانات ہوئے، اخبارات میں اس کے تذکرے ہوئے اور قیام گاہ پر اہل تعلق کا رجوع عام ہونے لگا، ان بیانات ومجالس نے ہمارے علاقے میں کافی اچھا اثر چھوڑا۔

اگلا سفر ہند ہوا تو غالباً قانونی مجبوری سے آپ ہردوئی نہیں آسکے بعض دوسرے علاقوں میں اصلاحی دورے ہوئے، حیدرآباد بھی تشریف لائے تاہم اس دفعہ بھی مجھے صحبت وخدمت کا موقعہ میسر نہ آسکا۔

اس کے بعد غالباً سن ۱۹۸۴ء میں، پھر سن ۱۹۸۸ء میں آپ حیدرآباد تشریف لائے؛ اس زمانے میں میں مدرسہ فیض العلوم میں مدرس تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا قیام حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے ہمیشہ اسی مدرسہ میں رہا، حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طعام کا نظام بھی ہمارے گھر میں ہوا کرتا تھا،[1] اس دفعہ آپ بھوبنیشور صوبہ اڑیسہ سے ہوتے ہوئے حیدرآباد پہونچے تھے، اڑیسہ سے ساتھ میں حضرت صوفی عبدالصمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے آئے تھے، ادھر ہردوئی سے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ بھی دوسرے دن پہونچ گئے، ان اکابر کے اجتماع سے مدرسہ ایک نورانی اور روح پرور منظر پیش کررہا تھا، اور اطراف واکناف کے علماء وصلحاء کا مرکز بن گیا تھا۔

---

[1] کیوں کہ والدہ محترمہ مدظلہا والد ماجد کے ساتھ کوئی آٹھ سال ہردوئی میں تھیں، امی جان صاحبہؒ سے کھانے پکانے کا سلیقہ خوب سیکھا تھا۔

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کے لئے شہر کی بڑی بڑی مساجد سے درخواستیں وصول ہو رہی تھیں، لیکن حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے آنے کے بعد یہ فرما کر جگہ جگہ پروگراموں کو ختم کر دیا کہ "ایک عالم تین ہزار کلومیٹر سے سفر کر کے پہونچتا ہے اور آپ لوگ اس سے استفادہ کے لئے چند میل سے جمع نہیں ہو سکتے؟ بس مدرسہ میں قیام رہے گا اور بعد نمازِ مغرب مجالس ہوا کریں گی، جس کو استفادہ کرنا ہو یہیں آکر کرے"۔

حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ مصلح اور فطری مُربی تھے، کسی کی بڑی بڑی بے اصولیاں بھی ہضم کر جاتے تھے تو کسی کسی کے ادنیٰ زلات وغفلات سے صرف نظر کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے، بالخصوص مقربین پر تو ذرا ذرا سی بات پر غضبناک ہو کر گویا ان پر ناز فرماتے تھے، صاف محسوس ہوتا تھا کہ جس کی گرفت خلافِ مصلحت سمجھتے مگر گرفت ضروری ہوتی اور تعلیم وتربیت مقصود ہوتی تو اس وقت کسی اپنے کی باری آجاتی اور خاص نشانے پر زد پڑتی، کسی بہانے سے اس کا احتساب اور ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتے، وہ خود تو جی جی میں خوب مزے لیتا رہتا مگر بقیہ سب کی عقلیں ٹھکانے لگ جاتی تھیں۔ اس کا بارہا تجربہ ہوا، اب یہی دیکھئے نا کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حیدرآباد پہونچنے کے بعد اگلے دن حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کو پہونچنا تھا، فلائیٹ ڈیلے ہوگئی آپ کافی تاخیر سے ایرپورٹ پہونچے، آپ جانتے ہیں کہ ایرپورٹس اور ایرکرافٹس اب بھی جوانوں کو تھکا دیتے ہیں، اس وقت تو اس معیار اور ایسی سہولت کے بھی نہیں تھے؛ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ باہر نکلے تو ابھی مغرب نہیں پڑھی تھی، تھکے ہوئے بھی بہت تھے، ادھر لوگ ملنے کے لئے ٹوٹے جا رہے تھے، حسب معمول تنبیہ فرمائی اور یہ سوال کیا کہ آپ لوگ کب سے آئے ہوئے ہیں؟ بتلایا گیا کہ ٹھیک وقت پر آگئے تھے (تین چار گھنٹے سے منتظر ہیں) پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کس کس نے ــــ یہ سوچ کر کہ طیارہ نہیں پہونچ پایا تاخیر ہو رہی ہے کوئی بات تو پیش نہیں آگئی، کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا ــــ مسجد میں جا کر میری حفاظت وسلامتی کے لئے دو رکعت نماز پڑھی؟ دعا مانگی؟ سب خاموش رہے، کسی نے اثبات میں جواب نہیں دیا، فرمایا: "یہ حال ہے، ملنے کے لئے گرے

جارہے ہیں ایک دوسرے کو دھکے دے رہے ہیں، بڑی محبت کا اظہار کررہے ہیں، اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ دو رکعت نماز پڑھتے دعا کا اہتمام کرتے، کچھ نہیں سب دکھاوا ہے،'' اس تنبیہ کے بعد کسی سے نہیں ملے سیدھے مسجد گئے نماز ادا کی اور اس کے بعد قیامگاہ کی طرف روانہ ہوگئے؛ جب مدرسہ فیض العلوم پہونچے تو حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس ابھی ختم ہوئی تھی، کافی مجمع موجود تھا، جیسے ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کار آکر رُکی سب نے گھیر لیا اور جیسا کہ عوام کا انداز ہے ایسا اژدحام کیا کہ کار کا دروازہ کھولنا مشکل ہوگیا، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے زور سے اعلان کردیا کہ ''بہت تھکا ہوا ہوں، اس وقت کسی سے نہیں ملوں گا، فجر کے بعد ملاقات کروں گا''۔ منتظمین نے کسی طرح مجمع کو دور کرکے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو مہمان خانے تک پہونچا دیا؛ اس وقت حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حجرہ میں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو طلب کرکے ناز بھرے انداز میں خوب شکوہ کیا کہ ''آپ جب پہلے سے یہاں موجود تھے تو آپ سے یہ نہ ہوسکا کہ لوگوں کو سمجھاتے روکتے اور کہتے کہ دور سے سفر کرکے آرہے ہیں، بوڑھے ہیں، اس وقت کوئی ملاقات نہ کرے وغیرہ'' حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سر جھکائے سنتے رہے، پھر باہر آکر فوراً ایک عریضۂ معذرت تحریر کرکے لے کر آئے، اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کچھ اور بگڑے کہ یہ کوئی موقعہ ہے تحریر دینے کا؟ یہ سن کر حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی قیام گاہ واپس ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمت کرکے میں نے عرض کیا کہ حضرت عشائیہ تیار ہے کیا دسترخوان لگادیا جائے؟ ان بے اصولیوں پر ناگواری کا اثر باقی تھا، کچھ دیر چُپ رہے پھر فرمایا: ''صرف ہمارے لئے لاؤ، باقی سب مہمانوں کو گھر پر کِھلا دو'' چنانچہ ایسا ہی ہوا؛ عرض کرنا یہ ہے کہ جب حضرت نماز پڑھ کر لیٹ گئے، دیگر مہمانوں کے لئے ہمارے گھر ہی دسترخوان لگا، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت صوفی عبدالصمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بہت مزے لے لے کر اپنے شیخ کے اس ناز آمیز عتاب کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا ''آپ کے شیخ (حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ) کا جلال کیسا تھا؟'' صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اگر آپ اس کو دیکھ لیتے تو اس کو بھول جاتے''۔ صبح ہوئی تو حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ بہت

خوش تھے، حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس کا قیام کا راحت کا برابر فکر فرماتے رہتے تھے ،اسی سفر میں کسی موقعہ پر انہیں" عارف باللہ" قرار دیا، جو بعد میں ماشاءاللہ یہ لقب ان کے اسم گرامی کے ساتھ مستقل پیوست ہو گیا۔

ایک دن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے وقت لے کر عرض کیا کہ" اب میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، بچے بھی بڑے ہو کر خود مکتفی ہو گئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی خانقاہ میں آکر بقیہ عمر پڑا رہوں اور کچھ سیکھ لوں" حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ساری تفصیل سُنی اور یہ ارشاد فرمایا'' اس عمر میں گھر اور گھر والوں سے دور رہنا بالکل مناسب نہیں ہے، آدمی کو جب بڑھاپا اور ضعف ہو جاتا ہے تو اپنے بال بچوں کو دیکھ دیکھ کر ایک قسم کی طاقت آتی ہے، جو پردیس میں بالکل حاصل نہیں ہوتی، آپ یہیں رہیں، ذکر و فکر حسب سہولت کر لیا کریں، اپنے نواسوں، پوتوں کے ہمراہ وقت گذاریں، اپنے پاس ٹافی منگوا کر رکھئے اور بچوں کو دیتے رہیے تاکہ وہ بھی آپ سے مانوس رہیں، اور دیکھئے ٹافی سخت والی ہونی چاہیے نرم والی نہیں، نرم والی سے معدہ اور دانت خراب ہو جاتے ہیں''۔ اسی طرح دیر تک بڑی بے تکلفی سے بات فرماتے رہے، ادھر الحمد للہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن میں جو داعیہ ہجرت کا شدت سے پیدا ہوا تھا وہ سرد پڑتا گیا اور مدت العمر اپنے بال بچوں میں اور ذکر و فکر میں مشغول رہ کر عالم آخرت کو سدھار گئے۔

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیانات سے متاثر ایک سرکاری ملازم نوجوان ان کے قافلے میں شامل ہو کر حیدر آباد پہونچے تھے، صبح کی نماز کے بعد حضرت تفریح کے لئے نکلے تو آبادی سے ذرا دور تک چلے گئے، جہاں بڑا میدان تھا، کچھ دیر چہل قدمی کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ تو رکشے پر سوار ہو کر واپس ہو گئے، یہ نوجوان کرکٹ کے دل دادہ تھے تو انہیں میدان دیکھ کر بہت جوش آیا اور چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر بولنگ میں مشغول ہو گئے؛ مدرسہ پہونچ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیان شروع کر دیا، تھوڑی دیر بعد درمیانِ بیان ہی ان صاحب کو یاد فرمایا، پتہ چلا کہ ابھی نہیں پہونچے ہیں، پھر جب وہ مجلس میں داخل ہو رہے تھے

تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھ لیا اور تاخیر کی وجہ دریافت کی، کھیلنے میں مشغول ہونے کا جواب سن کر خفا ہو گئے کہ "جب میرے ساتھ اس لئے آئے تھے کہ استفادہ کروں گا تو پھر یہ غفلت کیسی؟ اب تم بیان کھڑے ہو کر سنو، بیٹھنے کی اجازت نہیں تاکہ آئندہ پھر ایسی غفلت نہ ہو" وہ اسی طرح اپنی جگہ کھڑے رہے، چند ہی منٹ بعد بٹھا دیا، مجلس کے بعد جب انہوں نے معذرت پیش کی تو بڑی نرمی ومحبت سے سمجھایا، فرمانے لگے: "نرم شیخ سے بعض لوگوں کو نفع نہیں ہوتا، روک ٹوک کرنے والے سے ان کا کام بنتا ہے، ویسے بھی اس میں ایک لذت ہے، کہو تمہیں اس تنبیہ میں مزہ آیا؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا: ماہرین کا کہنا ہے کہ ہڈی کے قریب کا گوشت مزیدار ہوتا ہے، میں کہتا ہوں سخت گیر شیخ کی صحبت بھی اسی طرح مزیدار ہوتی ہے"۔

ایک بڑے ہال میں آپ کا قیام تھا، جب ناشتے کے بعد لیٹنے لگے تو احقر سے فرمایا: "دیکھو بھئی کوئی امرد کمرے میں نہ آنے پائے، طلبہ صرف مجالس میں بیٹھ کر استفادہ کریں"۔ ان دنوں گرمی چل رہی تھی، روح افزاء کی آمیزش کے ساتھ دودھ کی فرمائش کی اور فرمایا: "ہر بیان کے بعد ایک گلاس دیدیا کرو، میں دردِ دل اور جوشِ قلب کے ساتھ بیان کرتا ہوں، ضعف اور خشکی ہو جاتی ہے" کبھی درمیان وعظ بھی یاد فرمالیتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت کی مجلسِ وعظ جاری تھی، اثناء وعظ مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ[1] تشریف لے آئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں دیکھا تو اوپر تخت پر آجانے کی فرمائش کی، انہوں نے انکار کیا حضرت کے اصرار پر بھی انہوں نے یہی کہا کہ یہاں سے مجھے آپ کو دیکھنے اور غور سے سننے میں سہولت ہے، اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مولانا خاک نشینی کو ترجیح دے رہے ہیں اور کہنا چاہتے ہیں کہ ؎

[1] مولانا محمد رضوان القاسمیؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور نہایت ہی قابل عالم دین، حیدرآباد کی ایک بڑی مسجد کے خطیب اور دارالعلوم سبیل السلام کے بانی وناظم تھے، وہ حضرت حکیم صاحبؒ کے مواعظ اور ان کی ملنسار ومحبت بار شخصیت سے کافی متأثر تھے، پہلے سفر میں انہوں نے ہی حضرت کی مجالس کو اخبار "نوید دکن" میں شائع کرانے کا اہتمام کیا تھا، انہوں نے ہی اسفار حیدرآباد کی مجالس کو "باتیں ان کی یاد رہیں گی" کے نام سے مرتب کر کے چھپوایا تھا۔

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بیٹھاؤ تم
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک معتبر عالم دین نے اپنے مدرسہ میں تکمیل بخاری کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائش کی، حضرت نے بہ خوشی قبول فرمایا، پھر انہوں نے ظہرانہ کی بھی دعوت دی تو اسے بھی قبول فرمالیا۔ عین جلسے سے پہلے ــــ ایک صاحب جو اہل علم میں سے تو نہ تھے اہل صلاح تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد ہو گئے تھے ــــ اُن مولانا کی ایک کتاب لے کر آئے، اس میں کسی سیمنار میں پڑھا ہوا مقالہ دکھلایا جس میں انہوں نے مودودی صاحب کی تعریف کی تھی ــــ حقیقت اس کی بس اس قدر تھی کہ انھوں نے کسی ادبی وعلمی سیمنار کے لئے استقبالیے میں سرزمین دکن کی خصوصیات بتلاتے ہوئے بلالحاظ مسلک ومشرب یہاں کی بڑی بڑی علمی شخصیتوں اور جامعات کا ذکر کیا، اور اس میں مودودی صاحب کا بھی نام تھا ــــ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مودودی صاحب سے ان کی تحریروں میں موجود حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور اصحاب عظام رضی اللہ عنہم کی شان میں ناروا تبصروں اور بے جا تنقیدوں کی وجہ سے للّٰہی بغض تھا، جیسا کہ تمام اکابر علماء کو تھا اور ہے، موصوف نے کچھ اس طرح اس مسئلے کو اٹھایا تھا کہ گویا وہ عالم مودودی الفکر ہیں دیوبندی المسلک نہیں؛ یہ جان کر حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جوش آ گیا، فرمایا ”ایسے عالم کے مدرسہ میں میں ہرگز نہیں جاؤں گا، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گستاخی کرنے والوں کی تائید کرتا ہے، میں اس کے ہاں ایک گھونٹ پانی پینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں؛ چنانچہ جب وہ مولانا صاحب حضرت رحمہ اللہ کو لینے کے لئے آئے تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے منع فرمادیا اور وجہ بھی بتلادی، انہوں نے کچھ اصرار کیا اور پھر مایوس ہو کر چلے گئے، بدگمان بھی ہو گئے، ایک اخبار کے کالم نگار تھے تو اس میں اگلے ہی ہفتے ایک مضمون بھی لکھ دیا کہ بڑے بڑے علماء چغل خوری سے متأثر ہو جاتے ہیں وغیرہ۔

میں نے اس واقعے کو مضمون میں اس لئے شائع کرلیا کہ دو باتوں کی طرف قارئین کی

توجہ مبذول ہو سکے، ایک تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی غیرت مسلک اور حمیت صحابہؓ جو اہل سنت کے ایمان کا ایک حصہ اور ان کی پہچان ہے؛ امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''ہم اصحاب رسول اسے محبت کرتے ہیں ان کا ذکر خیر اور بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں، ان سے محبت کرنے والوں سے محبت اور ان سے بغض رکھنے والوں سے بغض رکھتے ہیں'' اسی عقیدے کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فیصلہ عین ایمان کے مطابق تھا؛[1] دوسرے حضرت رحمۃ اللہ علیہ تک یہ بات پہونچانے اور بلا مشورہ و تحقیقِ کامل کے ان عالم صاحب کو مودودیت سے متہم کرنے والے صاحب کی جلد بازی و بے احتیاطی، کیوں کہ اگرچہ انہوں نے کسی موضوعاتی مقالے کے ضمن میں علمی شخصیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کئی غیر اہل حق علماء کا نام لیا تھا مگر وہ خود پختہ فکر دیوبندی تھے اور ان کے مدرسے میں خالص درس نظامی کی تعلیم ہوتی تھی، وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس سے مستفید ہو رہے تھے، اسی تاثیر کی بنیاد پر طلبہ و اساتذۂ مدرسہ کے نفع کو مدنظر رکھ کر انہوں نے یہ نظام بنایا تھا؛ ان صاحب نے اگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے سے قبل ہم لوگوں سے بھی مشورہ کرلیا ہوتا تو یہ ناخوشگوار صورت نہ بنتی، اگرچہ یہ مولانا صاحب چند برس کے بعد کراچی گئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی بدگمانی کی معافی بھی مانگ لی مگر اس وقت نو فارغ طلبہ علماء اور عوام کا ایک بڑا مجمع حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درد انگیز و محبت خیز خطاب کو سن لیتا تو نہ معلوم کتنے بندگانِ خدا کو اہل اللہ کی قدر معلوم ہو جاتی خیر! کان امر اللہ قدرا مقدورا۔[2]

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آخری سفر

---

[1] ہمارے اکابر کو مودودی صاحب اور ان کی جماعت سے ذاتی عناد کچھ نہیں، بس انبیاءؑ وصحابہؓ کی شان میں ہو چکی گستاخیوں کا اعتراف اور ان کی تلافی نہ کرنے کی وجہ سے اختلاف ہے اور شدید ہے۔

[2] کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جن لوگوں کو بڑوں کا تقرب واعتماد حاصل ہو جائے انہیں دوسروں کا تذکرہ کرنے میں بہت احتیاط و حزم سے کام لینا چاہئے، کیوں کہ ایسے مقامات پر ادنیٰ بھول سے کبھی بڑا نقصان ہو جاتا ہے، بعض لوگ بزرگوں کے ہاں یہی کارنامے انجام دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، گو ان کی نیت صحیح ہو مگر عمل بہر حال ناپسندیدہ ہے۔ جس وقت حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو اپنی شوریٰ میں شامل فرمایا تھا تو حضرت عباسؓ نے انہیں بلا کر جن چار باتوں کی تاکید فرمائی تھی ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اس تقرب سے فائدہ اٹھا کر تم دوسروں کی شکایات ان کے ہاں نہ پہونچاتے رہنا۔

میں ہم خدام نے التجا کے ذریعے چار ضلعوں کے صدر مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سفر طئے کر لئے تھے، حضرت بخوشی و بہ دلجمعی راضی تھے، تمام سرکاری کاروائیوں کی تکمیل کی گئی، ویزا لگ کر آ گیا، حضرت بہت اچھے موڈ میں تھے، نہایت خوشگوار ماحول میں پہلا سفر شروع ہوا، ایک ایسے ہی مخلص مگر نادان صاحب نے ہم سے بہت اصرار کیا کہ میں حضرت کی گاڑی میں قدموں میں بیٹھ کر چلنا چاہتا ہوں، ہم لوگوں نے بار بار اصرار کی وجہ سے انہیں بٹھا دیا، ایک ساتھی سے معلوم ہوا کہ وہ راستے میں حضرت کو یہ یاد دلاتے رہے کہ آپ کے شیخ نے گذشتہ سفر میں یہ کہا تھا کہ لوگوں کو یہیں آ کر ستفادہ کرنا چاہئے، اور آپ کا نظام ایک ہی جگہ بنوایا تھا، اگر ان کو معلوم ہوگا کہ آپ جگہ جگہ گئے ہیں تو وہ خفا نہ ہو جائیں، اور یہ اور وہ، یہاں تک کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں انقباض اور تکدر پیدا ہو گیا، وہاں پہونچتے ہی حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ہم لوگوں کو بلا کر فرما دیا کہ بھئی ہم کہیں نہیں جائیں گے، بس حیدر آباد ہی میں قیام رہے گا؛ ہم لوگ صورتحال کو سمجھ چکے تھے اس لئے سوائے تسلیم و رضا کے اور کوئی صورت نہ تھی، لیکن بہر حال اس کا ملال تو اب بھی ہے کہ نہ معلوم اس اللہ والے کے قدم ان علاقوں میں پڑتے تو وہاں کتنا نفع اور فائدہ ہو جاتا اور بہت سے صلحاء جو غربت کی وجہ سے حیدر آباد تک نہیں پہونچ سکتے تھے وہ بھی زیارت وصحبت سے مشرف ہو جاتے یہ صاحب حضرتؒ کے نہ داعی تھے نہ منتظم نہ میزبان، انہیں اس کی ضرورت ہی نہ تھی، مگر کچھ طبیعتیں ہوتی ہی ایسی ہیں جن سے خیر کم اور ضرر زیادہ وجود میں آتا ہے؛ فالی اللہ المشتکی۔

الحمد للہ حضرت حکیم صاحب کو حیدر آباد دکن کے اسفار میں جی لگا تھا اور یہاں کے متعلقین سے انہیں قلبی وابستگی تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے چند ایک کلمات کافی ہیں جو انہوں نے اس عاجز کی دعوت ناموں کے جواب میں لکھے تھے۔

ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

✷ "محبی ومکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، دل سے حاضری حیدر آباد کا مشتاق ہوں، ویزا کی آسانی کی دعا کریں، پکا ارادہ ہے۔۔۔۔۔۔حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ"۔

✵ "مزاج شریف! آپ کا محبت نامہ ملا، دل بہت خوش ہوا، دعا کیجئے کہ سفر ہندوستان کے لئے ویزا کی آسانی رونما ہو۔۔۔۔۔حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ"۔

✵ مزاج گرامی! آپ کا محبت نامہ موصول ہوا، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اپنی رحمت سے احقر کی اور آپ سب کی اصلاح تام فرمائے، آمین۔آپ اور جناب معین الدین سلمہ اور جملہ احباب اے پی یاد آتے ہیں لیکن ویزا کی دشواریاں سخت ہیں، ہند کا ویزا آفس اسلام آباد میں ہے کراچی والوں کے لئے جانا سخت مشکل ہے،سب احباب سے صحت اور عمر کی برکت کے لئے دعا کی گذارش ہے۔۔۔۔۔حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ"۔

✵ "آپ کا مرسلہ احقر کا "مجموعہ نعت شریف" ملا، دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین،آپ کی محبت اور یاد فرمائی سے قلب مسرور رہا، ویزا یہاں سے ملنا سخت دشوار ہو رہا ہے، احقر خود آپ جیسے مخلص احباب سے ملاقات کا مشتاق ہے۔۔۔۔۔حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ"۔

✵ "آپ کا مرسلہ "نذرانۂ عقیدت" جو آپ نے طبع کیا ہے دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، آپ کو بہت جزاک اللہ کہتا ہوں اور بہت دعا کرتا ہوں، فی الحال سفر ہندوستان میں ویزا وغیرہ کی بہت مشکلات ہیں، اور اب صحت بھی زیادہ اسفار کی متحمل نہیں، احقر کی صحت وعافیت، دینی خدمت اور شرفِ قبولیت کے لئے دعا کی گذارش ہے۔۔۔۔۔حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ"۔

حضرت حکیم صاحبؒ کا جو آخری سفر ہند ہوا تھا اس میں حیدر آباد کا ویزا نہ لگ سکا، یہاں آنے کے بعد سعی کی گئی جس میں برادرِ محترم مفتی عبد المغنی صاحب مدظلہ کی بھی جد وجہد رہی کافی عرصے سے وہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خط وکتابت کے ذریعہ آمادہ سفر حیدر آباد کئے ہوئے تھے، بفضلہٖ تعالیٰ سفر کے مقاماتِ اجازت میں حیدر آباد شامل ہوا، اور جب حیدر آباد تشریف لائے تو مقامی عہدہ داروں کے ذریعہ برادرِ محترم نے اے پی کے چار ضلعوں کو شامل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، گو ان میں سے صرف ایک ہی جگہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے جا سکے۔

اس آخری سفر حیدرآباد میں حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظام نہ بن سکا اس لئے وہ تشریف نہیں لائے ہم لوگوں نے حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خوب ناز کیا، گویا ہم نے انہیں خوب تھکایا، بیانات بھی خوب کروائے تفریحی پروگرام بھی بنائے، انہوں نے ہمیں پدرانہ شفقت دی، ان کی صحت تو الحمد للہ بہت اچھی تھی، البتہ بڑھاپا بہر حال تھا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے ہماری بہت رعایت فرمائی اور ناز برداری فرماتے رہے؛ اللہ پاک انہیں اس محبت وشفقت کا بھرپور بدلہ عطا فرمائے، ہمارا ہر ہر رونگٹا ان کا ممنونِ احسان ہے۔

ہم انہیں لے کر ایک دن یہاں کے ذخیرۂ آب ''عثمان ساگر'' گئے، کھانا پکانے کا سارا سامان ساتھ لے گئے، کچھ لوگ کھانا پکانے میں مشغول رہے کچھ لوگ پانی کے کنارے بچھائے گئے فرش پر آپ کے ہمراہ ذکر وتلاوت میں مشغول رہے، جب آپ کی طبیعت خنک ہواؤں اور خوشگوار فضاؤں سے خوب کھل گئی اور نصائح کا سلسلہ شروع فرمایا تو ارشاد ہوا کہ جو پکانے میں مشغول ہیں انھیں بھی بلالو، ایک بات بتاتا ہوں، جب سب آگئے تو ارشاد فرمایا: سمندر کا پانی اللہ پاک نے بہت مقدار میں بنایا ہے، لوگ ایک ملک کے ساحل سے دوسرے ملک کے ساحل تک ہزاروں میل کا سفر کرتے ہیں مگر کوئی شخص یہ پانی پیتا نہیں، کیوں کہ کڑوا ہوتا ہے، اسی طرح اس دنیا کو ایک سمندر سمجھو، ماں کے پیٹ سے قبر کے پیٹ تک اس ساحل سے اس ساحل تک چلے جاؤ یعنی دنیا ہی میں زندگی گذارو، مگر دنیا کی محبت میں مبتلا ہوکر کوئی گناہ نہ کر بیٹھو، گناہوں کی مذمت بالخصوص بدنگاہی کے برے نقصانات پر کافی دیر تک سمجھاتے رہے، پھر فرمایا اب جلدی ناشتے کا بندوبست کرو، چنانچہ ساتھیوں نے ناشتہ تیار کر کے دسترخوان بچھایا، آپ تشریف لائے، ناشتے کے بعد واپس قیام گاہ پہونچ گئے۔

ایک دن ''زولاجیکل پارک'' لے گئے، جب اس میں داخل ہوئے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہم لوگوں کو روک کر فرمایا: ''اللہ پاک نے جنھیں دیکھنے کی اجازت دی ہے انہی کو دیکھو جن کا دیکھنا منع ہے ان پر ہرگز نظر نہ اٹھنے پائے، جس مخلوق کو دیکھو حق تعالیٰ کی عظمت و قدرت کا تصور کر کے سبحان اللہ کہو، نگاہوں کی حفاظت کرو'' پھر دریافت فرمایا: ظہر کی نماز

کہاں ادا کی جائے گی؟ عرض کیا گیا اندر مسجد ہے اسی میں پڑھیں گے، تو فرمایا: راستے میں جو مسلمان ملیں اُن سے کہو کہ ظہر کے بعد مسجد میں بیان ہوگا، آپ بھی ظہر مسجد میں ادا کریں، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ مسجد پہونچے، ان کے ساتھ جو عورتیں تھیں وہ بھی مسجد کے باہر لان میں اکھٹا ہوگئیں، حضرت نے بعد نماز بہت مختصر مگر انتہائی مؤثر و پُردرد بیان فرمایا، سب لوگ کہنے لگے "آج کی تفریح یادگار رہے گی"۔

ایک دن میں نے مدرسہ کے لئے خریدی گئی زمین پر تشریف لے چلنے کے لئے کہا تو تیار ہوگئے، فجر بعد کا وقت طئے ہوا تھا، یہ جگہ شہر سے کنارے ویران پہاڑیوں میں تھی، ہم نے وہاں کچھ صفائی کروائی، ٹینٹ لگوائے، رات ہی سے کھانے وغیرہ کا نظم کیا، کچھ احباب کو جمع کیا، جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو لے کر ہم وہاں پہونچے تو صبح کا وقت تھا، ہَوا و فضا خوشگوار تھی، حضرت گاڑی سے اُتر کر ٹہلتے رہے، پھر احقر کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر اوپر کی طرف چڑھنا شروع کیا، بہت اچھے موڈ میں تھے، ہم سب ان کے تابناک اور متبسم چہرے کو دیکھ کر پھولے نہیں سما رہے تھے، دھیرے دھیرے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے، ہم لوگوں کو کبھی وہاں تک چڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، چونکہ وہاں تک جانے کا کوئی نظام نہ تھا تو یونہی خالی ہاتھ پہونچے تھے، اوپر پہونچ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک چٹان پر بیٹھ گئے، جتنے لوگ ساتھ گئے تھے وہ سامنے ادھر اُدھر بیٹھ گئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آیت کی تفسیر فرمائی، ایک حدیث کی تشریح کی پھر مثنوی کا ایک شعر پڑھ کر اس کی وضاحت فرمائی، ہم غافل یونہی سنتے رہے، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اخیر میں فرمایا: درسِ قرآن بھی ہوگیا، درسِ حدیث بھی اور درسِ تصوف بھی ان شاءاللہ اب یہاں سے یہ تینوں کام ہوتے رہیں گے؛ پھر نیچے آکر ناشتہ کیا اور حاضرین سے خطاب فرمایا: اب ان شفقتوں کو سوچ سوچ کر دل غمگسار اور آنکھیں اشکبار ہوئی جارہی ہیں، حق تعالیٰ ان کی بے حساب مغفرت فرما کر بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین

حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم اپنے شیخ حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں

کہی تھی ۔

کیسی ظالم ہے تقریر کیسی ظالم ہے تحریر
یہ ہے آہوں کی تاثیر یہ ہے نالۂ شب گیر

ان کے آنے سے پہلے ہی اس کی کیسٹس عام ہوگئی تھیں، ایک بزرگ نے پیر دباتے ہوئے عرض کیا: آپ کی نظم میں حضرت کی تقریر وتحریر کے لئے ''ظالم'' کا لفظ اچھا نہیں لگتا ہے، حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برجستہ فرمایا ''ظالم! تجھے ظالم کے معنے ہی نہیں معلوم'' شاعری میں پیاری اور محبوب شئے کے لئے بولا جاتا ہے، جیسے حسینوں کو بُت کہہ دیا جاتا ہے۔

راقم نے اپنی مسجد میں بیان کی درخواست کی، قبول فرمائی اور بعد نمازِ عشاء تشریف لاکر طویل وعظ فرمایا، بعدازاں وہیں پر کھانے کا نظم کیا گیا تھا، تناولِ طعام فرمایا، مسجد سے متصل حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے میں نے بنام ''فیض ابرار'' ایک مکتبہ قائم کیا ہوا تھا، دعا کے لئے عرض کیا تو اس میں تشریف لائے دعا فرمائی اور مجھے تاکیداً فرمایا: ''دیکھو! کوئی کتاب غیر معتبر یہاں سے نہ بکنی چاہیے، ہر کتاب معتبر علماء کرام کی فراہم کرو، ورنہ جتنے لوگ غلط کتابیں یہاں سے لیجا کر پڑھیں گے اور بھٹکیں گے ان سب کا گناہ اٹھانا پڑے گا''۔ الحمد للہ اس نصیحت پر آج تک عمل درآمد ہے۔

ایک دفعہ وہ کار میں بیٹھ گئے تھے، میں کچھ بات کرنے کے لئے سامنے آیا تو ان کی نگہ میرے ٹخنوں پر پڑی جن کے قریب تک پاجامہ پہونچ گیا تھا تو فرمایا: آج کل سرحد پر بمباری ہورہی ہے، سرحد کے قریب بھی مت جاؤ؛ میں کچھ سمجھ نہیں پایا، پھر ہنس کر خود ہی فرمایا پاجامہ ٹخنے کے قریب بھی مت رکھو، نمایاں طور پر اونچا رکھا کرو، لا تقربوا پر عمل کرنے ہی میں خیریت ہے''۔ الحمد للہ وہ دن تھا اور آج کا دن اس ہدایت پر مسلسل عمل ہے، جب کہ یہ ملفوظ سنا کر کتنے اور لوگوں کا عمل صحیح کرنے کی توفیق ملتی رہتی ہے؛ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

ایک دن میں نے عرض کیا: حضرت! آج کیا کھانا پسند کریں گے؟ میر صاحب کی

طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''ان سے پوچھو، یہ ماہرِ انواعِ اطعمہ ہیں'' پھر خود ہی فرمایا: آج کباب کھایا جائے گا۔

ایک سفر میں جناب ۔۔۔۔۔۔۔ صاحب حضرت سے بیعت ہو گئے تھے اور پورے سفر میں آپ کی خدمت میں رہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کسی نجی مجلس میں فرمایا تھا کہ گاؤں میں بعض اعزہ کی مالی مدد کو جی چاہا مگر میں خود سفر میں ہوں اس لئے کر نہیں پایا، چونکہ واپسی سے قبل حضرت کا دوبارہ وطن جانے کا نظام بھی تھا تو موصوف نے عرض کیا کہ حضرت! یہاں لوگ آپ کی تصنیفات حاصل کرنے کے لئے بے چین ہیں، ہندوستان میں چھپی بھی نہیں ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ میں آپ کو پچاس ہزار روپئے پیش کروں آپ اسے جس طرح چاہیں استعمال فرمالیں اتنی رقم کی اپنی کتابیں وہاں سے بھیج دیں، میں یہاں احباب میں ان کو فروخت کرلوں گا، ہماری ضرورت بھی پوری ہوجائے گی اعزہ کے تعاون کی خواہش بھی پوری ہوجائے گی؛ حضرت نے پہلی دفعہ میں تو نہیں دوبارہ سہ بارہ اصرار پر اس پیشکش کو قبول فرمالیا؛ جو بات اس واقعے میں میں عرض کرنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا ''میں یہ رقم بطور قرض لوں گا، اور اس کی جتنی رقم بنتی ہے وہ آپ کی طرف سے حکیم مظہر میاں سلمہ کے حوالہ کر کے اس کی رسید آپ کو بھیج دوں گا، میرا آپ کا معاملہ اس پر ختم ہوجائے گا؛ کتب خانے کے ذمہ دار وہ ہیں، آپ ان سے کتابوں کی معاملت کرلیں، نرخ طئے کرلیں اور جو ترتیب بنتی ہے بنالیں؛ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ میرے مرید ہیں، اور دینی فائدہ مقصود ہے، اکثر خرید وفروخت میں طرفین کو کچھ نہ کچھ شکایت ہوجاتی ہے جو بدگمانی اور ناگواری میں تبدیل ہوجاتی ہے، اگر آپ کو مجھ سے بدگمانی ہوجائے گی تو آپ کا دینی نفع مسدود ہوجائے گا، اس لئے کتابوں کی معاملت ان سے کر لیجئے میں صرف رقم پہونچانے کا ذمہ دار رہوں گا''۔ سبحان اللہ! کیسی شفقت ومحبت ہے کہ مرید کی نظر اتنی باریک بیں نہیں تھی کہ وہ ممکنہ نقصان اور محرومی کو سمجھ سکتی، مگر شیخ کامل نے اس پہلو کی طرف توجہ دلائی، وہ صاحب بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس مخلصانہ وخیر خواہانہ مشورہ پر بہت

مسرور ہوئے اور بخوشی قبول کیا، سیکھنے کی چیز یہ ہے۔

ان سفروں میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک معمول یہ ہو گیا تھا کہ جب بھی بیان میں مسنون داڑھی کے اہتمام پر زور دیتے تو درمیان بیان ہی میں حضرت کے خادم خاص ورفیق بااختصاص جناب محترم میر عشرت جمیل صاحب مدظلہٗ کو اسٹیج پر کھڑا کر کے ان کی داڑھی دکھاتے کہ اس طرح ہر طرف سے کم از کم یکمشت داڑھی رکھو، نیز قاضی صاحب نام کے ایک بزرگ کو حکم فرماتے تھے کہ وہ خاموشی کے فوائد سنائیں، ان معمر بزرگوں کے فوراً تعمیلِ حکم کے لئے کھڑے ہو جانے کو دیکھ کر یہ سبق مفت میں مل جاتا تھا کہ بڑوں کے پاس کس طرح خود کو مٹا کر اور سراپا اطاعت بن کر رہنا چاہئے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ حیدر آباد سے ممبئی تشریف لے جارہے تھے، احقر نے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی معروف کتاب ''الکبائر'' کا اردو ترجمہ تقریظ لکھنے کے لئے پیش کیا تو فرمایا ساتھ میں دیدیں، چنانچہ ساتھ لے گئے اور ریل ہی میں مطالعہ کر کے ریل ہی میں اس پر طویل مقدمہ تحریر فرمایا، احادیث وآثار اور کبائر کی تعریف وغیرہ سب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے محض اپنے حافظے کی مدد سے لکھے تھے کیونکہ دستخط کے نیچے تحریر تھا ''اثنائے سفر حیدر آباد تا ممبئی''۔

پورے سفر میں ہر اعتبار سے بہت برکات سامنے آئیں، حضرت کی شفقتوں نے بہت نوجوانوں کو مانوس کر لیا، بعض نوجوان تو تڑپ اٹھتے تھے، کتنوں ہی نے غفلت کی زندگی سے سچی توبہ کی، کتنے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے داخلِ سلسلہ ہوئے، جب واپسی کا دن آیا تو ہمارے قلوب پر جو گذر رہی تھی گذر رہی تھی لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا دل بھی بیٹھا جارہا ہے، سامان باندھا جارہا تھا ہم لوگوں کو طلب کر کے فرمایا ''دیکھو بھئی! ایر پورٹ پر کوئی روئے گا نہیں ورنہ مجھے بھی رونا آجائے گا، خوشی خوشی روانہ کرو، مجھ کو خوشی سے جانے دو''۔ اللہ اکبر! خود بھی غمِ جدائی سے نڈھال ہو رہے تھے اور فکر تھی تو ہمیں سمجھانے اور سنبھالنے کی فکر تھی، سوچتا ہوں کہ کوئی رشتہ داری تھی؟ کوئی خاندانی یا وطنی تعلق تھا؟ خون کا ساجھا تھا؟ وہ کیا چیز تھی جو ہمارے کلیجے نکلے جارہے تھے، اوران کا دل بھی تڑپ رہا تھا، بس

ایک دین کی نسبت تھی، جو سب نسبتوں اور رشتوں سے بڑھ کر تھی، پھر خیال ہوتا ہے کہ یہ نسبت بھی تو ہر جگہ ہوتی ہے پھر ہر جگہ یہ تعلق واُنسیت کیوں نہیں پایا جاتا؟ضمیر کہتا ہے رشتہ تو ہوتا ہے مگر رشتے کی معرفت وقدر نہیں ہوتی تو اپنے پرائے ہو جاتے ہیں اور نسبت کی معرفت وقدر ہوتی ہے تو پرائے بھی اپنوں سے بڑھ جاتے ہیں، اہل اللہ کے سینوں میں جو دل ہے وہ نسبت کی معرفت رکھتا ہے ہمارے قلوب معرفت ہی سے محروم ہیں۔

الغرض حضرت تشریف لے گئے اور اپنی محبتوں کے انمٹ نقوش ہمارے قلوب پر چھوڑ گئے، کچھ دنوں کے بعد پھر ہم نے دعوتِ سفر کی سلسلہ جنبانی شروع کی مگر تقدیر خداوندی میں یہی سفر آخری قرار پاچکا تھا پھر کوئی صورت نہ بنی، اس سلسلہ میں حضرت ؒ نے جو معذرت فرمائی وہ اسطرح تھی: ''بوجہ ضعف وصعوبتِ سفر ہند کے ہندوستان کے سفر کو ماہر قلب ڈاکٹر نے منع کیا ہے، آپ کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں، محمد اختر عفا اللہ عنہ''

یہ صفر ۱۴۱۹ کی بات ہے، اسی سلسلہ میں حضرت نے یہ بھی فرمایا ''ہمیشہ میں ہی آتا رہوں؟ آپ لوگ بھی تو یہاں آیئے، اس وقت سترہ ملکوں کے لوگ خانقاہ میں موجود ہیں'' یہ بات کچھ ایسی ادا سے فرمائی کہ میں نے کراچی جانا طئے کرلیا، میں نے، برادرم محترم مفتی صاحب نے اور جناب معین الدین صاحب نے دہلی جاکر درخواست داخل کی؛ معین الدین صاحب کا تو ویزا لگ گیا، ہمیں ایک ماہ بعد رجوع ہونے کے لئے کہا گیا، وہاں سے ہردوئی گئے، حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ذکر آیا تو فرمایا: مجھ سے کیوں نہ کہا تھا، آسانی سے انتظام ہوجاتا'' ادھر جب حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کوشش ناکام ہونے کی اطلاع ملی تو جواب میں تحریر فرمایا:

''محبت نامہ ملا، دل بہت مسرور ہوا، احقر کی صحت کاملہ کیلئے کی گئی آپ لوگوں کی دعا کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور جلد ظہور فرمائیں، ویزا نہ ملنے سے بہت افسوس ہوا۔ دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آسان فرمائے، اور جلد آپ سے ملاقات نصیب ہو، جملہ مقاصد حسنہ کے لئے دعا کرتا ہوں، والد مکرم کی خدمت میں میرا سلام پیش کریں، ان کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں،

اوران سے اپنے لئے دعاؤں کا طالب ہوں۔محمد اختر عفا اللہ عنہ۔

پھراس کے بعد تو دن بہ دن سرحدی کشاکش بڑھتی چلی گئی، حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے کہ سفر پاکستان کا تصور بھی محال ہو گیا؛ جون ۲۰۰۸ء میں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ عمرہ وزیارت کی غرض سے حرمین شریفین پہونچے تھے، راقم کو بھی اسی زمانے میں سعادتِ عمرہ نصیب ہوا، خوش قسمتی سے دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آخری دیدار وملاقات بھی نصیب ہو گئی، مسجدِ نبوی سے قبلے کی جانب جو عمارت ''فنادق الحرم'' کے نام سے بنی ہوئی ہے، اس کے اس شُقّے میں جو گنبدِ خضراء کے بالکل متوازی تھا حضرت قیام پذیر تھے، جسم مفلوج اور ضعیف ونحیف ہو چکا تھا، ایک خودکار پلنگ پر آرام فرمارہتے تھے، روزانہ عصر بعد مجلس ہورہی تھی، حضرت چارپائی پر اسطرح لیٹے ہوتے کہ داہنے پلٹتے تو گنبدِ خضراء پر نظر پڑتی بائیں دیکھتے تو مجلس میں جمع احباب و متعلقین دکھائی دیتے، ایک عجیب منظر تھا، کبھی مسکراتے کبھی اشکبار ہو جاتے، بار بار گنبدِ خضراء کی طرف دیکھتے اور عشق نبوی سے وارفتہ ہو جاتے، مسکراتے تو مرجھائے قلوب کی کلیاں کھل اٹھتیں اور آبدیدہ ہوتے تو دلوں کی سنگلاخ وادی میں یادِ الٰہی وحُبِ نبوی کا سبزہ لہلہاتا تھا۔

اختتامِ مجلس پر ہاتھ میں مائیک دیا جاتا تو ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' فرماتے تھے، اس آواز کو سُن کر تمام حاضرین جھوم اٹھتے تھے، ایک دن سلام کے بعد مسکراتے ہوئے اتنا جملہ اور بڑھا کر کہ ''میں حکیم محمد اختر بول رہا ہوں'' پورے ہال پر وجد طاری فرمادیا اور خوشیوں کی مٹھاس گھول دی؛ ایک دن ان کے پوتے مولانا محمد اسماعیل صاحب زید مجدہ' مجلس میں حضرت کا وعظ سنانے کھڑے ہوئے تو پہلے یہ اعلان کیا کہ ''یہ وعظ سیدی وسندی ومرشدی وجدی عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب مدظلہ کا ہے'' تو حضرت جدی کے لفظ سے بہت محظوظ ہوئے، دومرتبہ پھر سے کہلوا کر سنا اور مسکراتے ہوئے آنسو بہاتے رہے۔

اس سفر میں جب احقر نے ملاقات ومصافحہ کیا تو بھائی معین صاحب نے نام لے کر

تعارف کرایا، حضرت نے لڑکھڑاتی زبان سے فرمایا: ”میں اچھی طرح جانتا ہوں، ان کو بھی ان کے والد کو بھی“۔ میرے ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی تھی اس کو محسوس کیا تو ہاتھ پکڑلیا اور فرمایا: ”ہمارے بزرگوں کا معمول نہیں رہا ہے، اس کو اتار کر اہلیہ کو دیدو“۔ احقر نے فوراً نکال دیا اور عرض کیا آئندہ خیال رکھوں گا، فرمایا: ٹھیک ہے۔

بس یہ زندگی کی آخری زیارت اور ملاقات تھی، اب دل ان بزرگوں کو یاد کر کر کے ترستا ہے آنکھیں ان کے نورانی چہروں کو دیکھنے اور کان ان کے پاکیزہ بول سننے کو تڑپ جاتے ہیں، مگر اب بجز اس دعا کے اور کوئی تسلی نہیں کہ الٰہی! کچھ ایسا کرم فرمادے کہ ہم جنت میں بھی جائیں اور تیرے نیک بندوں کی صحبت بھی نصیب ہو۔

احب الصالحین ولست منہم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

بنا کردند چہ خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت سید عشرت جمیل میر صاحب رحمۃ اللہ علیہ[۱]

یہ سن ۱۹۸۳ء کی بات ہے کہ عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ حیدر آباد تشریف لائے تھے، حضرت کے رفقاء سفر میں دو بزرگ حسین و وجیہہ شخصیت کے حامل مسنون حُلیے اور محمود وضع قطع میں شامل تھے؛ ایک کا نام پورا تو ذہن میں نہیں ہے، البتہ یہ یاد ہے کہ قاضی صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے، نہایت خاموش مزاج اور باوقار آدمی تھے ، غالباً ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے اور اب حضرت حکیم صاحبؒ کی صحبتِ بابرکت کو غنیمت سمجھ کر ان کی خدمت رہنے لگے تھے؛ دوسرے حضرت سید عشرت جمیل میر صاحبؒ تھے جن کے ذکر خیر کے لئے اس وقت قلم ہاتھ میں لیا ہوں؛ اُس سفر میں حضرت حکیم صاحبؒ کا معمول یہ تھا کہ بیان سے قبل قاضی صاحب کو حکم دیتے تھے کہ وہ کھڑے ہوکر خاموشی کے فوائد سنائیں، چنانچہ وہ کھڑے ہوکر نمبر وار فوائدِ خاموشی سامعین کو سناتے تھے اور دورانِ بیان مسنون داڑھی رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے مثال کے طور حضرت میر صاحبؒ کو حاضرین کے سامنے پیش کرتے تھے، کیوں کہ وہ بلند قامت اور وسیع اللّحیہ تھے، جب وہ کھڑے ہوجاتے تو حضرتؒ فرماتے ''دیکھو! کیسے شیر کی طرح لگ رہے ہیں ایسی ہی مکمل داڑھی سب لوگ رکھنے کا ارادہ کریں''۔

میر صاحبؒ سے میری پہلی ملاقات وزیارت یہی تھی، وہ اپنی پرسنالٹی اور شخصیت سے تو خود ایک بڑے بزرگ لگتے تھے اور تھے بھی بہت مخلص وخدارسیدہ بزرگ، مگر حضرت حکیم

[۱] اس مضمون کی بعض جزئیات خانقاہ سے حاصل شدہ مضامین سے لی گئی ہیں۔

صاحبؒ کے سامنے ادنیٰ خادم اور معمولی مرید کی طرح رہتے تھے، اس وقت صحت اچھی تھی اور بآسانی بھاگ دوڑ کرلیتے تھے، ہمیشہ شیخ کی خدمت میں چاق وچوبند اور دوسروں سے مقدم رہا کرتے تھے، کسی حکم کی تعمیل میں یوں سرگرم ہوتے جیسے کوئی چھوٹا بچہ استاذ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے؛ وقفے وقفے سے ڈانٹ ڈپٹ بھی ہوتی رہتی تھی، اکیلے میں بھی بھرے مجمعوں میں بھی! مگر میر صاحبؒ پر کوئی خفت وسبکی کے آثار نظر نہ آتے تھے، بلکہ خوشی و مسرت کے اثرات چہرہ پر نمایاں ہوتے تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عاشق، معشوق کی ناز برداری کررہا ہو اور اُسے محبوب کے پیار کی طرح اباء وانکار میں بھی وہی مزہ اور وہی لذت محسوس ہورہی ہو۔

حضرت حکیم صاحبؒ انھیں چاہتے بھی بہت تھے اور داروگیر بھی خوب کرتے تھے، مُرید ومُرشد کا ایک دوسرے پر ناز کرنا اسلاف ومشائخ کی تاریخ میں اور بھی ملتا ہے مگر کمیاب ونادر ہی ملتا ہے؛ مولائے رومؒ اور حسام چلپیؒ، سلطان الاولیاء، اور امیر خسروؒ، ابوالمعالیؒ اور شاہ بھیکؒ، حکیم الامت اور خواجہ مجذوبؒ، حضرت پھولپوری اور حکیم صاحبؒ جیسی معروف مثالیں اور تاریخی یادیں سامنے رکھی جائیں تو حضرت حکیم صاحبؒ اور میر صاحبؒ میں بھی کچھ ایسی ہی مناسبت ومعاملت نظر آتی تھی، حق تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

آپ کا مکمل نام سید عشرت جمیل میرؔ ہے، شمالی ہندوستان کے معروف قصبہ ''نگینہ'' میں سن ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے، علی گڑھ کالج سے گریجویشن کی تکمیل کی، پھر پاکستان منتقل ہوگئے وہاں کسی اسٹیل میل میں ملازم ہوگئے تھے، عمر کے اس حصے میں جوانی کی رعنائیاں اور حسن وجمال کی فتنہ سامانیاں میر صاحبؒ کے ـــــــ ہر نوجوان کی طرح ـــــــ ابتلاء وآزمائش کے پیغام لاتی رہیں؛ مگر ان کی طبیعت کی خداداد سلامتی وپاکیزگی انہیں ماحول کی آزادی وعیاری سے بچاتی اور مولائے مہربان کے عشق ومحبت کی جانب پھیرتی رہی، تقدیرِ الٰہی انہیں دنیائے دنی کی محبت میں ضائع ہونے سے بچا کر عشقِ حقیقی کی دولتِ لافانی سے مالا مال کرنے کا ارادہ کرچکی تھی، اسی ارادۂ خداوندی اور نوشتۂ تکوینی کے مطابق وہ دنیا کی

ہر زیب وزینت اور عیش وعشرت سے منھ موڑ کر اور حرص وہوس کی زنجیریں توڑ کر پہلے حضرت والا سے وابستہ ہوئے اور ہجرت کے بعد خانقاہِ اشرفیہ جا پہونچے، جہاں خدا کا ایک عاشقِ صادق بندہ مئے معرفت لئے بیٹھا کسی طالبِ صادق کا انتظار کررہا تھا، یا وقت کا شمس الدین کسی جلال الدین کی تلاش میں بے چین ہورہا تھا، میر صاحبؒ کو یہاں پہونچ کر وہ سکونِ قلب اور طمانینت وجمعیت نصیب ہوئی کہ رفتہ رفتہ اسی کے ہورہے، شیخِ کامل کی عنایاتِ کاملہ مُریدِ صادق کی جانب دن بہ دن بڑھتی اور ترقی وکمال کی مدارج طئے کرتی رہیں؛ گو خانقاہِ اشرفیہ میں سینکڑوں دل لعل وگہر بنے اور ہزاروں بندگانِ خدا بادۂ معرفت ومحبت پی کے نکلے مگر میر صاحبؒ کو جو مقام بارگاہِ اختری میں حاصل ہوا وہ انہی کا نصیبہ اور قدرت کا خاص عطیہ تھا۔

کوئی بتیس سال کی عمر ــــــ سن ۱۹۶۹ء ــــــ میں حاضر خدمت ہوئے تھے اور پھر حضرت حکیم صاحبؒ کے وصال ۲۰۱۳ ــــــ تک کُل چوالیس برس روز وشب، صبح وشام اور سفر وحضر کے خادم خاص بلکہ محبوب باختصاص بنے رہے؛ پھر وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ محبت وخصوصیت بھی بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ حضرت حکیم صاحبؒ کی زبانِ مبارک کسی وقت ان کے بارے میں ــــــ متعلقین بتاتے ہیں کہ ــــــ اپنے جذباتِ قلبیہ کا اظہار کرتے ہوئے یوں گویا ہوئی ''میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے اپنے بیٹے مظہر میاں سے زیادہ محبت ہے یا (اپنے خادم) میر صاحب سے''۔ اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے طرفین کی اس محبت کا؟ اور ایسی محبت کیوں نہ ہوتی؟ حضرت میر صاحبؒ نے ایک دفعہ ان کا دامن پکڑ لینے کے بعد پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا، وہ وحدتِ مطلب یا توحید فی الاعتقاد کا نادر نمونہ تھے، انہوں نے زندگی کی تمناؤں کا ان کی خاطر خون کیا اور ہر آرزو پامال کی تھی، حد یہ ہے کہ عمر بھر مجرّد رہے، نکاح بھی نہیں کیا، شیخ کی خدمت ہی کی خاطر ملازمت بھی ترک کردی، انہیں اپنے شیخ کی خدمت، راحت اور سفر وحضر کی رفاقت نیز شیخ کی لمحہ بہ لمحہ عنایت سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہ تھی، وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے ؎

ہمہ شہر پُر زخوباں منم وخیال ماہے
چشم بد خوئے من نکند بکس نگاہے

ایک فارسی شعر میں میر صاحبؒ خود اپنے شیخ کو مخاطب کر کے فرمار ہے ہیں:

ایں میرِ تو میرد بہ تو، مردہ شدہ در دستِ تو
یا دفن کن یا زندہ کن، اے جان ناز دلبری

تیرا میر تجھ پر قربان ہے مردہ بہ دست زندہ بن گیا ہے، اے میرے دل بَر! اب تیرے ہاتھ میں ہے کہ اسے مار ڈال یا زندہ رہنے دے۔

ایک اردو منقبتِ شیخ میں یوں اظہار جذبات کر رہے ہیں:

نہیں دیوانۂ حق ، جو تیرا دیوانہ نہیں — ہائے وہ روح کہ جس نے تجھے پہچانا نہیں
تیری آنکھوں میں ہے وہ مستیٔ صہبائے ازل — جس کے آگے کوئی شئ مستی پیمانہ نہیں

یہ صرف شاعرانہ ادب نوازی وانشاپردازی نہیں تھی دل دردمند کی وہ ترجمانی تھی جس کی تفسیر اور صداقت کی دلیل تقریباً نصف صدی پر مشتمل خودان کی اپنی زندگی ہے، اور جس کا جاننا کسی باخبر وذی اثر قلم کے اُٹھنے پر ہی موقوف ہے؛ کاش! کوئی مقربِ بارگاہِ اختری کھڑا ہوتا اور عقیدت ومحبت کی اس داستان کو مرتب کر کے رہ روانِ راہِ طریقت کیلئے سامان موعظت فراہم کر دیتا۔

جذبۂ خدمت اور وارفتگیٔ عشق ومحبت کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت حکیم صاحبؒ مفلوج ہو کر بستر کے ہو رہے تھے تو باوجود پیرانہ سالی اور امراضِ لاحقہ کے اپنے شیخ کی خدمت حتی کہ بول وبراز کی صفائی تک کے لئے تیار ہو گئے تھے، اور کسی کو آگے بڑھنے کا موقعہ نہ دینا چاہتے تھے، مگر حضرت حکیم صاحبؒ ان کے سادات ہونے کی وجہ سے ان سے ایسی خدمت لینا گوارا نہیں فرماتے تھے، اس لئے سختی سے منع فرما دیا تھا؛ پھر بھی ان کے جذبات کا عالم یہ تھا کہ ایک بڑے مفتی صاحب سے جا کر فتویٰ معلوم کیا کہ آیا سیدزادگی شیخ کی اس خدمت میں شرعاً مانع ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایسا تو نہیں ہے مگر پیر کے حکم کی تعمیل اولیٰ ہے،

تب جا کے انہوں نے اس سعادت کو دوسروں کے لئے چھوڑ دیا۔

میر صاحبؒ کو حضرت حکیم صاحبؒ سے جو تعلق تھا وہ تو تھا اور ہونا ہی چاہیئے تھا مگر ان کے اخلاص، صدقِ طلب اور شانِ وفا کی برکت سے خود حضرت حکیم صاحبؒ کو میر صاحب سے جو لگاؤ اور للّٰہی محبت ہوگئی تھی اس کا اندازہ حضرت حکیم صاحبؒ کے بیسیوں ملفوظات اور اشعار کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے؛ ان میں سے چند ذیل میں نقل کئے دیتا ہوں کہ لطف اور عبرت دونوں کا فائدہ دیں گے۔

ایک دفعہ ان کے حق میں ارشاد فرمایا: میں میر صاحبؒ سے اس لئے اتنی محبت کرتا ہوں کہ وہ میری خاطر گھر بار اور سب کچھ نثار کر کے یہاں پڑے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس محبت وخدمت کی خاطر انہوں نے شادی بھی نہیں کی؛ ایک دفعہ فرمایا: میر نے پیر پر سب کچھ قربان کر دیا ہے؛ ایک دفعہ انہیں کو مخاطب کر کے فرمایا: ان شاء اللہ جنت میں بھی ہم تم پڑوسی ہی رہیں گے؛ جب خود آرام فرمانا چاہتے تو جو لوگ پاس میں موجود ہوتے انہیں میر صاحبؒ کے پاس یہ فرما کر روانہ کرتے تھے کہ اب ان کے پاس چلے جاؤ ہم نے جو کچھ ہمارے پاس تھا انہیں دیدیا ہے؛ ایک دفعہ فرمایا: اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے ایسے دوست احباب دئے جو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں، دیکھو یہ میر عشرت جمیل رات دن میرے ساتھ ہیں؛ ایک دفعہ فرمایا: ماشاء اللہ اس کو (میر صاحبؒ کو) مجھ سے بہت زیادہ محبت ومناسبت ہے، محبت ہی کی وجہ سے تو یہ میرے ساتھ ہیں۔ وغیرہ

حضرت حکیم صاحبؒ اپنے اشعار اور رباعیات میں اکثر میر صاحبؒ ہی کو مخاطب فرما لیا کرتے تھے، مثلاً کسی سالک نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ ہم نے سابقہ زندگی سے تائب ہو کر نیکی اور صلاح کی زندگی اختیار کر لی مگر پرانے دوست احباب اب بھی طعن کرتے ہیں؛ ظاہر ہے کہ یہ عمل بہت ہی نازیبا اور نامناسب ہے، خواہ مذاق ہی میں کیوں نہ ہو، ایسے لوگوں کو تنبیہ کے لئے حضرت حکیم صاحبؒ نے میر صاحب کے حوالہ سے دو شعر فرمائے تھے جو راقم نے خود حضرت حکیم صاحبؒ کی زبانِ مبارک سے مذکورہ تفصیل کے ساتھ سنے تھے؛

فرمایا:

خوب رویوں سے ملا کرتے تھے میرؔ اب ملا کرتے ہیں اہل اللہ سے
مت کرے تحقیر کوئی میرؔ کی رابطہ رکھتے ہیں اب اللہ سے

ایک طویل نظم میں ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

شروع کردیا پیر کے پاس جینا ملا غیب سے میرؔ کو جام و مینا
جو ساقی کے گھر میں ملا اس کو جینا تو وہ بھول بیٹھا ہے اپنا نگینہ
تو پا جائے گا میرؔ ہمت ذرا کر مرے دل میں نسبت کا ہے جو خزینہ

نگینہ ہندوستان کا وہ معروف قصبہ ہے جو میر صاحبؒ کا مولد اور ابتدائی مسکن تھا، میر صاحبؒ ہمت سے لگے رہے اور بفضلہٖ تعالیٰ اس خزینے کو پا بھی لیا، حضرت حکیم صاحبؒ کا ارشاد پیچھے گذر چکا ہے کہ ہم نے سب کچھ انہیں دیدیا۔

ان چند مثالوں سے قارئین جان سکتے ہیں کہ میر صاحبؒ اور حکیم صاحبؒ ــــــ مُرشد ومرید ــــــ کے درمیان الحُب فی اللہ کا کیسا مضبوط رشتہ قائم تھا، جس نے بالآخر مرید کو پیر کے رنگ میں اس طرح رنگ دیا تھا کہ یک جان ودو قالب بن گئے تھے، اور عملاً حضرتؒ کے نائبین میں شمار ہونے لگے تھے، کیوں کہ معلوم ہوا کہ حضرت کے بہت سے متعلقین عوام وخواص حضرت حکیم صاحبؒ کی عدم موجودگی یا بیماری میں زیادہ تر اُن سے استفادہ کرنے اور ان کے مشوروں ورہنمائیوں میں حضرت حکیم صاحبؒ کی نسبت ومماثلت پاتے تھے، ظاہر ہے کہ اس میں حضرت حکیم صاحبؒ کی توجہ وتربیت کا جہاں دخل تھا وہیں میر صاحبؒ کے صدق وصفا اور خلوص ووفا کا بھی یقیناً اثر تھا۔

حضرت حکیم صاحبؒ جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے میر صاحب کی سیدزادگی کی وجہ سے اُن سے نجی خدمات لینا گوارا نہیں فرماتے تھے، عظمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تقاضہ اور سلف کا طریقہ بھی یہی تھا کہ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ یہی معاملہ کیا جائے، اس لئے تزکیہ وتصفیہ کے مراحل سے گذارنے کے بعد اپنے اس محبوب مُرید اور جگری رفیق وصدیق کو اپنے علوم

—— مواعظ وملفوظات —— کے جمع وترتیب کے کام میں یہ کہہ کر مشغول فرما دیا کہ میری ذاتی خدمت میرے بعد ختم ہوجائے گی اور یہ علمی خدمات صدقۂ جاریہ اور نفع مستمرہ کی صورت میں دوام اختیار کرجائیں گی؛ چناں چہ میر صاحبؒ سن ۱۹۸۲ء سے اس اہم اور ذمہ دارنہ کام میں یکسوئی کے ساتھ لگ گئے، انھوں نے ابتدائی تعلق کے زمانے ہی سے حضرت حکیم صاحبؒ کے ملفوظات ومواعظ اور افادات کو محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہوا تھا، سفر وحضر کی ہر مجلس بلکہ ہر گفتگو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کرلیا کرتے تھے، کبھی حضرت حکیم صاحبؒ اس اہتمام پر برہم بھی ہوجاتے تھے کہ یہ کیا کرتے رہتے ہو، توجہ سے سن کر ذہن وعمل میں محفوظ کرنا چاہیئے، اصحابِ کرامؓ کے زمانہ میں یہ سب چیزیں کہاں تھیں؟ مگر چوں کہ قدرت نے ان کے ذریعہ حکیم صاحبؒ کے علوم ومعارف کی حفاظت مقدر کررکھی تھی اس لئے وہ شیخ کی وقتی برہمی وخفگی کو خندہ جبینی سے قبول کرتے ہوئے دائمی مسرت وخوشی حاصل ہوجانے کے تکوینی فیصلے کی تکمیل میں لگے رہتے تھے، میں نے خود ان کے اس اشتغال اور اس کی وجہ سے ہونے والے خلل پر حضرتؒ کی خفگی بار بار دیکھی ہے۔

مختصر یہ کہ ان کے پاس چوں کہ شیخ کی برسہا برس پر مشتمل مجالس وبیانات اور ارشادات وفرمودات بہ شکل کیسٹس محفوظ تھے، اس لئے بڑی کامیابی کے ساتھ انھوں نے انہیں تحریری صورت دینی شروع کردی؛ ضبطِ تحریر، شیخ کی نظر ثانی، اغلاط کی تصحیح، کتابت کے دشوار گذار مراحل، پروف ریڈینگ پھر طباعت؛ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں کا ہر ایک کام ایک آدمی کو چاہتا ہے؛ کمال ہے میر صاحبؒ کے عشق ومحبتِ شیخ کا کہ اسس نے میر صاحبؒ سے تنہا یہ سب کام کروائے، مزید یہ کہ ان کاموں کی خاطر صحبتِ شیخ کی پابندی، مجالس کی حاضر باشی اور اسفار کی شراکت داری بھی ترک نہ ہوئی؛ سبحان اللہ۔

پہلے پہل جو مجھے یاد پڑتا ہے حضرت حکیم صاحبؒ کے سلسلہ مواعظ میں سے خوش گوار ازدواجی زندگی، تعلق مع اللہ، حقوق النساء، حضرت میر صاحبؒ کے تقدیمی کلمات کے ساتھ میری نظر سے گذرے، میں نے حیدرآباد میں بھی ان مواعظ کی طباعت حضرت حکیم صاحبؒ

کی اجازت سے کروائی تھی؛ ان ابتدائی مواعظ کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ حضرت حکیم صاحبؒ کی حینِ حیات ـــــ ۲۰۱۳ ـــــ تک ۱۰۹ مواعظ کی اشاعت ہو چکی تھی، حضرت حکیم صاحبؒ کی وفات کے بعد میر صاحبؒ نے کوئی ڈھائی سالہ مدت میں باوجود پیرانہ سالی وعوارضِ لاحقہ ـــــ شوگر، بی پی، ڈائلسیس، اور قلبی امراض ـــــ کے مزید ۷۹ مواعظ کی ترتیب واشاعت کا کام انجام دیا، اس طرح کل ۱۸۸ مواعظِ شیخ کی جمع وترتیب اور ان سے مستفید ہونے والے ہزار ہا بندگانِ خدا کی ہدایت کا ثوابِ جاریہ ان کے اعمال نامے میں شامل ہو گیا، ان مواعظ کے علاوہ انہوں نے حضرتؒ کے ملفوظات وافادات کے مستقل اور کافی ضخیم مجموعے بھی مرتب فرمائے مثلاً خزائن القرآن، خزائن الحدیث، خزائنِ شریعت وطریقت، درس مثنوی، فغانِ رومی، مواہبِ ربانیہ، معارفِ ربانی، پردیس میں تذکرۂ وطن، آفتاب نسبت مع اللہ، ارشاداتِ دردِ دل وغیرہ؛ نیز مکاتبتِ اصلاحی ـــــ جو خانقاہی نظام کا ایک اہم رکن ہے ـــــ کی طرف بھی میر صاحبؒ نے توجہ فرمائی اور سالکین کے احوال وشیخ کے جوابات کو مرتب کرنے کا ایک یادگار و ہدایت بار کام ''تربیت عاشقانِ خدا'' کے نام سے تین ضخیم جلدوں پر مشتمل انجام دے گئے؛ للٰہیت وفنائیت کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی کتاب پر آپ مرتب کی حیثیت سے ان کا نام نہیں پائیں گے؛ فجزاھم اللہ عنی وعن سائر المسلمین احسن الجزاء

میر صاحبؒ سے میری آخری ملاقات مدینہ منورہ میں اسوقت ہوئی جب حضرت حکیم صاحبؒ بیماری میں کچھ افاقے کے بعد کوئی مہینہ بھر قیام کے ارادہ سے حرمین شریفین حاضر ہوئے تھے، اور خوش نصیبی سے یہ عاجز بھی عمرے کی غرض سے وہاں حاضر تھا؛ تو موقع غنیمت جان کر مجالس میں حاضری دینے لگا تھا، مجلس کا وہی رعب وداب تھا جو حضرت حکیم صاحبؒ کے زمانہ صحت میں ہوا کرتا تھا، اگرچہ اس وقت حضرت بالکل فریش اور گفتگو سے عاجز تھے، برائے نام چند الفاظ بول پاتے تھے؛ دنیا بھر سے اُن کے چاہنے والوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا، بڑے چھوٹے، نئے پُرانے سب ہی مجلس میں ہوا کرتے تھے؛ میر صاحبؒ

بڑھاپے کی منزل اور وہیل چیر کی محتاجی کے باوجود مجلس میں اسی خادمانہ اور عاجزانہ ہئیت میں نظر آئے جو میں نے پچیس سال قبل دیکھی تھی، کبھی غلبۂ نوم کی وجہ سے کبھی کسی ملنا چاہنے والے سے ملاقات کی بنا اور کبھی کسی نقل وحرکت پر اب بھی حضرت حکیم صاحبؒ کا میر صاحبؒ پر وہی عتاب وہی دارو گیر تھی، ایک دفعہ تو مجلس سے اٹھا دیئے جانے کی تہدید بھی سننے میں آئی؛ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ مبتدیوں کو تک ــــــ تمام نقائص وعیوب کے باوجود ــــــ مشائخ کی ایسی گرفتیں ناقابلِ تحمل ہونے اور شیخ سے برگشتگی کا سبب بننے لگی ہوں کسی منتہی ومعمر اور صاحبِ مراتب ومقامات کا یوں برسرِ عام پھٹکارا جانا اور اس پر ناگواری کے بجائے خوشی ونیاز مندی کا بڑھتے رہنا میر صاحبؒ جیسے مخلص وباوفا لوگوں کا ہی حق ہو سکتا ہے، بلکہ شیخِ کامل اور پیر عارف کی کڑی آزمائشیں بھی ایسے ہی لوگوں کے لئے ہوتی ہیں، پھر ایسے ہی باوفا لوگوں پر اس کا قلب مکمل متوجہ ہوتا اور بادۂ محبت ونشۂ معرفت کے خُم کے خُم لٹا دیتا ہے، ایسا ہی مرید مراد ہو جاتا ہے جو بظاہر معتوب مگر بہ باطن محبوب ومرغوب رہتا ہے؛ سچی بات یہ ہے کہ محبت کے آداب وانداز ہی کچھ نرالے ہیں، جن اداؤں کا قلب سے تعلق ہے اس کا عقل سے کیا کام؟

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
خرد محو تماشا ہے لبِ بام ابھی

میر صاحبؒ کی برکت سے ابھی دل میں آیا کہ یہ تو سنت نبوی بھی ہے ــــــ بشرطیکہ علماء کرام توثیق فرمائیں ــــــ کہ محسن ومربی آقا کے عتاب سے ناگواری کے بجائے مسرت وخوشی حاصل ہو، کیوں کہ یہ عتاب نفع میں کسی عنایت سے کم نہیں؛ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ سردارانِ مکہ سے گفتگو کے درمیان حضرت عبداللہؓ ابن ام مکتوم کے آجانے پر ناگواری کا اظہار فرمایا تھا، جس پر حق تعالیٰ نے محبوبانہ عتاب فرمایا تھا، علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ جب بھی آپ کو حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم نظر آتے آپ ان کا استقبال مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی کہہ کر فرماتے تھے؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے محبوب ومحب پروردگار کے عتاب میں

آپ کو محبوبیت واپنائیت کی وہ چاشنی ملی تھی کہ عمر بھر فراموش نہ فرماسکے، بلکہ اس کا سبب بننے والے کو اپنا محبوب بنالیا تھا؛ والعلم عند اللہ۔

خیر! بات لقاء آخر کی چل رہی تھی؛ اس سفر میں حضرت حکیم صاحبؒ لکھنے پڑھنے کے موقف میں نہ تھے اور میرے قلب کے جذباتِ عقیدت ومحبت حضرتؒ کے سامنے تک پہونچنے کے لئے بے تاب تھے، تو میں نے آخری دن میر صاحبؒ ہی کی خدمت میں ایک عریضۂ طویلہ لکھ کر پیش کر دیا تھا؛ اس دن تو غالباً سفر کی تیاری میں ملاحظہ کا موقع نہ مل سکا، البتہ کراچی پہونچ کر انہوں نے حضرت حکیم صاحبؒ کے سامنے اس عریضے کو سُنایا، دیگر خواص بھی موجود تھے؛ ابھی میں سعودی عرب ہی میں تھا کہ میر صاحبؒ نے فون پر بات کرتے ہوئے بتلایا "آپ کا خط میں نے مجلس خاص میں حضرت کو سنادیا، حضرت والا نے بہت پسند فرمایا اور خوب دعائیں دیں، اور ہم حضارِ مجلس بھی بہت محظوظ ہوئے، آپ کے جذباتِ قلبیہ سے بھی اور آپ کے اندازِ تحریر سے بھی، سب کا خیال ہے کہ یہ خط مجموعۂ خطوط میں شامل کیا جانا چاہیئے"۔ میر صاحبؒ کی ان باتوں کو میں حیرت واستعجاب سے سنتا رہا اور کچھ کہہ نہ سکا؛ کہتا بھی کیا؟ سب کچھ انہیں محسنین کے احسانات کا صدقہ تھا، اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے والد ماجدؒ کے صدقے ان اہلُ اللہ کی محبتیں نصیب کر دیں ورنہ من آنم کہ من دانم!

معلوم ہوا کہ حضرت میر صاحبؒ شیخؒ کی وفات کے بعد اپنی قیام گاہ منتقل ہو کر پوری یکسوئی اور دل جمعی سے دو کام کر رہے تھے، ایک تو مواعظِ حسنہ کی ترتیب واشاعت بنام "مواعظِ اختر" دوسرے حضرت حکیم صاحبؒ کی "سوانح حیات" کی تدوین؛ جہاں تک میں سمجھتا ہوں قضاوقدر نے مہلت نہ دی اور وہ دونوں کام تشنۂ تکمیل چھوڑ کر رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہو گئے۔

میں گذشتہ رمضان المبارک میں ابتلاء اسارت سے گذر رہا تھا، ان دنوں موجود ومرحوم اکابر کی زیارتوں اور خوش خبریوں سے مشرف کیا جاتا رہتا تھا؛ ایک رات حضرت حکیم صاحبؒ

کی بہت تفصیلی صحبت حاصل رہی، اس میں یہ دیکھا کہ حضرتؒ اپنے حجرے میں کسی کام میں مشغول ہیں، حلیہ بالکل صحت کے زمانے کا تھا سوائے اس کے کہ سر پر ٹوپی نہ تھی، سر جھکائے کسی اہم کام ــــ جیسے تحریری و تصنیفی مشغولیت ہوتی ہے ــــ میں مگن تھے، میں احتراماً ایک طرف بیٹھ گیا، دیکھتا ہوں کہ حجرے میں کئی تپائیاں رکھی ہوئی ہیں اور ہر تپائی پر ایک ضخیم اور خوب صورت جلد کی کتاب رکھی ہوئی ہے جس پر جلی حرفوں میں ''امیر التفاسیر'' لکھا ہوا ہے، جو حضرت حکیم صاحبؒ کے افاداتِ تفسیریہ ہیں اور ان کے مرتب وجامع میر صاحبؒ ہیں، میں نے کھول کے پڑھنا شروع کیا، عرض مرتب کے تحت میر صاحبؒ نے یہ لکھا تھا ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے حضرتِ والا کی خدمت میں ایک طویل مدت گذارنے کا موقعہ دیا، حضرت والا کے مجھ پر جو احسانات ہیں وہ بیان سے باہر ہیں، ان میں حضرت کے مالی احسانات بھی شامل ہیں، حضرت مجھے جو بھی عطا فرماتے، میں اسے اپنے اکاؤنٹ میں ڈالدیا کرتا تھا، ہوتے ہوتے یہ رقم مبلغ ۸ ؍لاکھ روپے تک پہونچ گئی، اب جبکہ حضرت والا ہمارے درمیان میں نہیں رہے میں سوچتا رہا کہ میرا تو کوئی ہے نہیں اس رقم کا آخر کروں تو کیا کروں؟ پھر اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ حضرت والا کے افاداتِ قرآنیہ کو اکھٹا کر کے تفسیری شکل دیدوں، اور اس رقم کو اس کی طباعت پر صرف کردوں، چنانچہ میں نے یہ کام شروع کیا تو حضرت والا کی برکت سے مکمل ہوگیا، اور حضرت والا کی نظر ثانی کے بعد یہ تفسیر آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے ــــ یہاں تک پڑھ چکا تھا کہ اچانک حضرت حکیم صاحبؒ کے پوتے مولانا اسماعیل صاحب یا مولانا ابراھیم صاحب حجرے میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں بھی وہی کتاب تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کتاب کی ابھی ابھی اشاعت ہوئی ہے، اور اس سے سب لوگ مسرور ہیں، حضرت نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے خاطر مدارات کی طرف توجہ دلائی ــــ

خواب کی تعبیر تو بہت نازک کام ہے اور خود خواب دیکھنے والا کونسا اہم آدمی ہے مگر چوں کہ اس وقت میر صاحبؒ حیات تھے تو ممکن ہے اس خواب میں ان کے ذریعہ حضرت حکیم

صاحبؒ کے افادات وافاضات مرتب اور نشر ہونے کی جانب اشارہ ہو، بیداری کے بعد اس خواب اور اس کے تفصیلی ابواب سے غیر معمولی مسرت واطمینان حاصل ہوا تھا اور مجھے خیال ہورہا تھا کہ حضرت میر صاحبؒ کوئی اہم تحریری کام ضرور انجام دے رہے ہوں گے، جس سے حضرت حکیم صاحبؒ کی خوشنودی بھی وابستہ ہے؛ واللہ اعلم۔

۲ ر جون ۲۰۱۳ء کو حضرت حکیم صاحبؒ کا آفتاب حیات غروب ہوا تھا؛ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میر صاحبؒ جیسے عاشقِ صادق اور مُرید باوفا پر ـــــ جس نے جوانی سے لے کر بڑھاپے تک زندگی کی سب خوشیاں اپنے محبوب شیخ پر قربان کر کے سفر وحضر میں گویا اپنے کو اُن کا سایہ بنالیا تھا ـــــ پیر کی جدائی کے اس غم نے کیا اثر ڈالا ہوگا؟ دل جو پہلے ہی سے بائی پاس سرجری کے الم اٹھا رہا تھا اور گُردے جو پہلے ہی سے ڈالیسیس کے مصائب جھیل رہے تھے، محبوب کی جدائی کا صدمہ کیسے جھیل پا رہے ہوں گے؟؛ مزید برآں میر صاحبؒ اس حادثہ فاجعہ سے سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ ان کے برادرِ خورد جناب قاسم جمیل صاحب کا سانحۂ ارتحال پیش آگیا جس نے انہیں اور نڈھال کردیا؛ دومرتبہ دل کا دورہ پہلے پڑھ چکا تھا، اپریل کے مہینے میں ایک ہفتے کے وقفے سے دومرتبہ اور دل کے دورے پڑے ،ساتھ ہی بلیڈ پریشر بے قابو ہوگیا، جس کی وجہ سے ڈائلیسیس میں دشواری پیش آنے لگی، ادھر آکسیجن کی بھی کمی ہوگئی، معالجین نے تدبیر کے درجے میں ہر چند کوششیں کرلیں، مگر تقدیر پر غالب نہ آسکے، بالآخر نوشتۂ تقدیر پورا ہوا اور حضرت میر صاحبؒ اپنی زندگی کی اٹھتر سالہ تابناک وسبق آموز تاریخ کی آخری سطر ۱۳ ر رجب ۱۴۳۶ھ بروز شنبہ رات ساڑھے دس بجے رقم کرکے راہئ عالم آخرت ہوگئے؛ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگلے روز صبح ۶ ر بجے جامعہ اشرف المدارس کے وسیع صحن میں موجود ہزاروں علماء، صلحاء وطلبہ نے ان کے شیخ زادے حضرت مولانا حکیم محمد مظہر صاحب دامت برکاتہم (خلیفہ حضرت محی السنہؒ) کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی، اور حضرت حکیم صاحبؒ ہی کے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اللہم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ الجنۃ برحمتک یا ارحم الراحمین

حضرت قطب الدین ملا صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت قطب الدین ملا بلگامی کا نام کافی عرصہ قبل ترجمانِ از ہر ہند ''دارالعلوم'' میں ایک مضمون کی سرخی کے طور پر پڑھا تھا، مضمون تحقیقی قسم کا تھا اور اس عاجز کو بہت متاثر کیا تھا، تب سے ملّا صاحبؒ کی تصوراتی تصویر میرے دل میں ایک عظیم دینی وعلمی اور تحقیقی شخصیت کی شکل میں منقوش ومرتسم تھی، اس کے بعد ان سے ملنے اور استفادہ کرنے کی آرزو برابر رہی مگر بلگام کے علاقے تک میری رسائی کے کچھ اسباب نہ تھے۔

آج سے چند سال قبل اپنے ایک عزیز تلمیذ مولانا الیاس قاسمی کھتوری سلمہ کے عقد نکاح کی مناسبت سے ہُبلی جانے کا موقعہ ملا، اس نکاح میں حضرت قطب الدین مُلّاؒ نے بھی شرکت فرمائی، نکاح کے موقعہ پر کئے گئے اس عاجز کے اصلاحی بیان کو بہت پسند فرمایا اور اسی وقت بذریعہ فون انتظامات کر کے مجھے اپنے ہمراہ بلگام لے آئے، اسی رات میں ایک بیان ہوا، صبح خانقاہِ نعمانیہ کی مسجد میں اپنے متعلقین میں بات کرائی، مغرب بعد شہر کے مرکزِ تبلیغ ''جامع مسجد'' میں بیان ہوا، بعد ازاں حضرت مفتی عبدالرشید صاحب مفتی اعظم بلگام سے ملاقات کروائی، رات کو مجھے رخصت کرنے کے لئے بس اڈّے خود تشریف لائے، گوا سے نکل کر حیدرآباد جانے والی یہ ''ولوو بس'' خاصی تاخیر سے بلگام پہونچی، باوجود پیرانہ سالی، ضعف ونقاہت، اور عارضۂ تنفس کے بھی ہوٹل کے سامنے مسلسل میرے ساتھ بیٹھے رہے، میں بڑی لجاجت سے واپس ہوجانے کی درخواست کرتا تھا، وہ انکار ہی کئے جاتے تھے، آخر بس آئی تو انہوں نے مجھے سوار کر کے بسکٹ، پانی وغیرہ ضروریات فراہم کروائیں، بس نکلنے کے بعد اپنی قیامگاہ کے لئے روانہ ہوئے۔

اگلے سال انہوں نے خود ہی دعوت دی، سہ روزہ نظام بنایا، نیپانی کے مدرسے لے گئے، طلبہ واساتذہ سے بات کروائی، راستے میں ایک اور مدرسے کا بھی معائنہ کروایا اور اپنے حسن ظن کی بنا مجھ سے مدارس کے نظام کو زیادہ مؤثر و بافیض بنانے کے سلسلے میں طالب علمانہ تبادلۂ خیال فرماتے رہے، تین دن میں کئی ایک پروگرام رکھے، مُلا صاحب تمام تر عوارضِ لاحقہ کے باوجود خود چاق وچوبند رہنا دوسروں کو بھی مشغول رکھنا خوب جانتے تھے۔

اگلے سال پھر فون کیا کہ بلگام فلاں تاریخوں میں آنا ہے، میں نے پہلے ہی سے بنے نظام کی وجہ سے تقدیم وتاخیر کی درخواست کی تو فرمایا ''یہ نظام چوں کہ طے ہے، میری خواہش ہے کہ آپ ضرور آئیں چاہے ایک دن ہی کے لئے سہی''، میں نے متعلقہ لوگوں سے ربط کیا کوئی راضی نہ ہوا، ناچار معذرت کردی، فرمایا ''ایسا ہے تو پھر دوسرے پروگرام میں زحمت دوں گا''۔ اب طرفین میں کسی کو بھی کیا خبر تھی کہ اگلا پروگرام تو دور کی بات ہے اگلی گفتگو کا موقعہ بھی تقدیر الٰہی میں مقدر نہیں ہے، اس گفتگو کے چند یوم بعد ہی اطلاع ملی کہ حضرت مُلّا صاحبؒ اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

ان سے ایک اور ملاقات مدینہ منورہ کے اندرونی صحنِ مبارک میں قبل المغرب ہوئی تھی، حضرت مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی مدظلہ نے میرا تعارف کرانا چاہا تو فوراً فرمایا ''میں اچھی طرح واقف ہوں'' پھر اپنے جھولے میں چند ایک رسائل جو انہی کے تصنیفات تھیں نکال کر مجھے ہدیہ فرمایا۔

حضرت مُلّا صاحبؒ جتنے دراز قامت تھے اتنے ہی بلند حوصلہ تھے، انہوں نے اصلاً عصری تعلیم حاصل کی ہوئی تھی، دینی تعلیم اُن کے ذوق وشوق کی دَین تھی، اپنی تعلیم کے ذریعہ محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوئے ساتھ ہی تعلیم وتدریس کے پیشے کا انہوں نے دین کی تعلیم وتبلیغ کے لئے بھرپور استعمال کیا، ان کے معتقدین بیشتر ان کے تلامذہ ہیں، جوانی ہی سے دعوت وتبلیغ کے سرگرم کارکن رہے مگر جمود وتعطل اور رسمیت کو قریب آنے نہ دیا، تحقیق وجستجو اور ترقی

علم وعمل میں ان کی حرص ھل من مزید کی مصداق تھی، حتیٰ کہ اخیر عمر میں بھی ـــــ جبکہ وہ سینکڑوں معتقدین کے درمیان ہوا کرتے تھے اور علاقے میں جدھر جاتے اُدھر عزت دینے اور ہاتھ چومنے والے پیچھے لگے رہتے تھے ـــــ وہ ارشاد ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بصد ذوق وشوق استرشاد کے متمنی بھی رہتے تھے، صرف بانٹتے ہی نہ تھے لوٹنا بھی خوب جانتے تھے، بیانات اگر کرتے تھے تو دوسروں کے لمبے لمبے بیانات یکسوئی سے سنتے بھی تھے، مطالعہ تو ان کی غذا ہی تھی حاصلِ مطالعہ کو صفحۂ قرطاس پر رقم کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے، کئی کتابوں کے مصنف تھے اور سینکڑوں اصلاحی وتحقیقی مضامین کے مُحرِّر بھی!

حضرت قطب الدین ملا صاحبؒ کا ذکر نکل گیا تو میں ان کی یادوں میں بہت دور چلا گیا لکھنا تو بہت کچھ چاہتا تھا مگر اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر ان کے درجات کو بلند فرمائے، اوران کی تعلیمات کو صدقۂ جاریہ بنادے۔ آمین

حضرت حافظ عبدالمعز صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ہماری والدہ کے حقیقی ماموں، مولانا عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے برادرِ اکبر اور سینکڑوں تلامذہ کے مشفق استاد حضرت حافظ عبدالمعز صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ۹رشوال ۳۳ھ کو اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف بہ عمر ۸۲ سال رحلت فرما گئے۔ موصوف اہلِ علم میں زیادہ معروف تو نہ تھے، مگر بافیض بزرگ تھے، ان کے والدِ گرامی حضرت مولانا محمد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل ہونے کے باوجود حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سچے معتقد اور مسترشد تھے، علم وعمل میں انہی کے مزاج ومنہاج پر قائم تھے؛ پھر ان کے بعد محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ ہو گئے تھے، اور اپنے دونوں بچوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت خود کرنے کے بعد اخیر عمر میں ہردوئی روانہ کر دیا تھا، چنانچہ مولانا موصوف کے وصال کے وقت دونوں بچے ہردوئی ہی میں تھے، بلکہ وصیت بھی تھی کہ موت کی اطلاع پر بھی وہیں رہیں گھر نہ آئیں؛ اس لئے حضرت محی السنہ رحمۃ اللہ علیہ کی ان دونوں بھائیوں پر خاص عنایت اور توجہ رہی، وصال تک بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں باخبر رہا کرتے تھے، حافظ عبدالمعز صاحب کا حفظ کچھ تو اُن کے والد صاحب ہی نے کروایا اور کچھ یوپی کے کسی گاؤں سے تعلق رکھنے والے نابینا حافظِ قرآن کے پاس ہوا، جو رمضان میں تراویح سنانے کے لئے اس علاقے میں آئے ہوئے تھے، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش پر وہ حافظ صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے تھے، عربی کی ابتدائی تعلیم مالے گاؤں میں حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند گئے، پھر ترکِ تعلیم کر کے نظام اسٹیٹ میں بنی رضا کار تنظیم کے رکن ہو گئے، ملی خدمات کے جذبے سے سرشار رہے

اور بہت سوں کو اس میں لگا یا؛ پھر جب اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب ؒ کو شریک کرنے کے لئے اشرف المدارس ہردوئی گئے تو خود بھی وہیں شعبۂ حفظ کی تدریس اور مسجد حقی کی امامت پر لگ گئے؛

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مظاہری ناظم اول مجلس علمیہ آندھرا پردیش حال مقیم جدہ کے ہردوئی جانے کا سبب حافظ صاحب موصوف ہی بنے، میرے والد ماجد کے ان کی بھانجی سے رشتے کا سبب بھی وہی ہوئے، پورے عالم تو نہیں تھے مگر فکر وعمل میں پختہ دیوبندی تھے، اور وعظ ونصیحت مکمل اعتماد سے کرلیا کرتے تھے، جید اور مجود حافظ قرآن تھے، مدت العمر قرآن مجید کی خدمت کرتے رہے؛ کثیر العیال اور قلیل المال ہونے کی وجہ سے کسی ایک جگہ نہ رہ سکے، اشرف المدارس ہردوئی، فیض العلوم حیدرآباد، بیت العلوم سریاپیٹ کے علاوہ متعدد مدارس میں تدریس اور متعدد مساجد میں امامت وخطابت کرتے رہے، جہاں رہے النصح لاخ المسلم سے کبھی غافل نہ ہوتے، امر بالمعروف نہی عن المنکر میں کسی ملامت گر کی ملامت سے کبھی خائف نہ ہوئے، خواہ اس کے لئے ملازمت سے محروم ہی ہونا پڑا، اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن، اس کے وعدوں پر یقین، اس کے فیصلوں پر اعتماد اور اس کے احکام کا احترام، ان کی گفتگو کا موضوع تھا؛ بڑی سادگی سے اور نہایت دل نشیں انداز میں مذکورہ باتوں کی تشریح کرتے، جن سے ملنے جاتے، جس کے گھر ٹھہرتے یہی باتیں کرتے تھے؛ طبیعت میں انکسار وتواضع غالب تھا، ہم اصاغر سے بھی عجز ونیاز کا معاملہ فرماتے، جو ضرورت ہوتی بلا تکلف کہتے اور جو ہدیہ پیش کیا جاتا نیاز مندانہ قبول فرماتے تھے؛ مولانا عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جنازہ میں ہر کسی فرد سے مل کر یہی کہہ رہے تھے کہ وہ میرے چھوٹے بھائی تھے، میں ان سے عمر میں کافی بڑا ہوں، لیکن علم وعمل میں وہ مجھ سے بہت بڑے تھے، وہ پہلے چلے گئے، ہم ابھی موجود ہیں، اللہ کی مرضی ہے، بندہ کا کام راضی بہ رضا رہنا ہے وغیرہ۔

رقیق القلب بھی بہت تھے، جلد آبدیدہ ہوجاتے تھے اپنی بڑی بہن (راقم کی حقیقی نانی) اور چھوٹے بھائی کے بعد ہمت ٹوٹ گئی تھی، بھانجیوں کے پاس آتے جاتے رہتے اور

دونوں کو یاد کر کے اپنی تنہائی کا تذکرہ کرتے اور پھوٹ پھوٹ کے روتے تھے، پھر فوراً سنبھل جاتے اور تقدیر کی برتری اللہ تعالیٰ کی بندہ پروری کا بیان کرتے؛ مختصر یہ کہ ماض فیَّ حکمک عدل فی قضائک کا عملی نمونہ تھے۔

بہر حال! اسی قضا وقدر سے جس سے کسی کو مفر نہیں اور جس کی عدلیت سے وہ ہمیشہ راضی رہے ان کا بھی وقت موعود آ پہونچا، اور انھوں نے ۹؍شوال المکرم ۳۳ھ داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے اپنے محبوب مولیٰ کے حضور جا پہونچے۔ ان للّٰہ ما اخذ و لہ ما اعطیٰ و کل عندہ باجل مسمی فلنصبر و لنحتسب

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تعارف، حیات اور خدمات

مولانا ؒ کا ددھیال اور ننھیال:

حق تعالیٰ شانہ کی ذات بے انتہا بے نیاز بھی ہے، بے حد بندہ نواز بھی ہے، وہ جب اپنی شانِ صمدیت و بے نیازی کا مظاہرہ فرماتی ہے تو انبیاء و اولیاء کے خاندان گمراہی وضلالت کے راستہ پر چلتے نظر آتے ہیں، جب نوازش وعنایت کا جلوہ فرماتی ہے تو مشرکوں اور سرکشوں کی اولاد شمع فروزاں کی طرح باطل کے اندھیروں میں ہدایت کی روشنی لیے پھرتی ہے، گذشتہ امتوں میں اور خود اسلام کے صدرِ اوّل سے آج تک کی تاریخ میں اس کی ہزار ہا مثالیں موجود ہیں، اس راقم عاجز کا ننھیال بھی حق تعالیٰ شانہ کی بندہ نوازی کا ایک روشن باب ہے۔

پولیس ایکشن سے بہت پہلے کی بات ہے کہ ضلع کریم نگر کے کسی قصبہ غالباً جگتیال سے تعلق رکھنے والے دو زمیندار و تجارت پیشہ بھائی مدور ضلع ورنگل کے رہنے والے اپنے ہم پیشہ مسلمانوں کی خوش خلقی اور حسن معاملت سے متأثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے، بڑے بھائی کا نام عبدالغفور اور چھوٹے بھائی کا نام عبدالسلام تجویز ہوا، اسلام لانے کی پاداش میں خاندان، خویش واقارب اور جائیداد سے محروم و بے دخل کر دیئے گئے اور اس راہ میں جو کچھ پیش آیا کرتا ہے پیش آیا، مگر یہ حضرات ثابت قدم و مستقیم العزم رہے، ہمت نہ ہاری البتہ کاروباری مصالح سے ترکِ وطن کر کے مدور منتقل ہو گئے جہاں کے تاجروں سے ان کے

کاروباری تعلقات تھے اور یہی لوگ ان کے اسلام کا ظاہری سبب بنے تھے۔

اسلام کی برکت سے ان لوگوں کے جذبات میں طہارت و پاکیزگی، فکر و نظر میں نمایاں تبدیلی اور اعمال واشغال میں بلا کی سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ ان حضرات نے پہلے مبادی اسلام کو سیکھا سمجھا اور اس پر کاربند ہوگئے، پھر حیدرآباد کے مشہور صاحبِ سلسلہ بزرگ حضرت "مسکین شاہ" کے سلسلہ میں حضرت عبداللہ شاہؒ[1] کے ہاتھ پر بیعت ہوکر سلوک و معرفت کی منزلیں طے کیں اور تقویٰ و پرہیزگاری کے ایک اونچے مقام تک پہونچے۔

حالات کے تغیر سے معاشی صورتیں بھی تبدیل ہوگئیں، اس لیے ان بھائیوں نے قرآن مجید کی خدمت واشاعت کو اپنا نصب العین بنالیا، بڑے بھائی مسجد کی مؤذنی کرتے اور گاؤں کے لڑکوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے، چھوٹے بھائی گاؤں کی لڑکیوں کو قرآن مجید اور دینیات پڑھایا کرتے تھے، یہ سلسلہ ایسا چل پڑا کہ نہ صرف مدور بلکہ قرب وجوار کے دیہات والوں نے بھی خوب استفادہ کیا، ایک بیل گاڑی ذاتی تھی، جسے مسلمان لڑکیوں کو اسکول لانے لے جانے کے کام پر لگا رکھا تھا، اس کی آمدنی بھی دونوں بھائی تقسیم کرلیتے تھے، انہی ذرائع سے اللہ تعالیٰ نے خوب روزی دی اور ماشاء اللہ خوشحال رہے، یہ ان کی عزت اور خودداری کی بات تھی کہ اپنے کو کسی کا بوجھ نہ بنایا، گویا مہاجر صحابہؓ کی سنت کو زندہ کر دکھایا۔

دین کا ذوق اور اسلامی آداب واحکام پر عمل کا شوق بہت زیادہ تھا، بڑی محنتوں سے دین خود سیکھتے اور جو سیکھتے دوسروں کو سکھایا کرتے تھے، ان حضرات کے دین و دیانت کا گاؤں میں گویا سکہ جما ہوا تھا، ماشاء اللہ حج بیت اللہ کی سعادت بھی دونوں بھائیوں کو میسر آئی، تہجد کے بھی پابند تھے، کہا جاتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد کوئی اور عبادت تو کجا نمازِ تہجد بھی ان بندگانِ خدا سے فوت نہیں ہوئی، تقویٰ و پرہیزگاری کا حال یہ تھا کہ کسی معاملہ میں احکامِ شریعت کی ادنیٰ خلاف ورزی کو گوارا نہیں کرتے تھے۔

(۱) یہ بزرگ عبداللہ شاہؒ محدث دکن حضرت عبداللہ شاہؒ کے علاوہ ہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی نے کوئی حساب سمجھانا چاہا، وہ سمجھ نہ پائے تو غصے میں ہاتھ سے دھکا دے کر کہا اتنا موٹا حساب سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟ اس طرزِ عمل سے ناراض ہو کر وہ گھر سے نکل گئے، بڑے بھائی کی اہلیہ نے اپنے شوہر کو توجہ دلائی کہ بھائی میاں کے ساتھ آپ کو ایسا طرز نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا، اب آپ انہیں منا کر واپس لائیے، فوراً باہر نکلے سب گلی کوچے دیکھے، مسجد میں جا کر تلاش کیا تو وہ مسجد میں موجود تھے، دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑے ادب سے کہنے لگے کہ بھائی مجھے معاف کر دیجئے، انہوں نے معاف کر دیا تو اپنے اطمینانِ قلب کے لیے تین مرتبہ کہلوایا، پھر دونوں مل کر گھر آ گئے۔ یہ محبت وتعلق اور معاملات کی صفائی ان بھائیوں کے اندر ہر معاملہ میں پائی جاتی تھی، اور کیوں نہ پائی جاتی اسلام کی اسی خوبی سے متأثر ہو کر انہوں نے اپنے مذہب، مال ودولت، عزیز واقارب سب کچھ کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

معاملات کی صفائی اور ان میں اتباعِ سنت کا ایک اور واقعہ جاننے سے تعلق رکھتا ہے کہ جس وقت عبد السلام صاحب کا انتقال ہوا، اس وقت ان کے صاحبزادے مولانا محمد امام صاحب تھانہ بھون گئے ہوئے تھے، انتقال کے بعد واپسی ہوئی، اس زمانے میں اطلاع کی سہولتیں تو تھیں نہیں، اس حادثہ کی اطلاع نہ ہو سکی تھی، واپسی کے بعد جب اس کی اطلاع ہوئی تو مولانا فوراً مسجد گئے اور شام تک ذکر وتلاوت کے ذریعہ ایصالِ ثواب میں مشغول رہے، شام کو گھر آ کر اپنے داماد حضرت مولانا سید محمد صاحب ذکیؒ سے پوچھا کہ تدفین وغیرہ میں کتنے مصارف ہوئے؟ انہوں نے بتلایا کہ دس روپیہ دو آنے! پوچھا ابا جان کے بنیائن میں یہ رقم نہیں تھی؟ ان لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی تو خود منگوا کر جیب ٹٹولے، اس میں سے صرف دس روپئے نکلے، فرمایا ابا جان سنت کے مطابق کفن دفن کا خرچ ہمیشہ اپنے جیب میں رکھا کرتے تھے، تھوڑے عرصے کے بعد صحیح قیمتیں معلوم کر کے اور اضافہ کر لیا کرتے تھے، تا کہ اس میں دوسروں کا پیسہ نہ لگے۔ یہ دس روپے اسی مد کے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ دو آنے کا زائد خرچ کیسے ہو گیا؟ پھر تفصیل سے حساب کی چٹھی پڑھی تو اس میں دو آنے

سرے کے لکھے ہوئے تھے، فوراً غلطی پکڑ لی اور فرمایا میت کو سرمہ لگانا خلافِ سنت ہے، یہ جو زائد خرچ ہوا وہ اسی کا ہے۔ اس واقعہ سے ان حضرات کے تقویٰ اور اتباعِ سنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، احکام ومسائل کے استحضار کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح نمازیں بہت خشوع خضوع سے پڑھا کرتے تھے، انتقال کے ایک عرصہ بعد ان کے ایک صاحبزادہ کا بیان ہے کہ میں اس علاقہ کے کسی اور قصبہ سے گذر رہا تھا، نماز کا وقت ہوا تو مسجد میں داخل ہو کر وضو بنانے لگا، مسجد میں ایک معمر بزرگ نوجوان مصلیوں سے ان کی نماز میں جلد بازی وبے اعتدالی پر خفا ہوتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ''تم لوگوں کا تو نماز میں جی ہی نہیں لگتا، کیسی پھیکی وبے تکی نمازیں پڑھتے ہو، واقعی نمازیں تو وہ تھیں جو مرحوم عبدالسلام صاحب پڑھا کرتے تھے، ایسا خشوع وخضوع اب ڈھونڈھنے سے نہیں ملے گا'' گویا ان حضرات کا ذوقِ عبادت اور تقویٰ وطہارت اطراف واکناف میں ضرب المثل بن گیا تھا۔ غفر اللہ لھم ورفع درجاتھم

دین کی یہ پختگی ان کی بیویوں کی بھی خوبی تھی، چنانچہ بڑی سادہ مزاج مگر صفائی پسند تھیں، معاملات میں بھی اور ظاہری رکھ رکھاؤ میں بھی، خیر خیرات کی خوگر اور داتا قسم کی تھیں، کبھی اہلِ حاجت کی امداد سے پیچھے نہ ہٹتی تھیں، لوگوں کے دکھ درد کو اپنا درد سمجھنا ان کا شیوہ تھا، باہمی اختلافات، نزاع وتکرار، خود پسندی، تعلّی وبرتری سے کوسوں دور بلکہ نفور تھیں، بڑے چھوٹوں کے حقوق اور ایک دوسرے کے احترام کا خاص خیال تھا، یہی وجہ ہے کہ دونوں بھائیوں میں سے ایک ذکی وذہین دوسرے نسبتاً کم فہم اور ایک محنتی دوسرے کم جہد ہونے کے باوجود دونوں گھرانوں میں مثالی اتحاد تھا، اس محبتِ باہمی واتحاد کا راز اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ ان کے شوہروں کی تربیت اور ان کے تقویٰ کی برکت سے ان عورتوں کے اندر بھی حساب کا احساس، اور دوسروں کے حقوق میں کوتاہی سے بچنے کا پاس ولحاظ داخل ہو گیا تھا۔

شادی کے بعد بھی دونوں بھائی ایک ساتھ ہی مقیم رہے، اللہ تعالیٰ نے دونوں کو متعدد

اولاد سے نوازا، سب بچوں کو دینی وعصری تعلیم سے آراستہ کیا، اور بڑے ہونے کے بعد شادیاں بھی زیادہ تر پیشۂ تدریس سے وابستہ اور پختہ دینی ذہن رکھنے والوں سے کیں۔ اس طرح ان کا خاندان ایک مثالی نامور اور مردم ساز خاندان بن گیا۔

بڑے بھائی کا مدور ہی میں ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ اخیر عمر میں ان کے اکثر اوقات مسجد ہی میں گذرتے تھے، ایک دن نمازِ ظہر سے فارغ ہونے کے بعد اچانک گر پڑے، مصلیانِ مسجد نے انہیں کسی طرح گھر تک پہونچایا، گھر آنے کے بعد ذرا آرام کیا ہی تھا کہ رفع حاجت کی ضرورت محسوس فرمائی، ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ایسا ضعف طاری ہوا کہ اٹھ نہیں پائے، گھر والوں نے وہاں سے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا، اس کے بعد دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بڑی عاجزی اور لجاجت سے فرمانے لگے "اے اللہ! میں نے تیرے کلام پاک کے دوسو دور کئے ہیں، اس کی برکت سے تو میری مغفرت فرمادے"۔ یہی دعا کرتے ہوئے اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر عالمِ جاودانی منتقل ہو گئے۔ غفر اللہ لہ ولجمیع المؤمنین والمؤمنات۔ آمین

چھوٹے بھائی کا بمقام پربھنی انتقال ہوا، وہ اپنی پوتی (میری نانی صاحبہ) کی خیریت دریافت کرنے کے لیے پربھنی گئے ہوئے تھے، چند دن قیام کے بعد وہیں پر طبیعت ناساز ہوگئی، وہ اپنی پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت کے باوجود مسجد میں جا کر نمازیں ادا کیا کرتے تھے، جبکہ مسجد قیام گاہ سے کچھ فاصلہ پر تھی، ایک دن نماز ظہر کے لیے مسجد تشریف لے گئے، استنجے سے فارغ ہو کر وضو خانہ جاتے ہوئے اپنا توازن کھو کر گر پڑے، مصلیوں نے انہیں گھر پہونچایا۔ بڑھاپا مستقل روگ تھا، یہ کیفیت مزید تکلیف کا سبب ہوگئی، تاہم اپنے اذکار ومعمولات اور نمازوں کو گھر ہی پر اہتمام سے پورا فرمالیا کرتے تھے، وفات سے دو دن پہلے ہی کھانے کی رغبت ختم ہوگئی تھی، ایک دن فرمائش کر کے کچھ پکوایا بھی مگر کھا نہ سکے، ایک دن قبل اپنی پوتی سے فرمایا کہ گھر میں جو پانی کا حوض ہے اسے خوب اچھی طرح دھو کر اس میں صاف پانی بھر دو، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا بس میں کہہ رہا ہوں

کردو۔ اس کے بعد غشی کی کیفیت طاری ہوئی، ساری رات اسی حال میں گذر گئی، سانس چل رہی تھی اور زبان سے اللہ اللہ جاری تھا، صبح ایک صاحبِ نسبت طبیبِ حاذق کولا کر دکھایا گیا، انہوں نے نبض کی کیفیت ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا ''میں دوا تیار کرکے دیتا ہوں'' تھوڑی دیر بعد جب دوا لینے آدمی کو بھیجا گیا تو فرمایا کہ ''یہ ان کا آخری وقت ہے، ذکرِ قلبی جاری ہے، اور ان کی توجہ مکمل آخرت کی طرف ہو چکی ہے، روح اپنے رب سے ملاقات کے لیے بے چین ہے، اب کوئی علاج مفید نہیں، میں نے دوا دینے کی بات محض گھر والوں کی تسلی کے لیے کہہ دی تھی، نہ کوئی مرض ہے نہ کسی دوا کی ضرورت ہے''۔ غرض کچھ دیر بعد قلباً ولساناً ذکر الٰہی کرتے ہوئے اس دارِ فانی سے دارالبقاء کی طرف ہجرت فرما گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا اس جہاں میں

بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اس قدر اعلیٰ درجہ کے صاحبِ نسبت اور صاحبِ قلب ونظر اسلاف کی زندگی کے حالات کو تفصیل سے جمع کرکے محفوظ رکھنے کا اہتمام اہل خاندان سے نہ ہو سکا۔ کاش! اللہ کا کوئی بندہ اسی زمانہ میں جبکہ ان کے جاننے اور دیکھنے والے بقیدِ حیات تھے ان کے احوال سپردِ قرطاس وقلم کر دیتا تو آج نہ معلوم وہ حالات کتنوں کی زندگیوں میں لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ کے مصداق عملی انقلاب کا وسیلہ بن جاتے۔

بڑے بھائی کی تین نرینہ اولاد تھیں، ان میں سے سب سے بڑے عبدالشکور صاحب ہیں، جنہوں نے تعلیم کی تکمیل کے بعد ریاست دکن کے محکمہ تعلیمات میں تدریسی ملازمت حاصل کی، ۱۹۶۰ء میں وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے، اور اخیر عمر ذکر وعبادت میں گذار کر راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ دوسرے الحاج عبدالصمد صاحب بہت سادہ لوح، محنت کش ساتھ ہی بڑے دیندار تھے، یہ ان کی دینداری ہی کا فیض تھا کہ اس زمانہ کے طویل مدتی اور کثیر مشقتی سفر کو برداشت کرکے حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ پہونچے، اور بفضل خدا واپس

بھی آئے ،انہیں فن خیاطی میں مہارت حاصل تھی،اسی کو اخیر زندگی میں اپنا ذریعہ معاش بنالیا،اس کے ساتھ رامنتا پور کی قطب شاہی مسجد میں (جبکہ نہ وہاں کوئی خاص آبادی تھی نہ نمازیوں کی کثرت)مؤذنی کی جلیل القدر خدمت انجام دیا کرتے تھے،مسجد ہی کے ایک حجرہ میں نہایت ہی سادگی وخستگی مگر عزم وحوصلہ کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور خانہ خدا کی خدمت کرتے ہوئے سنہ ۱۹۸۹ء میں اپنے خالق ومالک سے جاملے۔ان للہ ما اخذ و لہ ما اعطیٰ اللہ غریق رحمت فرمائے۔تیسرے صاحبزادے جناب الحاج نورالدین صاحب ہیں،انہوں نے بھی تکمیلِ تعلیم کے بعد محکمہ تعلیمات میں تدریس کا مبارک مشغلہ اختیار فرمایا، سنہ ۱۹۹۱ء میں وظیفہ پر اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے،ماشاءاللہ بہت ہی دیندار پرہیزگار وعبادت گذار تھے،وظیفے کے بعد مدرسہ الہیہ معظم پورہ حیدرآباد میں منتظم مدرسہ کی حیثیت سے ذمہ دارانہ خدمات انجام دیتے رہے،تہذیبی رکھ رکھاؤ اور مذہبی لگاؤ قابل رشک تھا،اپنے معمولات کے پابند اور ذکر وشغل پر کاربند رہتے تھے،اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

چھوٹے بھائی کے چار لڑکوں میں سب سے بڑے صاحبزادے مولانا محمد امام صاحب (جن کی تفصیل آگے درج کی جائیگی)دوسرے محمد نظام صاحب جو مسلسل ناسازیٔ صحت کی وجہ سے سب سے پہلے انتقال کر گئے،ان کے مزید حالات معلوم نہ ہوسکے،تیسرے محمد نعیم صاحب،آپ خوش عقیدہ،خوش اخلاق نہایت ہی متشرع وپابندِ دین بزرگ تھے،سرکاری ملازم تھے،علماءِ دیوبند سے بہت اعتقاد رکھتے تھے،اوران کی مجالس ومواعظ میں اہتمام سے شرکت فرماتے تھے،آخری عمر میں اکثر ذکر وعبادت میں مشغول رہا کرتے تھے،حیدرآباد ہی میں ۱۴؍مارچ ۱۹۸۸ء کو صبح ۱۰ ؍بجے انتقال فرمایا،اور قبرستان مسجد ٹھگی جیل کاچی گوڑہ میں مدفون ہوئے۔محترم مولانا حافظ حسام الدین قاسمی اور جناب حافظ عبدالعزیز فیضی (مقیمانِ حال امریکہ)انہی کے نواسے اور صدقۂ جاریہ ہیں۔چوتھے جناب عبدالرزاق صاحب مرحوم،بلند قامت وبلند ہمت،متدین ومتشرع،عقائد واعمال میں نہایت پختہ، بارعب ووجیہ،اور غیور وجلالی بزرگ تھے،چھوٹے موٹے مختلف کاروبار کرتے تھے،

خاندان کی تمام تقریبات، قضایا و معاملات میں سرپرست و حکم کی حیثیت سے بلائے جاتے تھے، ان کے رعب وداب اور کرخت و بلند آواز سے کردئے گئے فیصلوں کے آگے سب ہی کو سرِ اطاعت خم کردینا پڑتا تھا، جامع مسجد عنبر پیٹ کے قریب رہائش تھی اور جب تک حیات رہے اس مسجد میں مسلکِ اہل حق کے پاسبان و محافظ کی حیثیت سے رہے، ۱۲ رجنوری ۱۹۹۳ء کو انتقال فرمایا اور عنبر پیٹ کے قدیم و معروف قبرستان میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

ان دونوں بھائیوں ـــــ محمد عبدالسلامؒ، محمد عبدالغفورؒ ـــــ نے دولتِ ایمان سے مشرف ہونے کے بعد اس نعمتِ عظمیٰ کی جیسی قدر پہچانی اور جس طرح اس کے حقوق ادا کئے اس کا تقاضہ تھا کہ ان کی نسل میں بھی دین اور دینداری کا یہ سلسلہ قائم رہتا جو اُن کے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہوتا، اپنے پیچھے صالح اور نیکوکار اولاد چھوڑ ہی گئے تھے، ساتھ ہی اللہ پاک نے ان اولاد میں دونوں بھائیوں کی روحانی برکات واثرات کو دیر تک قائم رکھنے کا ایک غیبی انتظام یہ فرمادیا کہ بڑے بھائی کی لڑکی محترمہ صغریٰ بی صاحبہ کا چھوٹے بھائی کے لڑکے مولانا محمد امام صاحب سے رشتہ طئے پایا اور یہ رشتہ دونوں بھائیوں کے دریائے روحانیت کا سنگم بن گیا۔

مولاناؒ کے والدِ محترم:

حضرت مولانا محمد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے ہی متقی و پرہیز گار، سلفِ صالحین کی یادگار، صاحبِ قلب ونظر، متبع شریعت، جید عالم دین اور حافظِ قرآن تھے۔ ۱۳۱۷ ہجری کے لگ بھگ پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی طور پر حاصل کرنے کے بعد اگلی تعلیم کے واسطے ریاست دکن کی قدیم درسگاہ ''جامعہ نظامیہ'' میں داخلہ حاصل کیا، اور اپنے وقت کے نامی گرامی اساتذۂ فنون سے درس نظامی کی تکمیل فرمائی، جن میں عظیم محقق، بالغ نظر فقیہ، اور متصلب حنفی عالم دین مولانا ابوالوفا افغانی، معروف ومشہور عالم دین مفتی مخدوم بیگ اور حکیم اسدالدین رحمہم اللہ جیسی مثالی شخصیات شامل ہیں۔ اساتذہ بھی ان کی سعادتمندی اور ورع

وتقویٰ کے مداح تھے، انتقال کے بعد کسی وقت حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب ؒ مولانا ابوالوفا ؒ سے ملے اور اپنا تعارف کروایا تو یہ کہہ کر بے ساختہ رونے لگے کہ تمہارے والد ہمارے شاگرد ہیں، وہ بڑے اللہ والے اور بزرگ آدمی تھے، انہیں دیکھ کر خوشی ہوتی تھی، افسوس کہ وہ جلد ہی چلے گئے۔

علوم ظاہرہ کی تحصیل واخذ سے فارغ ہونے کے بعد علوم باطنہ کی تکمیل کی جانب متوجہ ہوئے، اپنے مزاج کے موافق کسی شیخ کامل کی تلاش میں تھے کہ ریاست کے صیغۂ امورِ مذہبی کے مشہور واعظ مرحوم مولوی عبدالہادی صاحب کے ذریعہ حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کی شخصیت سے متعارف ہوکر ان سے رجوع فرمایا اور انہی سے تصوف وسلوک کے مراحل طے کئے۔ دومرتبہ دکن سے تھانہ بھون کا سفر کر کے بیعت وارادت کا تعلق بھی قائم کیا، پھر اپنے شیخ کامل کی صحبت میں رہ کر تقویٰ وطہارت، دیانت وامانت اور اتباعِ سنت کے خاص امتیازی رنگ میں اپنے کو رنگ لیا اور گویا علاقۂ دکن میں مزاجِ اشرف کے نمونہ ونمائندہ بن کر تشریف لائے۔ اپنے شیخ سے غایت درجہ عقیدت و والہانہ تعلق رکھتے تھے، مدت العمر انہی کے مزاج ومذاق پر سختی کے ساتھ کاربند رہے۔

اُس زمانے میں دکن کی حکومت دینی جامعات کے فضلاء کو سرکاری اداروں میں ملازمت دیا کرتی تھی، مولانا نے بھی شعبۂ تعلیمات سے اپنے کو وابستہ فرمالیا۔ ظاہر ہے کہ یہ شعبہ کسبِ حلال کا اچھا وسیلہ ہونے کے علاوہ رشد وہدایت کے عام کرنے کا عمدہ ذریعہ بھی تھا۔ ملازمت کے سلسلہ میں آرمور، بسمت نگر، سوریا پیٹ، بھونگیر اور مدؐور میں تبادلے ہوتے رہے۔ جہاں گئے وہاں اپنے علم وعمل، تقویٰ وپرہیزگاری، انابت وزاری، دیانت وامانت اور ارشاد وارادت کا لوگوں کے قلوب پر سکہ جمادیا۔ ان علاقوں میں اللہ کے بے شمار بندے ہیں جنہیں ان کی صحبت ومحنت کی برکت نے گمراہی وجہالت کے تاریک اندھیروں سے نکال کر ایمان کی منور راہوں پر لگادیا تھا۔

بعض بدعت زدہ اور فرسودہ مزاج لوگ ان کی توحید پسندی اور اتباعِ سنت کی وجہ سے

ان کو ستاتے بھی تھے، دھمکیاں دیتے اوران پر حملے کرنے کے منصوبے بناتے مگر وہ نہایت بلند حوصلہ اور عالی ہمت تھے، حق کے احقاق میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتے تھے، اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا عملی نمونہ تھے، خوب جم کر رہے اور بعد میں کام کرنے والوں کے لیے دعوتِ حق کا صاف ستھرا ماحول فراہم کر گئے۔ ان کے وطن مدّور میں بھی بعض بدعتی لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے، مسجد کے پیچھے چھپ کر رات کے وقت ان پر حملہ کے لیے انتظار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوتا کہ وہ مسجد جاتے باجماعت نماز پڑھتے اور گھر واپس ہو جاتے مگر کسی کو دکھائی نہیں دیتے تھے، لوگوں نے بہت موقعے ڈھونڈے، بہت کچھ تعاقب کیا مگر کوئی گزند پہونچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب وہ وہاں سے تبادلہ ہو کر آرمور پہونچے تو گاؤں کے لوگ وہاں بھی پہونچے اور مجسٹریٹ سے مل کر عرضی دی کہ یہ بددین آدمی ہے، یہاں ماحول خراب کرے گا، مجسٹریٹ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ بہت نیک آدمی ہیں، ان کا یہاں رہنا برکت کا سبب ہوگا۔

امانت ودیانت کا یہ عالم تھا کہ سرکاری قلم ودوات کو تک اپنے ذاتی استعمال میں نہ لاتے تھے، دفتر کے میز کرسیوں پر بیٹھ کر کسی ملاقاتی سے گفتگو تک کو گوارا نہ فرماتے تھے، اسکول کے اوقات میں مدرسہ سے متعلق امور کے علاوہ کسی قسم کی مصروفیت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اگر کوئی ملاقات کے لیے اتفاقاً آجائے تو وقفۂ استراحت میں ہی ملتے اس سے قبل کسی صورت ملنے کے لیے رضامند نہ ہوتے، خواہ خالی گھنٹہ کیوں نہ ہوتا، انہیں کسی نے اوقاتِ مدرسہ میں اسکول کے کام کے علاوہ کسی اور مصروفیت میں نہ دیکھا۔

وہ جب کسی گورنمنٹ ہاسٹل کے ذمہ دار تھے، ناظر تعلیمات پہونچے، ڈاک بنگلے میں ٹھہرے، دوست احباب کو جمع کر کے رات میں پتے کھیلنے کا ارادہ تھا، اسکول کے ہاسٹل سے چائے بنوا کے بھیجنے کے لیے انہیں ہدایت دی، مولانا نے انکار کر دیا کہ ہاسٹل کی تمام اشیاء امانت ہیں اور صرف طلبہ وعملہ کی ضرورت میں صرف کرنے کا مجاز ہوں، اس لیے ان کے علاوہ کسی اور کی ضیافت کے لیے میں ایک پیالی چائے بھی نہیں دے سکتا، کنویں میں پانی

قدرتی موجود ہے وہ دے دوں گا، دودھ، شکر، پتی کا نظم آپ کو خود کرنا ہوگا۔

ایک مرتبہ کسی عقیدت مند نے گاؤں کے باہر اپنے گھر کا سنگِ بنیاد مولانا سے رکھوایا، جب تعمیر مکمل ہوئی تو ان کی دعوت کی، کافی دور تک پیدل چل کر پہونچے، گھر کے سامنے اس نے چارپائی ڈال کر بٹھا دیا، تھوڑی دیر بعد مولانا نے صاحبِ خانہ سے بُلا کر پوچھا کہ جب پہلے آیا تھا تو یہاں سڑک پر ایک درخت بھی تھا وہ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا میں نے کٹوا دیا، پوچھا لکڑی کیا کی؟ کہنے لگے میں نے استعمال کرلی، پھر پوچھا کہ یہ جو آج کھانا پکا ہے اس میں بھی استعمال کی؟ تو انہوں نے بتلایا کہ اس میں بھی وہی لکڑی استعمال ہوئی ہے۔ فرمایا یہ درخت سرراہ حکومت کے لگوائے ہوئے ہیں، ان کا ذاتی استعمال میں لینا درست نہیں تھا، میں تو اس دعوت میں شریک نہیں ہوسکتا، یہ کہہ کر اپنی عصا لی اور بھوکے ہی واپس چلے آئے۔

ایک مرتبہ بس سے نلگنڈہ جارہے تھے، کنڈیکٹر نے عقیدت کی وجہ سے ٹکٹ کے پیسے نہیں لیے، انہوں نے بتلایا کہ یہ تمہاری ملکیت نہیں ہے مگر وہ نہ مانا تو چپ ہوگئے اور واپسی میں دو ٹکٹ خرید کر وہ رقم کمپنی کو واپس کردی۔ اسی طرح اپنے والد کے انتقال کے بعد انہی کے مکان میں قیام رہا تو جب تک میراث باقاعدہ تقسیم نہ ہوئی مکان کا کرایہ ادا کرتے رہے۔

مساجد کی تعمیر اور آبادی کا بہت شوق تھا، جہاں پہلے سے مسجد ہوتی اسے بڑی جانفشانی سے آباد فرماتے تھے اور جہاں نہ ہوتی یا کافی نہ ہوتی وہاں اس کی تعمیر کا بندوبست فرماتے تھے۔ آرمور کی مسجد شوکت الاسلام اور سریاپیٹ کی مسجدِ اقصیٰ انہی کی یادگار ہیں۔ علم وعمل اور تقویٰ کی برکت سے وہ جہاں ہوتے تھے جمعہ وعیدین وغیرہ انہی کے ذمہ کئے جاتے تھے، وہی امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

آرمور آئے تو یہاں مسجد کے لیے کوشش کی، تعلقہ دار نے جگہ منتخب کرلینے کے لیے کہا تو ایک پہاڑی پر ویران سی جگہ کا انتخاب کیا، لوگوں نے کہا یہاں مسجد بنائیں گے تو کبھی آباد نہ ہوگی، مسجد میں گدھے لوٹینگے، مگر انہوں نے اسی جگہ کو منتخب کیا اور یہ فرمایا کہ آئندہ آبادی اسی طرف زیادہ ہوگی اور مسجد آباد رہے گی، چنانچہ بعد میں اسی طرح واقع ہوا، آج یہ مسجد شہر

کے بیچوں بیچ اور بہت ہی آباد مسجد ہے۔

قرآن کریم کی تلاوت سے بہت لگاؤ تھا، بچے پڑھنے کے قابل ہوئے تو انہیں حفظ پر لگایا، بڑے بیٹے کو کم سنی میں یوپی سے تراویح سنانے کے لیے آئے ہوئے ایک حافظ جی کے ساتھ یوپی روانہ کر دیا تھا، چھوٹے بیٹے کو اپنی نگرانی میں ہی حفظ شروع کرایا، نگرانی اور اہتمام کی خاطر ان کے ساتھ خود بھی حفظ کرنا شروع کر دیا تھا، مصروفیات کی وجہ سے تھوڑا تھوڑا کر پاتے تھے مگر کرتے رہے، انتقال سے دو سال قبل اپنا حفظ بھی مکمل کر لیا، ہر سال جس قدر یاد ہو چکا ہوتا اس کو تراویح میں سناتے تھے، آخری دو سال تراویح میں مکمل کلام پاک سنایا۔

ملازمت کے سلسلہ میں آخری تبادلہ سریا پیٹ ہوا تھا، مستقل قیام وہیں پر رہا، عارضۂ قلب کے نتیجہ میں علاج کے لیے حیدر آباد منتقل کئے گئے، جب دواخانہ لے جانا تجویز ہوا تو دواخانہ منتقل ہونے سے قبل حساب کتاب کی صفائی کی، امانتیں متعلقین کو واپس کروائیں، تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش و مطمئن ہو کر دواخانہ چلنے کے لیے تیار ہوئے۔ ایک ماہ تک دواخانہ عثمانیہ میں زیر علاج رہ کر بالآخر بہ عمر ۵۵ رسال راہی ملکِ بقا ہوئے، جنازہ دواخانہ سے ان کی بیٹی کے گھر بمقام عنبر پیٹ لایا گیا، بڑے صاحبزادے حافظ محمد عبدالمعز صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور عنبر پیٹ کے قدیم و معروف قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ بزرگانِ خاندان کی روایت ہے کہ جب آپ کی روح قبض ہوگئی تو آپ کے اوپر ایک شال اڑھادی گئی تھی جو براؤن کلر کی تھی، دیکھنے والوں نے دیکھا اور بار بار دیکھا کہ ریش مبارک سے ایک روشنی شال میں سے چھن کر باہر آ رہی تھی جو نمایاں طور پر دکھائی دیتی رہی۔

مولاناؒ کی والدہ محترمہ:

حضرت مولانا محمد امام صاحبؒ تو باقاعدہ عالم اور صاحبِ تقویٰ بزرگ تھے ہی، ان کی اہلیہ بھی ماشاءاللہ بڑی خوبیوں کی حامل اور کمالاتِ ظاہرہ و باطنہ سے متصف تھیں، گویا شوہر اگر اپنے قابل قدر باپ عبدالسلام صاحب کے کمالات کے امین تھے تو بیوی اپنے لائق فخر

باپ عبدالغفور صاحب کی خوبیوں کی پاسبان تھیں۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ نہایت سلیم الطبع، پاکباز، پابندِ صوم وصلوٰۃ، نہایت صفائی پسند، سخی داتا اور ذکر وشغل کی پابند تھیں، سلیقہ وصفائی گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی، ذاتی امور میں رکھ رکھاؤ کے علاوہ گھر گھرہستی کے امور میں حد درجہ سلیقہ وصفائی کا اہتمام فرماتی تھیں، اسی کی تربیت اولاد کو دیتی تھیں، شوہر اور اولاد کی خدمت کو بسا غنیمت تصور فرماتی تھیں، پکانے کھلانے کا بھی بہت شوق تھا، بہشتی زیور کی مدد سے طرح طرح کے اور نت نئے پکوان کیا کرتی تھیں، اپنے اذکار ومعمولات کی بھی بڑی پابند تھیں۔

خصوصاً قرآن مجید سے والہانہ تعلق تھا، ہر وقت تلاوت کرتی رہتیں، کثرتِ تلاوت سے اس کا بہت حصہ ازبر ہو گیا تھا، اکثر کام کاج اور مشاغل کے دوران بھی کسی کی زبان سے قرآن مجید کا کوئی لفظ غلط سن لیتیں تو وہیں سے فوراً ٹوک دیتی تھیں، حد یہ ہے کہ اپنی وفات کے وقت بھی تلاوتِ قرآن میں مشغول تھیں، کتابِ الٰہی سے ان کا یہ غیر معمولی تعلق ہی ان کی ولایت وبزرگی کے لیے کافی شہادت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: اهل القرآن هم اهل الله و خاصته، قرآن سے والہانہ وماہرانہ تعلق رکھنے والے ہی اہل اللہ اور خواص امت ہیں۔

سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کسی چیز کی خریداری کرتی ہوتیں اس وقت محلہ کی کوئی عورت یا بچے پہونچ جاتے تو انہیں بھی کچھ نہ کچھ ضرور دلایا کرتی تھیں، اس کے علاوہ لوگوں کے دکھ درد کا احساس اور ان کی حاجت برآری کی بڑی فکر رہتی تھی۔ اپنی بیماری اور تکالیف کے دوران شوہر کو تشویش میں دیکھ کر فرمایا کرتی تھیں کہ مولوی صاحب! آپ فکر نہ کریں صغریٰ بی مر جائے گی تو کبریٰ بی آجائے گی، خدا کا کرنا دیکھئے ان کے انتقال کے بعد جب مولانا نے دوسرے نکاح کا ارادہ فرمایا تو جن خاتون سے نکاح ہوا ان کا نام کبریٰ بی ہی تھا۔

اس اللہ کی بندی کی زندگی جس طرح قابلِ رشک تھی وہ تھی ہی، موت اس سے زیادہ قابلِ فخر تھی، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ مرض الوفات میں مبتلاء ہوئیں اور موت کا

وقت قریب ہوا تو تلاوتِ قرآن میں مشغول ہوگئیں، آخری لحات میں اس آیتِ کریمہ کی تلاوت سے رطب اللسان تھیں: رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ، اسی کو دہراتے ہوئے اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف ہجرت فرما گئیں۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ سریا پیٹ ہی میں ان کی آخری قیامگاہ ہے۔

مولاناؒ کے بھائی بہن:

مولانا محمد امام صاحبؒ کی اولاد میں سب سے بڑی ان کی صاحبزادی محترمہ سعیدہ بانو عرف امیر جانی صاحبہ تھیں، اپنے والدین کی بہت خدمت کی اور ان کی تربیت سے بہت حصہ پایا تھا، ان کا عقدِ نکاح حضرت مولانا سید محمد صاحب ذکی قاسمی رحمہ اللہ سے ہوا تھا۔ یہ راقم سطور کے حقیقی نانا نانی ہیں، حضرت مولانا ذکی صاحبؒ بہت ہی مجاہد عالم دین تھے، اللہ نے ان سے بہت کام لیا، اور خوب اولاد عطا فرمائی اور ان کی اولاد کو علم وعمل کے اعتبار سے ایک بافیض وبابرکت خاندان بنایا، ان کا تذکرہ مستقل مضمون کا متقاضی ہے، انشاء اللہ آئندہ لکھوں گا۔ دوسرے حضرت حافظ محمد عبد المعز صاحب مدظلہ ہیں، سینکڑوں حفاظ وعلماء کے استاذ، حافظ وقاری عبد اللہ فاضل صاحب (ورنگل) کے والد، محی السنۃ حضرت ہردوئی رحمہ اللہ اور اپنے والدِ گرامی کے تربیت یافتہ ہیں، پولیس ایکشن میں رضا کاروں میں شامل بلکہ اپنے حلقہ کے قائد تھے، نہایت ہی سمجھدار، ملنسار، حلیم الطبع اور زاہد وقانع ہیں، کثیر العیالی اور تنگ دستی کی وجہ سے کسی ایک جگہ نہ رہ سکے، دور ونزدیک کے مختلف مقامات میں قرآن مجید کی تدریس اور طلبۂ مدارس کی تربیت کی خدمات انجام دیتے رہے، جہاں گئے دینی تقاضے کی بنیاد پر گئے اور جہاں رہے وہاں بڑی محنت سے خدماتِ مفوضہ انجام دیں، اس وقت سلاخ پور میں بفضلہٖ تعالیٰ بہ عمر ۸۴ سال دینی خدمت میں مصروف ہیں، صبر ورضا کے پیکر اور شکر وثنا کے خوگر ہیں، بڑی بہن کے وصال کے وقت بھی اور چھوٹے بھائی کے انتقال کے موقعہ پر بھی بڑے حوصلے وہمت کا مجسمہ اور رضا برقضا کا عملی نمونہ بنے رہے۔ ہر ملنے والے سے کہہ رہے تھے کہ ''مولانا مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے مگر بڑے آدمی تھے، وہ چلے گئے ہم رہ گئے،

اصل چیز یہ ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق گذرے۔ وہ اچھے کام کر کے چلے گئے ہم کو اچھے کام اور اچھی زندگی کا خیال رکھنا ہے جو ہمارے مولا کو پسند آجائے۔'' تیسرے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ ہیں۔ یہ تینوں بڑی بیوی کی اولاد ہیں، ان کے انتقال کے بعد سر یا پیٹ ہی کے قریب۔ نما مول میں دوسرا نکاح کیا تھا، ان سے بھی تین اولادیں ہوئیں مگر دو کا بچپن میں انتقال ہو گیا، ایک لڑکی محترمہ حفیظہ بانو صاحبہ زندہ رہیں اور ہیں۔ یہ محترم جناب مولوی عبدالحمید صاحب کی زوجہ اور متعدد حفاظ کی ماں ہیں۔

مولاناؒ کی ولادت وطفولیت:

حضرت مولانا محمد عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کی پیدائش پاسپورٹ[۱] وغیرہ کے مطابق سنہ ۱۹۳۵ء میں آبائی وطن مدور ہی میں ہوئی، محمد عبدالعزیز نام تجویز ہوا، اہل خاندان سردار میاں کے نام سے پکارتے تھے، مولانا کی کم سنی ہی میں والدہ محترمہ انتقال کر گئیں اور حضرت مولانا محمد امام صاحبؒ کا ضلع نظام آباد کے قصبہ آرمور تبادلہ ہو گیا۔ یہیں پر بچپن کا زمانہ گذرا، والدِ محترم نے پانچویں جماعت تک اسکول پڑھانے کے بعد حفظِ قرآن مجید میں لگایا، اس سلسلہ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کچھ دن مالیگاؤں میں اور کچھ دن دیوبند میں بھی رہے، دیوبند میں مفتی اعظم حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کے گھر رہنے کا اور ان کے بچوں کے ساتھ پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کودنے کا بھی موقع ملا۔ چودہ برس کی عمر تک حفظِ قرآن مکمل کر لیا، حفظ کا آغاز اور تکمیل والدِ محترم کے پاس ہی ہوا۔

ابتدائی تعلیم وتربیت:

ان کے والدِ محترم نے عالمیت کی تعلیم کے لیے محی السنۃ حضرت ہردوئیؒ سے صلاح ومشورہ کے بعد دونوں بچوں کو ہردوئی روانہ کر دیا، اور اس پیغام کے ساتھ کہ میں اپنے بچوں کو تعلیم وتربیت کے لیے مکمل طور پر آپ کے حوالہ کر رہا ہوں۔ چنانچہ حضرت ہردوئی رحمہ اللہ کو

---

[۱] مجھے میری نانی صاحبہ نے جو مولاناؒ کی بڑی بہن تھیں ان کی تاریخِ پیدائش ۲۱؍شعبان ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۰؍دسمبر ۱۹۳۳ء بروز یکشنبہ لکھوائی تھی۔ واللہ اعلم

بھی ان سے خاص عنایت وتعلق اور خصوصی توجہ رہی، پھر چونکہ مولانا کے والدِ محترم کا ان کے قیام ہردوئی کے زمانہ میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے حضرت رحمہ اللہ نے مزید شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے ہوئے اپنی توجہات ان کی جانب مبذول کردیں۔ مولانا نہایت ہی ذکی وذہین اور سلیم الفطرت تھے، بڑی محنت اور جستجو سے علم حاصل کیا، اس زمانہ میں مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی میں ابتدائی جماعتوں کا باقاعدہ نصاب نہ تھا، جتنا طالبِ علم پڑھ سکتا پڑھادیا جاتا تھا، اور اساتذۂ کرام بھی ویسے ہی محنتی وہمدرد تھے، بالخصوص حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ کا تو اس عاجز کے زمانۂ طالبِ علمی میں بھی یہی حال تھا کہ جمعہ کے دن بھی حضرت کو اسباق کا ناغہ گوارا نہ تھا۔ ایسے استاذ کسی محنتی اور شوق مند شاگرد کو مل جائے تو ترقی کی کیا حد ہوسکتی ہے؟ مولاناؒ نے سال بھر میں درسِ نظامی کی بتیس کتب پڑھ ڈالیں اور ایک ریکارڈ قائم کرکے اساتذہ کے منظورِ نظر اور حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ کی نگاہ میں قابلِ قدر ٹھہرے۔

علوم عالیہ کی تکمیل:

ہردوئی میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا تو حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ مظاہر علوم جانا تجویز کیا اور داخلہ کے لیے گویا ان کے والد کی نیابت کرتے ہوئے بہ نفسِ نفیس مظاہر علوم پہونچ گئے، مولانا کو براہِ راست وہاں پہونچنا تھا لیکن گاڑی تاخیر سے پہونچی، حضرت محی السنۃ رحمہ اللہ واپسی کے لیے جب سہارنپور اسٹیشن پہونچے اس وقت ادھر مولانا کی گاڑی بھی سہارنپور پہونچ گئی۔ اسٹیشن ہی پر ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ میں نے داخلے کا سب نظام کردیا ہے، مولانا ظہور الحسن کسولویؒ سے جاکر مل لو۔ چنانچہ ان کے ذریعہ داخلہ کی کاروائی مکمل ہوکر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دور دراز کے علاقہ سے آئے ہوئے ہونے کی وجہ سے طلبہ میں ابتداءً تو ذرا اجنبی ہی سے رہے لیکن جب اسباق شروع ہوئے اور تکرار کی محفلیں جمنے لگیں تو حضرت مولاناؒ کی تکرار دیکھتے دیکھتے مشہور ہوگئی، کہتے ہیں کہ مولانا اسباق کی تکرار میں اساتذہ کی تحقیقات کو اس سلیقے سے نقل فرماتے تھے کہ ساتھی طلبہ مطمئن

ہو جاتے، اس تکرار نے چند ہی دنوں میں انہیں ساتھیوں میں مقبول بنا دیا تھا۔ دو سال تک مولانا مظاہر علوم ہی میں پڑھتے رہے، اس اثنا میں دار العلوم دیو بند جانا آنا ہوتا رہا، پہلے بھی وہ دیو بند چند ماہ کے لیے رہ چکے تھے، اکابر دیو بند اور اس وقت کے اساتذۂ کرام بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ سے قلبی تعلق اور فکری لگاؤ زیادہ تھا، وہاں کا طریقۂ تدریس اور اندازِ تقریر بھی ان کے مزاج کے موافق تھا اس لیے انہوں نے دو سال بعد دار العلوم منتقل ہو جانے اور وہیں سے تکمیل علوم کرنے کا تہیہ کر کے دار العلوم میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۵۷ء میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور علامہ فخر الدین احمدؒ سے بخاری شریف کی تکمیل کرتے ہوئے سندِ فراغت حاصل کی۔ مظاہر کی طرح دار العلوم میں بھی مولانا کی طالبِ علمی دیگر طالبِ علموں سے ممتاز اور مایۂ ناز رہی۔

قسمت کی خوبی:

اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لیے جس بندہ کا انتخاب فرما لیتے ہیں اس کی تربیت کا غیبی سامان بھی فراہم کر دیتے ہیں، حضرت مولاناؒ کی تعلیم و تربیت میں بھی تکوینی اختصاص نظر آتا ہے، ان کے والد خود عالمِ دین اور صاحبِ نسبت و تقویٰ بزرگ تھے تو والدہ وقت کی رابعہ تھیں۔ بچپن ان کی نگہداشت میں گذرا، جوان ہوئے تو خانقاہِ امدادی و خانوادۂ اشرفی کے چشم و چراغ محی السنۃ حضرت ہردوئی رحمہ اللہ کا سایۂ عاطفت اور نگاہِ محبت ملی، اشرف المدارس کا یہ ابتدائی دور تھا اور حضرت ہردوئی رحمہ اللہ بذاتِ خود پڑھاتے بھی تھے، طلبہ کے ساتھ کھاتے بھی تھے، کبھی کبھی کھیلتے بھی تھے، اور تربیت کا سارا نظام براہِ راست انہی کی توجہ میں قائم تھا، طلبہ بھی کم تھے اس لیے ہر طالبِ علم ان سے بھرپور استفادہ کرتا تھا۔ مولاناؒ کے والد حضرت کے پیر بھائی تھے اس کا لحاظ بھی تھا، ان چیزوں سے مولاناؒ نے بھرپور فائدہ اٹھایا، پھر علمی صلاحیتوں کے بننے اور پروان چڑھنے کا وقت آیا تو تکوینی طور پر علوم عالیہ کی تحصیل نصف مظاہر میں اور نصف دار العلوم میں ہوئی، اس کا کوئی ظاہری منصوبہ نہ تھا، لیکن اس زمانہ میں مظاہر علوم اور دار العلوم دونوں درسگاہوں میں اسلاف کی یادگار شخصیات موجود

تھیں، علم وعمل کا باوقار و پُر بہار ماحول تھا اور ملک کے نامور مایۂ ناز شیوخِ حدیث وفقہ اور اساتذۂ علوم وفنون جمع تھے۔ اطراف واکناف کی خانقاہیں بھی ضیا بار تھیں سونی سنہ ہوئی تھیں۔ غرض آغازِ شعور سے عنفوانِ شباب تک ان کی زندگی کے تمام لمحات واوقات کاملین کی صحبت اور ماہرین کی توجہ وعنایت میں پڑھتے پڑھاتے اور سیکھتے سکھاتے گذرے۔ اس مبارک وپاکیزہ ماحول اور ان لائق وخدارسیدہ اکابر کی توجہ نے سرزمین دکن کے اس ذرّہ کو آفتاب اور اس یتیم وبیسیر کو علاقہ کے مسلمانوں کا امیر کبیر بنا کر واپس کیا تھا تو تعجب کیا؟

دینی خدمات کا آغاز:

فراغت کے بعد وطن واپس آئے، حقیقی والدہ بچپن ہی میں رخصت ہوگئی تھیں، والد صاحب زمانۂ طالبِ علمی میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے، بہن بھائی شادی شدہ اور گھر بار والے تھے، اس لیے خاندان اچھا خاصا موجود ہونے کے باوجود ایک گونہ تنہائی تھی، مگر حضرت مولانا اپنے اندر بہت ہی باحوصلہ باوقار اور انتہائی مدبر دل ودماغ رکھتے تھے، کام کے مناظر دیکھے ہوئے، کام کی شخصیتوں کے ساتھ رہے ہوئے تھے، کام کی فکریں لے کر وطن واپس ہوئے تھے، عزائم پختہ حوصلے بلند اور ہمت جواں تھی، نظام آباد جیسے وسیع وعریض شہر اور کثیر آبادی کو میدانِ عمل کے لیے منتخب کیا، یہاں مولانا حمید احمد صاحب اور مولانا عیسیٰ صاحب جیسی ہم مسلک علمی شخصیتیں موجود تھیں، ان کی سرپرستی وراہنمائی اور ہمت افزائی خوب حاصل رہی، مسجد ملا اشرف اعظم روڈ کی امامت سے دینی خدمات کا آغاز فرمایا، مسجدِ حطائی، مسجدِ عروب اور مسجدِ قلعہ میں تفسیری وتحفیظی خدمات انجام دیں، حق کے احقاق اور رسوم وبدعات کے ابطال میں مجاہدانہ کردار ادا کیا، کئی حفاظ تیار ہوئے، عقائد وافکار کی اصلاح ہوئی، بہت سے لوگ حق کی طرف مائل ہوئے اور ماشاء اللہ بہت کام ہوا۔

مولانا حمید احمد بجنوریؒ:

نظام آباد میں حضرت مولانا حمید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پختہ مسلک عالم دین تھے،

حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے عقید تمند اوران کے خلیفہ، مسلکِ دیو بند کے ترجمان اور جمعیۃ علماءِ ہند کے سرگرم سپاہی تھے، یوپی کے ضلع بجنور سے تعلق رکھتے تھے، سن ۱۹۴۵ء میں ہجرت کر کے دکن تشریف لائے اور نظام حکومت کے صیغۂ امور مذہبی میں ناظر تعلیمات کے طور پر کام کرتے تھے، نظام آباد کی جامع مسجد اور جدید عیدگاہ کے خطیب اور سٹی جمعیۃ کے صدر بھی تھے، ۱۹۶۲ء کا تاریخ ساز جلسۂ جمعیۃ علماءِ ہند جس کی صدارت وزیر اعظم ہند نے کی تھی موصوف ہی کے زمانۂ صدارت میں منعقد ہوا تھا۔لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے مسئلہ کو لے کرانہوں نے ایک مدرسۂ نسواں بھی قائم فرمایا تھا، علمی عملی اوردعوتی وسماجی خدمات کی وجہ سے علاقہ کے بافیض علماء میں شمار کئے جاتے تھے، سنہ ۱۹۷۱ء میں وفات پائی، مسجدِ کچھیان کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وجزاہ اللہ جزاءا حسنا۔
مولانا موصوف کے دوصاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔

سنتِ نکاح کی تکمیل:

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کا رشتۂ ازدواج حضرت مولانا شریف الحسن ترمذیؒ کی وساطت اور ایماء واشارہ سے مولانا موصوف کی تیسری صاحبزادی سے طئے پایا اور فراغت کے دوسال بعد سن ۱۹۵۹ء میں بمقام جامع مسجد نظام آباد محفل نکاح منعقد ہوئی، مولانا حمید احمد صاحب آپ کے خسر محترم ہی نے خطبۂ نکاح پڑھا۔مولانا کی رفیقۂ حیات (ہماری نانی صاحبہ) ماشاء اللہ ایک صالحہ قانتہ اور پابند خاتون ہیں، ظاہر ہے کہ ایک بڑے عالم دین کے گھر پلی بڑھی تھیں، پھر ایک عالم دین کے ساتھ زندگی بسر کررہی تھیں، ہرایک کے ساتھ محبت شفقت ہمدردی وغم گساری کے علاوہ عمر بھر مولاناؒ کی خدمت اوران کی راہِ خدا کی قربانیوں میں مکمل رفاقت وموافقت ان کا خاص امتیاز ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ کی جلیل القدر خدمات میں ان کی موافقت اور گھر کی طرف سے بے فکر رکھنے بلکہ حوصلہ بڑھاتے رہنے کا بہت بڑا دخل ہے۔شادی کے بعد بھی مولانا کی خدمات دینیہ وہیں جاری تھیں، علاقہ کے مسلمان بھی خوش اور مطمئن تھے لیکن سریاپیٹ کے مسلمانوں کی طرف سے

سخت دباؤ اور اصرار ہونے لگا کہ وہ سریاپیٹ ضلع نلگنڈہ منتقل ہوجائیں۔

سریاپیٹ آمد:

سریاپیٹ ہی میں ان کے والدِ محترم رحمہ اللہ کا آخری زمانے میں قیام اور ملازمت رہی تھی، وہاں انہوں نے مسجدِ اقصیٰ کے نام سے مسجد بھی تعمیر کرائی تھی، وہاں کے لوگوں کی دینی تربیت اور سماجی خدمت بھی کی تھی، وہیں کام کرتے ہوئے بیمار ہوکر سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے تھے، اس لیے وہاں کے لوگوں کے مطالبے میں حضرت مولانا کے لیے چند در چند کششیں موجود تھیں، چنانچہ نظام آباد سے آپ ۱۹۶۲ء میں سریاپیٹ منتقل ہوکر امامت وخطابت کے علاوہ شہر اور اطراف میں دعوتی، تبلیغی اور اصلاحی جد وجہد مشغول ہوگئے، یہ سلسلہ تادمِ واپسیں قائم رہا۔

دعوت وارشاد:

مولانا ؒ کے مزاج میں تساہل اور جمود وتعطل نام کے لیے بھی نہ تھا، وہ تدبیر اور کوشش، فکر اور کام کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ انہیں کسی کام کا مفید ہونا سمجھ میں آ گیا تو وہ کام ہونا چاہیے، خواہ بظاہر اسباب وحالات کتنے ہی دشوار گذار کیوں نہ ہو، خواہ کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے، اگر کوئی ساتھ دے تو ٹھیک ورنہ وہ خود ہی کمر ہمت کس لیتے اور کھڑے ہوجاتے تھے، ان کا مزاج ؎

نہ با شتر بر سوارم نہ چوں اشتر زیر بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

کا مصداق اور عملی نمونہ تھا، نہ کسی کا بارِ احسان اٹھاتے تھے نہ کسی کے پابندِ فرمان ہوتے تھے۔

سریاپیٹ میں وہ چھوٹوں بڑوں، مردوں عورتوں، شہریوں اور دیہاتیوں سب میں ''عالم صاحب'' کے نام سے جانے پکارے جاتے تھے، ہندو لوگ بھی اسی نام سے جانتے تھے۔ حضرت، مولانا، مولوی، قاسمی، مظاہری، قبلہ وکعبہ کوئی بھی ہوگا مگر ''عالم صاحب'' وہی

تھے۔ دعا کروانی ہو، تعویذ لینی ہو، مرغی حلال کرنی ہو، نکاح پڑھوانا ہو، جنازہ اٹھانا ہو، جھگڑے چکانے ہوں، مسئلہ معلوم کرنا ہو، رمضان شروع کرنا ہو، عید کا اعلان کرنا ہو، غرض کہ چھوٹا بڑا کوئی کام ہو پتہ ''عالم صاحب'' کے بغیر نہیں ہل سکتا تھا۔ گو آخری دور میں عالم علماء بہت ہوئے اور عوام اپنی اپنی سہولت اور مناسبت کے مطابق ان میں منقسم ہو گئے لیکن ایک عرصے تک حضرت مولاناؒ کے علاوہ دور دور تک اس علاقے میں امت کی کشتی کا ناخدا کوئی اور نہ تھا۔ پھر خود علماءِ کرام کے اس تعدد و کثرت میں بھی ان کی قربانیوں اور محنتوں کا بڑا دخل ہے اور قبولیت کا یہ مقام مولاناؒ کو یونہی نہیں مل گیا تھا، اس کے پیچھے ان کی محنتیں، قربانیاں، ایثار وسخاوت اور بے لوث و بے غرض جدوجہد کارفرما تھی، وہ دین کے تقاضوں کے پیچھے جوانی کی ہر خواہش وتمنا کا خون کر کے مارے مارے پھرتے تھے، فاقوں کی سختی گوارا کر لیتے تھے، راحت ورنج اور آرام وآلام میں فرق بھول گئے تھے، ان کو سخت مزاج وشوریدہ دماغ لوگوں کی ناقدریوں کی بھی کوئی پروانہ تھی، تب کہیں جا کے قبولیت ومحبوبیت کا یہ مقام حاصل ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب کبھی ہم والدہ محترمہ کے ساتھ ان کے مہمان ہوتے تو ان کی مسجد ''مسجدِ اقصیٰ'' ——جو ''چھوٹی مسجد'' کے نام سے معروف تھی—— سے متصل ان کا مکان تھا اور مکان میں سے مسجد میں آنے کے لیے دروازہ تھا، مسجد کے ایک طرف چھوٹا سا حجرہ اور اس میں ان کا دفتر! اس دفتر کا ایک حصہ حدیث وفقہ اور تفسیر کی کتب سے معمور، بقیہ میں ایک چھوٹا سا ڈکس رکھا ہوتا، مولانا کے آنے سے قبل ہی اہل ضرورت موجود رہتے اور آنے کے بعد سے جو قصے شروع ہوتے تو پھر دن بھر چلتے ہی رہتے، گاؤں کے لوگ عادت کے مطابق ضد اصرار اور اپنی ہی بات کا اعادہ کر کے زچ کرتے رہتے مگر مولانا تھے کہ بہت تحمل سے سنتے، بڑی محبت سے سمجھاتے، کبھی ذرا گرم ہوتے پھر بڑی لجاجت سے نصیحت کرتے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس فیصلے کو قبول کرنا ان لوگوں کی ضرورت نہیں مولانا کی غرض ہے، بعض دفعہ تو آئے ہوئے دوسرے مہمان بیزار ہو جاتے۔

مدرسۂ دینی یا مرکزِ اسلامی کا قیام:

بہر حال دو سال تک تو امامت وخطابت کے ساتھ دعوت وارشاد اور دیہی مکاتب کا کام سرانجام دیتے رہے۔ سریاپیٹ اور اس کے نواح میں چلنے پھرنے شہروں سے لے کر دیہاتوں تک کی دینی ومذہبی ابتر صورتحال کا جائزہ لیتے رہنے کی وجہ سے ان کے دل میں ایک اقامتی مرکز کے قیام کا داعیہ پیدا ہوا، حسن اتفاق کہ انہیں دنوں محی السنۃ حضرت ہردوئیؒ سریاپیٹ پہونچے، ساتھ میں قطب الارشاد حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتا بگڈھی رحمہ اللہ بھی تھے۔ سریاپیٹ میں حضرت محی السنۃؒ کے لیے حضرت مولانا محمد امام صاحب رحمہ اللہ کی نسبت اور ان کے صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ کے قیام وخدمات کے علاوہ ظاہر ہے کہ کوئی اور وجہِ کشش نہ تھی۔ حضرت پرتا بگڈھی کو مسجدِ اقصیٰ کے قریب علم کی خوشبو محسوس ہوئی، انہوں نے اس کا ذکر کیا، مولاناؒ پہلے ہی سے مدرسہ کی ضرورت کا احساس فرماتے تھے، ایک اللہ والے کی کشفی تائید نے اس ارادہ کو عمل میں تبدیل کروادیا، چنانچہ سن ۱۹۶۴ء میں حضرت مولاناؒ نے سریاپیٹ میں مدرسہ بیت العلوم کے نام سے ایک دینی اقامتی مدرسہ اور زیادہ صحیح معنوں میں علاقے کی دینی ودعوتی محنتوں کا مرکز قائم فرمایا۔ یہ مدرسہ کیا تھا ایک عظیم تحریکِ اسلامی اور علاقہ کے مسلمانوں کا کہفِ امانی تھا۔

ایثار وقربانی:

اس مدرسۂ دینی یا مرکزِ اسلامی کا کوئی ذریعہ سوائے توکل علی اللہ کے کچھ اور نہ تھا، اس لیے کہ اس زمانے میں جنوبی ہندوستان بالخصوص دکن مدارس دینیہ کے اس خاص تصور سے خالی تھا جو شمالی ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ ایک عرصہ سے حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خوش فہمی وخود بینی میں مبتلا تھے، اور ان کاموں کی اہمیت ان کی سمجھ سے باہر تھی، ایسے حالات میں جب کہ علاقے میں دینی مدارس کا نظام ہی نا کے درجہ میں تھا، اور جو تھا وہ مدارس کی تحریک وانقلابی تصور سے فروتر تھا، مولاناؒ کا کسی مدرسہ کے قیام کے

لیے اقدام کرنا واقعی دل گردے کی بات اور ان کے توکل علی اللہ اور اعتماد و یقین کا ثمرہ تھا۔ جب لوگ اس نعمتِ عظمیٰ سے واقف ہی نہ تھے تو نہ مدرسہ کو قوم کے بچے دستیاب تھے نہ قوم کا چندہ فراہم تھا۔ مولاناؒ پڑھانے کے لیے بچے بھی خود ہی ڈھونڈ کے لاتے اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا سامان بھی خود ہی فرماتے تھے، مدرسہ بیت العلوم کے ابتدائی دور کے پڑھنے والوں سے میں نے خود سنا کہ مولانا طلبۂ مدرسہ کو عوام کے تعاون سے کبھی دو وقت کا کھانا بھی فراہم نہیں کر سکتے تھے، جب ایسا وقت ہوتا تو طلبہ کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیتے تھے، چاہے بال بچوں کو فاقہ کرنا پڑے، خواہ گھر کے برتن بیچ دینے پڑیں، اس قسم کے واقعات کے آج بھی متعدد عینی شاہدین موجود ہیں، اسی ایثار و قربانی اور جانفشانی کی برکت تھی کہ آج اس چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے سے مدرسہ کے طلبہ ملک و بیرون ملک میں مختلف پہلوؤں سے دینی علمی اور ملی خدمات انجام دے رہے ہیں، جو اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ کا کھلا ثبوت ہے۔

تحریکِ مدارس:

اس مدرسہ کا قیام گویا کہ علاقہ میں تحریکِ مدارس کا آغاز تھا، اس سے قبل اگرچہ اہل حق کے چند ایک مدارس اور قائم ہو چکے تھے مگر گنتی کے چند تھے، وہ بھی کس مپرسی کے عالم ہی میں تھے، حضرت مولاناؒ کا اب یہ مشن ہو گیا تھا کہ ایک طرف جس کسی کو اہل محسوس کرتے اس کو مدرسہ قائم کرنے کی ترغیب دیتے، خواہ وہ عالم و حافظ ہو، خواہ علاقہ کے سمجھدار و بااثر مسلمان ہوں۔ دوسری جانب عوام کو مدرسوں کی مدد کرنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے اور مدرسہ سے وابستہ کرنے کا شعور پیدا کرنے کی انتھک جدوجہد فرماتے تھے۔ چنانچہ آج ان کی توجہ دہانی، ہمت افزائی اور بہتر راہنمائی کے نتیجہ میں قائم ہونے والے مدارس کی ایک بڑی تعداد شمار کی جا سکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ چاہتے تو اپنے مدرسہ کی تعمیر و ترقی اور اس کے ذرائع کے دوام و استحکام کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے جیسا کہ عموماً ہوتا بھی ہے، اور یہ کام ان کی مقبولیت و محبوبیت کے اعتبار سے ان کے لیے کچھ زیادہ مشکل بھی نہ تھا مگر ان کے

مزاج کی ساخت اور پرداخت ہی کچھ ایسی ہستیوں کے زیر سایہ ہوئی تھی جو نام کے مقابلے میں کام کو ترجیح دیتے تھے، جن کے سامنے امت اور امت کے غم کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ ان کا حال ؎

ما نمی خواہیم ننگ ونام را
گرچہ بدنامی ہست نزدِ عاقلاں

کی سچی تصویر تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے مدرسہ کو در و دیوار کے اعتبار سے آباد کرنے اور کوئی پُرشکوہ عمارت تعمیر کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ دی، جب کہ ایسی کتنی ہی عمارتوں کا ان سے سنگِ بنیاد رکھوایا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مکمل کر کے ان ہی کے ہاتھوں افتتاح بھی کروایا گیا مگر انہیں کبھی مدرسہ بیت العلوم کے لیے ایسی کسی عمارت کی ہوس نہ ہوئی وجہ اس کی وہی تھی کہ ان کا اصل منشاء مدارس کا شیوع اور رواج تھا جس کو علاقے میں رائج ہوتا ہوا دیکھ کر مسرور و مگن رہتے تھے، انہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتے، سفر کر کے ان میں پہونچتے، مفید مشورے دیتے، ہمت بڑھاتے، مشکلات کا حل بتلاتے تھے، خواہ اس مدرسہ کے ذمہ دار کا ان سے کوئی خصوصی تعلق ہو یا نہ ہو۔ یہ اس زمانے میں نادر مثال ہے۔

مدارس کی یہ تحریک جیسا کہ عرض کیا گیا ان کا مشن اور ان کے دل کی آواز تھی، اس لیے وہ ہمیشہ مدارس کے دوروں پر رہتے تھے، بہت سے مدارس کے تو وہ روزِ اوّل سے سرپرست تھے اور بقیہ تمام مدارس کے بھی وہ گویا بِن بنائے سرپرست تھے، انہیں کسی آؤ بھگت کی ضرورت تھی نہ نام ونمود کی خواہش! وہ موقع ہوتا تو خود ہی پہونچ جاتے یا ہلکے سے اشارہ پر بھی دعوت قبول کر لیتے تھے، کسی بھی مدرسہ میں جاتے تو قیام ان کا مقصد نہ ہوتا، کہیں بھی قدرِ ضرورت سے زیادہ نہ ٹھہرتے، اہل مدرسہ چاہتے بھی کہ کچھ قیام وآرام ہو جائے مگر ؎

ایک جا بیٹھا نہیں کرتے عاشقِ بدنام کہیں
آج کہیں، کل کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

اخیر عمر تک یہی حال رہا، اس سلسلہ میں وہ کسی کی رائے اور مشورہ کے پابند نہیں تھے،

ہمیشہ یہی کہتے ''میرا پہونچنا ضروری ہے میں جاؤں گا وہاں''

مسلکِ حق کی ترویج وتحفظ:

ان کا دوسرا مشن مسلک اہلِ حق کا تحفظ، اس کی ترویج اور بدعات ورسومات کا ازالہ تھا، وہ اسی علاقے میں پیدا ہوئے تھے، جس وقت وہ پڑھنے کے لیے ہردوئی جارہے تھے تب ماشاء اللہ بالغ وباشعور تھے، حالات کو سمجھنے کے قابل تھے، یہاں کے ماحول اوران کی خرافات سے اور معاشرت پر بدعات واختراعات کی یلغار سے اچھی طرف واقف تھے۔ جب ہردوئی، سہارنپوراور دیوبند میں بہ سلسلۂ تعلیم چھ سات سال کا طویل عرصہ گذارا—— وہ بھی اپنے وقت کے اکابر اہلِ علم کے ساتھ جہاں ہرطرف اتباعِ سنت کا اہتمام اور بدعات سے اجتناب واحتراز کا پختہ ماحول بنا ہوا تھا—— تو ان کے اندر اپنے علاقے میں طاری جہل کی ظلمت اور بدعات ورسومات کی کثرت کا شدید احساس پیدا ہوا، جس کا لازمی نتیجہ اصلاح وانقلاب کے جذبات اور عزمِ محکم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ انھوں نے کام کے ابتدائی زمانے ہی سے احیاءِ سنت وازالۂ بدعات ومنکرات کی طرف توجہ دی، حکمتِ عملی کے ساتھ جدوجہد اخیر عمر تک کرتے رہے، اس محنت کی برکات اب قارئین کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، خصوصاً علاقہ کے علماء کھلی آنکھوں اس مشن کی کامیابی اوراس کی برکتوں کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ ان کے زملاءِ صف اور رفقاءِ درس میں اس علاقہ کے دواور ساتھی تھے، ایک مولانا عبدالرحمن صاحب مظاہری مدظلہٗ دوسرے مولانا سید حسین صاحب قاسمی رحمہ اللہ، ان دونوں حضرات کا بھی یہی مشن رہا کہ عقائد اہل السنۃ والجماعۃ کی صحیح ترجمانی کی جائے اور معاشرہ سے بدعات کی ظلمت کو دور کرکے سنت کے نور سے منور کیا جائے۔ اول الذکر کافی عرصہ تک وطن عزیز میں اپنے علم وعمل کی بہاریں لٹاتے رہے اوراب جدہ سعودی عرب میں مقیم رہ کر اسی کام میں مصروف ہیں۔ ثانی الذکر گلبرگہ کی جامع مسجد محبس میں مدت العمر خطابت اور مسلکِ دیوبند کی ببانگِ دہل ترجمانی فرماتے رہے، گلبرگہ کے اہل حق

گھرانے اس راستہ میں ان کی قربانی و بے جگری کے آج بھی معترف وشاہد ہیں۔فجزاھم اللہ احسن الجزاء اس میں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اس زمانے کے طلبہ مدارس سے نکلتے ہوئے امت کے درد کی ایک کسک اور کوئی عظیم ہدف اپنے ساتھ میں لے کر نکلتے تھے، گھر پہونچتے ہی کام شروع کردیتے تھے، اب ؂

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

جو بھی ہو اس وقت ہمارے مدارس کی یہ کرامت افسوس ناک حد تک گھٹ گئی ہے۔ فالی اللہ المشتکی

دو اہم کارنامے:

علاقہ کے مسلمانوں کی دینی اصلاح اور سماجی استحکام کے لیے انفرادی طور پر جو کوششیں آپ نے کیں اُن سے ہٹ کر اجتماعی طور پر دو اہم کام آپ کے ذریعے اور وجود میں آئے۔ایک مجلس علمیہ آندھرا پردیش کا قیام جو اگرچہ تنہا آپ کا کارنامہ نہیں لیکن اس کے قیام و بقا میں آپ کی فکروں کا بڑا حصہ شامل ہے، یہ مجلس ۱۹۷۳ء میں قائم ہوئی اور اس کے اغراض و مقاصد میں دینی تعلیم کی ترویج، مسلکِ حق کی تبلیغ، علماء اہل حق کی تنظیم، اکابر امت سے استفادہ اور عقیدہ وعمل میں مسلمانوں کو صراطِ مستقیم کی راہ نمائی وغیرہ جیسے اہم اور غیر نزاعی مقاصد شامل ہیں۔یہ مجلس الحمدللہ تاہنوز قائم ہے، بلکہ گذشتہ ۲۵ سال سے انہی کی نظامت در یاست میں ایک منفرد مقام بنالی ہے۔دوسرے ریاستی جمعیۃ علماء کے نقیہ ونحیف جسم میں حرکت وعمل کی جان ڈالنا۔مولانا نے دہلی اور یوپی میں جمعیۃ علماء کی قوت کا چشم سر سے مشاہدہ کیا تھا، اس کی قیادت کو قریب سے قریب تر رہ کے دیکھا تھا، خصوصاً حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی حرکیاتی شخصیت سے غیر معمولی متاثر تھے، نظام آباد میں مولانا حمید احمد صاحبؒ کی جمعیۃ کے تئیں ایثار اور قربانیوں کو ملاحظہ کیا تھا، نلگنڈہ میں حضرت مولانا ترمذیؒ اور مولانا عزیز الدینؒ کی صحبت کے ساتھ جذباتی وابستگی کا تجربہ کیا تھا، اس کے مقابلہ میں ریاسی قیادت کو دیکھتے تھے کہ اس میں جمود وتعطل غالب تھا، مولانا سوچتے تھے کہ جمعیۃ علماء جس

طرح ہر جگہ اپنا مضبوط موقف اور مؤثر کردار رکھتی ہے، ریاست میں وہ کیفیت کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ ان کے نزدیک قیادت میں تبدیلی ضروری تھی، ایسے کام کسی ممدوح ومتبرک شخصیت کے بجائے مضبوط ومتحرک افراد کے متقاضی ہوتے ہیں اس لیے مولانا نے بڑی حکمتِ عملی سے ۱۹۸۹ء کے چناؤ میں جناب حافظ پیر شبیر احمد صاحب کو نائب صدر کی حیثیت سے پیش کر کے منتخب کروایا، حافظ صاحب مدرسہ فیض العلوم کے فارغ حافظِ قرآن اور پیشہ تجارت سے وابستہ تھے، طبعی طور پر متحرک وفعال تھے۔ پھر نائب صدر سے صدر منتخب ہو گئے، جمعیۃ کے لیے مولانا کا یہ انتخاب عملاً ان کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی کا ثبوت بن گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے بعد ریاست میں جمعیۃ علماء نے اپنا ایک مستحکم موقف بنایا، حافظ صاحب کی صدارت سے قبل جمعیۃ عوام میں زیادہ متعارف بھی نہ تھی، خود شہر حیدرآباد میں تک بے نام ونشان تھی، جن اضلاع میں علماءِ دیوبند تھے وہاں ضرور متعارف تھی مگر عملی طور پر اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی، اب اس کی پوری ریاست میں شناخت ہے، رعایا سے لے کر حکمرانوں تک سب ہی اس کو مسلمانوں کی ایک قوت تسلیم کرتے ہیں۔ (ان دنوں جمعیۃ علماء کا ضعف وانتشار پورے ملک میں اس کی قسمت بن گیا ہے، صرف ریاست کی شکایت کیا؟)

اتحادِ امت کا جذبہ:

ان کے علاوہ ایک اور اہم کام قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ مولاناؒ کو مسلمانوں کا بالخصوص خدامِ دین کا نزاع وخلاف بالکل گوارا نہ تھا، ان کو اطلاع ہو جائے تو بہت بے چین ہو جاتے، بہت سوچتے اور کوشش کرتے کہ کوئی صورت رفع نزاع کی نکل جائے۔ اس سلسلہ میں سفر کرنا پڑے تو سفر کرتے، اخراجات برداشت کرنا پڑے تو اس کے لیے تیار ہو جاتے اور کوئی بھی تدبیر جس میں اس کا امکان ہو ان کے لیے بڑی چیز نہ تھی وہ اس کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ انہوں نے اپنی عمر میں کتنے گھر ٹوٹنے سے بچائے، کتنی رشتہ داریوں کو مضبوط کیا، کتنے جوڑے بکھرنے سے بچائے، کتنے کاروبار خراب ہونے سے رُک گئے، کتنی جائیدادیں

ہڑپ ہونے سے بچا کر ورثاء میں بٹوائے، کتنے مدارس کا تحفظ کیا، کتنے مسائل حل کیے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اہل تعلق اس کی چند مثالیں بھی جمع کرلیں تو ایک دفتر ہوجائے۔ نزاعات میں کوئی بھی عالم دین جب کوئی اجتہادی فیصلہ کرتا ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ ہر عالم کو اتفاق ہوجائے، یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ان کے فیصلوں میں کوئی خطا نہ ہو مگر ہم یہاں ان کی۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

والی خوبی کا ذکر کررہے ہیں جو کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس تگ ودو اور قربانی میں ان کا کوئی شخصی مفاد نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا خلوص وللّٰہیت روزِ روشن کی طرح عیاں رہتا تھا۔

مجلس علمیہ کے بارے میں تو بالخصوص ان کی خواہش اور کوشش دار العلوم کے قضیے کے وقت بھی اور جمعیۃ کے انتشار کے زمانہ میں بھی یہی رہی کہ مجلس چونکہ علاقہ میں مسلک کے تحفظ اور علماء کے جوڑ کا ذریعہ ہے اس لیے اکابرِ مسلک کے فکری اختلاف کا اثر مجلس علمیہ کے اتحاد پر نہ پڑنے پائے، جب کہ ارکانِ مجلس کو کسی بھی فریق کے ساتھ وابستگی و ہمدردی کا پورا حق حاصل ہے۔

اوصاف وعادات:

طبیعت میں بہت ہی زیادہ نزاکت ونفاست تھی، لباس صاف ستھرا استعمال کرتے تھے، رکھ رکھاؤ کا اہتمام تھا، اپنی ضرورت کی سب چیزیں اپنے ساتھ رکھتے تھے، ہاتھ کی بُنی ہوئی اونی کمبل کا بچھونا پسند تھا سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے وہی بچھا کر بلا تکلف سوجاتے تھے، ایک عرصے تک اپنے کپڑے خود دھوتے تھے اور بڑے اہتمام سے دھوتے تھے، عطا وسخا میں اپنے پرائے کی تمیز نہیں کرتے تھے، عفو ودرگذر صبر وتحمل طبیعت میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا، گھر میں رشتہ دار آجاتے یا تلامذہ پہونچ جاتے بڑی خوشی سے ضیافت فرماتے تھے، اپنے بھائی بہنوں کے بچوں کو تو کھلا پلا کر ہی نہیں کپڑے دلا کر سلوا کر رخصت کرتے تھے۔

دینی حلقے کے احباب کے ساتھ بھی خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے اکرام، محبت اور انفاق کا معاملہ فرماتے تھے۔ گویا حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ کے لیے محبت، صحبت اور بذل کی شرط ادا کر کے محبتِ الٰہی کے مستحق بن جاتے تھے۔ دل کی پاکیزگی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زبان سے اپنی سنت قرار دیا ہے، ان گنہ گار آنکھوں نے دیکھا کہ بعض دفعہ مباحث میں بڑی سے بڑی گستاخی کرنے والوں کے ساتھ بھی پھر وہی سلوک کیا جاتا اور وہی محبت برتی جاتی تھی۔ گھر والوں، ماتحتوں اور خدمت گذاروں کے ساتھ بھی مولاناؒ کی جانب سے یہی معاملہ تھا۔ خورد نوازی، کام کرنے والوں کی ہمت افزائی، دوسروں کی خدمات کی تحسین و پذیرائی اور تلقین و خیر خواہی ان کی خاص عادت تھی۔ کسی عالم کا طریق یا طرزِ عمل پسند نہ آتا تو بس اسی قدر فرماتے تھے کہ ہمارے بڑوں کا تو یہ طریقہ نہ تھا، یا ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا وغیرہ، مگر تحقیر کے ساتھ ذکر نہ کرتے۔ اصابتِ رائے اور صلابتِ فکر کے حوالہ سے سب کے نزدیک ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ علم بہت پختہ تھا، یادداشت قابلِ داد تھی، پڑھانے کی صلاحیت مثالی تھی، چلتے پھرتے بھی بہ آسانی پڑھا دیتے تھے، مسائلِ جدیدہ اور حالاتِ حاضرہ پر بھی گہری نظر تھی، عالمی احوال سے غافل نہیں رہتے تھے، ان کی فکر مسلکِ حق اور مشربِ دیوبند کے رنگ میں گویا رنگی ہوئی تھی، اکابر کے جامد مقلد بھی نہ تھے، ان کے فکر و مزاج سے خروج بھی نہیں کرتے تھے، مشوروں میں مختلف آراء کے بعد ترجیح راجح یا تحکیم نافع سے پہلے ایک پُر مغز اور جامع تقریر کرتے تھے، اکابر کی کوئی نہ کوئی نظیر پیش کرتے پھر اس حوالہ کے ساتھ پوری قوت سے اپنا فیصلہ دیتے تھے۔ واقعات کی تفصیل سے میں بخوفِ طوالت گریز کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ دیگر علماء کے مضامین میں آپ اس کی تفصیل ملاحظہ کریں گے۔

تکمیلِ سلوک:

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ انہیں اپنے گھرانے میں بھی اور مدرسوں میں بھی بہت پاکیزہ اور تقویٰ و طہارت والا ماحول ملا تھا، جس کی بدولت جوانی ہی سے عملی زندگی موافق سنت تھی،

اخلاق عمدہ اور جذبات پاکیزہ تھے، عبادات کا اہتمام بھی تھا، اس سب کے باوجود انہوں نے محی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ اور حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ سے اصلاحی تعلق بھی قائم رکھا ہوا تھا، ان دونوں حضرات کی ان پر شفقتیں بھی بہت تھیں، اصلاحی قسم کی خط وکتابت کا تو غالباً زیادہ معمول نہ رہا، البتہ ان حضرات کی حیدرآباد تشریف آوری پر مولاناؒ بھی پہونچ جاتے، اور کبھی یہ حضرات بھی سریا پیٹ چلے جاتے تھے، تنہائی میں ملاقاتیں ہوتیں، غالباً اسی میں شخصی احوال اور باطنی امور پر اخذ واکتساب فرمالیتے تھے۔ شروع میں باقاعدہ طور پر بیعت نہیں ہوئے تھے لیکن اخیر میں ہو گئے تھے، معمولات کے پابند تھے، مولاناؒ چونکہ کہیں جاتے آتے ضرورت ہوتی تو ہمارے مدرسہ کے مہمان خانے میں اکثر رات کو قیام فرمالیا کرتے تھے، اس عاجز کا بارہا کا مشاہدہ ہے کہ رات میں بہت کم سوتے تھے، اکثر ذکر میں مشغول رہتے تھے، اخیر دنوں میں تو اور بھی زیادہ رجوع الی اللہ کا معمول ہوگیا تھا، گویا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کا اشارہ مل گیا تھا۔

قلب کی بے چینی اور اس کا تدارک:

یہ اسی رمضان کی بات ہے کہ مولاناؒ نے مجھے فون کروایا کہ ایک ضروری کام سے ملاقات کرنا ہے میں حیدرآباد آرہا ہوں، پھر مدرسہ پہونچتے ہی فون کروایا کہ مہمان خانے میں پہونچ چکا ہوں، راقم سطور شہر میں کہیں گیا ہوا تھا فوراً پہنچ گیا، پہونچتے ہی سلام کلام کے بعد سب کو باہر بھیج کر ارشاد فرمایا کہ ”میاں! کچھ دنوں سے میری طبیعت بہت بے چین ہے کسی طرح سکون نہیں ملتا، کئی دن ہوئے راتوں میں نیند ہی نہیں آتی، ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے، دن رات بس اسی کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ میرے حضرت (ہردوئی) بہت شفیق ومہربان باپ کی طرح تھے، مجھے ان سے ایسے مسائل میں بہت تسلی وتشفی ہوجاتی تھی، اب وہ بھی نہیں رہے، میرے محبوب استاذ حضرت قاری صاحب سے بھی مجھے اطمینان ہوجاتا تھا مگر اب قاری صاحب کی صحت ایسی نہیں ہے کہ تفصیلی بات کرسکوں، کچھ دنوں سے تمہارے شیخ (حضرت مفتی سعید احمد صاحب پرنام بٹی دامت برکاتہم خلیفہ حضرت محی السنۃؒ)

کی طرف دل مائل ہے اور ان سے ہی بہت مناسبت معلوم ہو رہی ہے، مجھے ابھی لے جا کر ان سے بیعت کرا دو، کچھ سکون مل جائے گا، میں اس معاملے میں دیر نہیں کر سکتا'' تقریباً یہی باتیں دُہرا دُہرا کر کئی دفعہ فرمائیں اور اصرار کیا کہ بس ابھی چلیں۔ ظاہر ہے کہ رمضان کا مہینہ اور سفر تقریباً سات سو کلومیٹر کا، مجھے کچھ تأمل ہو رہا تھا مگر وہ بالکل مستعد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے حضرت کو فون لگایا، مولاناؒ کا تعارف کروایا اور تقاضہ بتلایا، حضرت نے فرمایا فی الحال میں دعا کرتا ہوں اور مولانا سے کہیں کہ رمضان کے بعد تشریف لائیں، میں نے عرض کیا کہ دو جملے تسلی کے آپ ہی ارشاد فرما دیں، چنانچہ فون مولاناؒ کے ہاتھ میں دیا تو ان سے بھی یہی کہا کہ ''حضرت! حاضری کی مجھے اجازت دیجئے اور خاص توجہ فرما دیجئے، میں بہت پریشان ہوں'' حضرت نے تسلی دی اور اطمینان دلایا اور فرمایا کہ رمضان کے بعد وقت دوں گا اس وقت اطمینان سے آجایئے۔ خیر! اس کے بعد اسی وقت یہ کہتے ہوئے واپس ہو گئے کہ عید سے قبل تم ہی وقت لے لو۔ رمضان شریف کے درمیان دو مرتبہ فون کر کے معلوم کیا کہ کیا ہمارے چلنے کا وقت طے ہو چکا ہے۔ شبِ قدر کے بعد پھر یاددہانی کی کہ وقت اب لے لینا چاہیے، چنانچہ میں نے فون کیا تو حضرت والا مدظلہ نے فرمایا ۳؍شوال کو آجایئے، میں نے مولانا کو مطلع کر دیا، ۲؍شوال کو مجھے یاددہانی خود کروائی اور رات ہی میں مدرسہ پہونچ گئے۔ ۳؍تاریخ کو علی الصباح حیدرآباد سے چلے، کار ہی کے ذریعہ سفر ہو رہا تھا، راستہ میں بہت ہشاش بشاش اور خوش رہے، بعد مغرب پرنام بٹ پہونچے، عشائیہ کا حضرت نے گھر ہی پر انتظام فرما رکھا تھا، نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر حضرت کے مکان پہونچے، عشائیہ سے فارغ ہوئے، اس کے بعد حضرت نے خلافِ معمول ملاقات کا وقت دیا، مولاناؒ نے تفصیل سے احوال سنائے اور خوف وخشیت کی جاریہ کیفیت بتلائی، بیعت کی درخواست کی، حضرت والا نے تسلی دی، اکابر کے کچھ واقعات سنائے، کچھ عمل بتلایا، پھر بیعت کر کے فوراً ہی اجازت وخلافت بھی دے دی، مجھ سے فرمایا کہ احوال عالی اور نسبت پختہ ہے ان شاء اللہ مزید ترقی ہوگی۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم سے ملاقات کے بعد واپسی میں فرمایا کہ مجھے

بہت سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا، پھر کچھ ایسی مناسبت ہو گئی کہ ایک آدھ ماہ بعد ہی مجھ سے نظامِ سفر بنانے کے لیے کہا، میں نے وعدہ تو کر لیا تھا مگر اچانک مجھے کوئی کام درپیش ہوا، اس کی اطلاع دے کر کچھ مؤخر کرنا چاہا تو انہوں نے فرمایا ''میں تو نہیں ٹھہر سکتا تم رک جاؤ میں جاتا ہوں''، چنانچہ براہِ بنگلور کافی لمبا راستہ طئے کر کے پرنام بٹ گئے اور ایک دن رہ کر واپس آ گئے، ایک آدھ ماہ کے بعد پھر شدید داعیہ ہوا اور مجھ سے ربط کیا، اس وقت ان کی صحت زیادہ ناساز چل رہی تھی، میں نے بہانہ کر کے ٹال دیا، کیونکہ اس حال میں سفر بالکل مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس تفصیل کو بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ یوں تو عملی اور روحانی اعتبار سے ماشاء اللہ وہ پہلے ہی سے کیا کم تھے مگر آخری چند مہینوں میں تو نسبت مع اللہ کے مراتبِ علیا پر تیز گام ترقی فرماتے رہے۔ اہل اللہ کے حالات میں اخیر عمر کی یہ استعداد للموت کوئی نئی بات نہیں مگر ہم ایسوں کے لیے باعثِ عبرت ضرور ہے۔

زندگی کے آخری دس بارہ سال مختلف بیماریوں کے شکار رہے، مگر اس کی وجہ سے نہ اسفار بند ہوئے اور نہ بیانات کا سلسلہ ختم ہوا، ہر جلسہ میں صدر بنے بیٹھے ہیں اور چار چار گھنٹے اسٹیج پر موجود ہیں، سب سے اخیر میں جب ان کا اعلان ہوتا تو اس بڑھاپے، اس بیماری، اور کئی گھنٹوں کی طویل بیٹھک کے باوجود اس عزم و حوصلہ اور کڑک گرج کے ساتھ گویا ہوتے تھے کہ صحت مند فیل ہو جائیں۔ اس لیے سب ہی کے نزدیک ان کی بیماری کوئی اہم چیز نہ رہی، زندگی کا ناگزیر جزو بن گئی تھی۔ تقدیرِ الٰہی سے ان کے اواخرِ زندگی میں ان کے محبوب ترین دو دینی مراکز مشکل حالات کے شکار ہوئے۔ جمعیۃ علماء کی صدارت کا مسئلہ، دارالعلوم کے اہتمام کا مسئلہ۔ چونکہ مولاناؒ دونوں کے ضابطے کے ممبر ہونے کے علاوہ بہت طویل وابستگی اور جذباتی لگاؤ رکھتے تھے اس لیے قلب و دماغ کا متاثر ہونا ــــــ بالخصوص بھاگ دوڑ نہ کر سکنے کے زمانہ میں ــــــ ایک لازمی امر تھا، متاثر ہوئے اور بہت ہوئے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ دارالعلوم کے حوالہ سے کوئی بھی حادثہ ان کی تکلیف اور دل آزاری کا سبب تو ہوتا تھا مگر اس کی جانب سے وہ پریشان نہیں ہوتے تھے۔ میں نے دارالعلوم کے بارے میں

انہیں ہمیشہ مطمئن اور جمعیۃ کے بارے میں متفکر پایا۔

جسم ناتواں حوصلے توانا:

اس سب کے باوجود دینی اسفار اور دینی کاموں کی طرف سے چنداں غافل نہ تھے۔ اسی سال اوائل فروری میں عزیزم مولانا اطہر سلّمہ نے فون پر بتلایا کہ ''ابا کی طبیعت بہت ناساز ہے، رات میں تو ہم لوگ مایوس ہی ہو گئے تھے، صحت بالکل متغیر ہوگئی تھی''، میں اس وقت وجے واڑہ میں تھا، میں نے کہا میں اسی طرف ہوں صبح انشاء اللہ گھر آ جاتا ہوں، صبح پہونچا تو غسل خانہ میں تھے، تھوڑی دیر کے بعد غسل خانے سے لنگی بنیائن میں نمودار ہوئے، تھوڑی دیر کرسی پر ہانپتے کانپتے بیٹھے، کپڑے پہنے، مجھے ناشتہ کروایا، خود بھی برائے نام شریک ہوئے، میں نے عرض کیا کہاں کی تیاری ہے؟ فرمایا ''حیدرآباد جا رہا ہوں، آج بچی کے پاس رہ جاتا ہوں، کل عادل آباد میں قادیانیت کے سلسلہ میں مشورہ ہے، اس میں پہونچتا ہوں'' میں نے سوچا یا اللہ! رات میں صحت کی یہ صورتحال کہ گھر والے زندگی سے مایوس ہو گئے تھے، اور صبح اس مردِ درویش کا یہ پروگرام کہ ساڑھے چار سو کلومیٹر کے سفر کے لیے پابہ رکاب ہے؟ میں نے عرض کیا دو ایک روز کہیں نہ جائیں تو بہتر ہے، عادل آباد تو ہم لوگ جا ہی رہے ہیں، انشاء اللہ آپ کی دعا کافی ہے، فرمایا ''اب اچھا ہوں نا میاں! آخری وقت ہے کچھ کام کرنے دو، اچھا رہا تو اچھا ہی رہتا ہوں کبھی کبھی ویسا ہو جاتا ہے'' اس سلسلہ میں تو خیر انہیں نہ کوئی روک سکتا تھا نہ ہم روک سکے، البتہ یہ عبرت اور سبق ضرور حاصل ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین ان کی امت کے غم کو زندگی کی جان بنالیتے ہیں۔ بقول حضرت پرتابگڈھیؒ ؎

شکر ہے دردِ دل مستقل ہوگیا
اب تو شاید میرا دل بھی دل ہوگیا

اواخرِ حیات میں ایک بڑے عالم دین ان سے خصوصی طور پر ملنا چاہتے تھے، مجھ سے ربط کیا، میں وقت لینے کے لیے حیدرآباد ہی میں ان کی چھوٹی بیٹی کے گھر پہونچا ـــــ جہاں

وہ نسبتاً سب جگہوں سے زیادہ خوش نظر آتے تھے ـــــــ علالت کی اطلاع تھی اس لیے عیادت بھی مقصود تھی، دیکھا کہ آرام کرسی پر نیم دراز پڑے ہوئے گہری سوچ میں مبتلا ہیں، مجھے علم تھا کہ ان دنوں وہ جمعیۃ کے ایک بزرگ سے ملاقات کرنے کی کوشش میں نظام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہو گئے تھے، میں سمجھ گیا کہ اسی کا اثر ہوگا، دوسری کرسی پر بیٹھ کر سلام عرض کیا تو بہت بے دلی سے وعلیکم السلام کہہ دیا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے عرض کیا کیوں آپ اس قدر سوچتے ہیں ماموجان؟ اس کا صحت پر اثر پڑ رہا ہے نا! مسکرا کے تھوڑا سنبھلے اور فرمایا ''آں میرے سوچنے سے کیا ہوتا میاں!'' پھر جو بولنا شروع کئے تو بولتے ہی رہے، حضرت شیخ الاسلام کی وفات سے جمعیۃ کی پوری تاریخ دہرائی، کبھی درد و تأثر سے اور کبھی فرطِ مسرت سے واقعات سناتے رہے، گویا دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے، ان کی نقیہ وضعیف حالت اور یہ جذبات بھری تقریر، درمیان میں دو ایک مرتبہ روکنے کے بہانے بنایا، ناکام ہوا تو کام کا عذر کر کے خود ہی کھڑا ہو گیا۔ یہ کہہ کر رخصت کیا کہ ''اجلاس شوریٰ سے تین دن پہلے ہی کا ٹکٹ بنوالیا ہوں، میرے ذہن میں کچھ باتیں ہیں، اب دیکھنا کیا ہوتا ہے۔''

ان کی زندگی میں میری آخری ملاقات انہی عالمِ دین کے ساتھ سریا پیٹ میں ہوئی، تنہائی میں ہوئی اور ایک گھنٹہ سے زیادہ طویل رہی، وہ ایک خصوصی گفتگو تھی، اس وقت مولانا کی زبان جذباتِ قلب کی بے حجاب ترجمانی کر رہی تھی، ان کے دل کی آواز اور ضمیر کی پکار سنائی دے رہی تھی، ہم دونوں سامعین بار بار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے مگر یہ گفتگو المجالس بالامانۃ کے تحت امانت ہی رہنی چاہیے، البتہ ایک بات جس کے اظہار میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا وہ یہ کہ انہوں نے فرمایا ''دارالعلوم کے اہتمام کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، بہ آسانی حل ہو جائے گا، دارالعلوم کا اللہ محافظ ہے، اس کا کوئی نقصان نہ ہوگا، ہم طویل زمانے سے تجربہ کر رہے ہیں، لیکن جمعیۃ کی البتہ مجھے فکر ہے، اللہ کوئی راستہ اتحاد کا نکال دے'' یا یہ فرمایا کہ ''کوئی حل نکال دے۔''

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے:

۲۲؍فروری ۲۰۱۱ء کو دارالعلوم کا اہم اجلاس تھا، مولانا نے ناسازیٔ طبع کے باوجود اس میں شرکت کی، پھر ۶؍مارچ ۲۰۱۱ء کو جمعیۃ علماء ہند کی عاملہ کا اجلاس تھا، اس میں بھی گھر والوں کی جانب سے روکنے کے باوجود باصرار سفر کر کے شرکت کی، ہوائی جہاز میں آکسیجن کی قلت اور مولانا کی غیر معمولی نقاہت کی وجہ سے دماغ کی شرائین متاثر ہو کر غشی کی کیفیت کے ساتھ واپسی ہوئی اور دواخانہ میں شریک کر دیا گیا۔

۲۸؍دن تک زندگی اور موت کی کشمکش رہی، بالآخر زندگی نے ۲؍اپریل ۲۰۱۱ء کی صبح ۸؍بجے تقدیرِ الٰہی کے آگے ہتھیار ڈال دئے، جسدِ خاکی کو ان کے وطن سریا پیٹ منتقل کیا گیا، نمازِ جنازہ بعد نمازِ عشاء عیدگاہ میدان میں طے تھی، عشاء سے قبل ہی ہزاروں مسلمانوں اور سینکڑوں علماء وحفاظ سے عیدگاہ پُر ہو چکی تھی، بعد نمازِ عشاء حضرت مولانا ابوالقاسم بنارسی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نمازِ جنازہ پڑھائی ـــــ جو آج صبح ہی بہ غرضِ عیادت حیدرآباد پہونچے تھے ـــــ رات ۱۱؍بجے تدفین عمل میں آئی۔ اللہ غریقِ رحمت فرمائے۔ آمین

یہ مختصر سا مضمون اشرف الجرائد میں کئے گئے وعدے کو نبھانے کی غرض سے اور مولاناؒ کا مجھ پر جو حق ہے اس کو ادا کرنے کی نیت سے تحریر کر دیا، مجھے امید ہے کہ حضرت مولاناؒ کے خلف الرشید عزیزم مولانا سعید المظفر اطہر مظاہری سلّمہ مولاناؒ کے باقیات الصالحات کو سنبھالنے اور آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح عمری کو باضابطہ طور پر مرتب کرنے کا فریضہ بھی ادا کرینگے۔ یہ سوانح خاندان کی اگلی نسلوں کے لیے خضرِ طریق اور پوری امت کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ حق تعالیٰ حضرتؒ کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین

ایک وضاحت واعتذار:

راقمِ سطور کو اعتراف ہے کہ مولاناؒ کے ساتھ اس کا تعلق نہ شاگردی کا رہا اور نہ خدمت

وصحبت کا، ایک طویل عرصہ تک خاندان کے ایک بزرگ رشتہ داری کی حیثیت سے واقف رہا، عقیدت محبت اور عظمت کے باوجود زیادہ قریب رہنے اور سفر وحضر میں شرکت کرنے کا موقعہ نہیں ملا، اخیر ایام میں دینی خدمتوں کی نسبت سے ان کے زیر صدارت وسربراہی کام کرنے، میٹنگوں میں شریک رہنے اور کچھ قریب سے دیکھنے سمجھنے کی توفیق ضرور ہوئی، اس لیے ان کی حیات وخدمات پر اطمینان بخش اور سیر حاصل مواد قارئین کی خدمت میں نہ لا سکا، بہت سے پہلو تو خود میرے علم میں ایسے ہیں جو مضمون میں شامل نہ ہو سکے اور بہت سے ایسے ہوں گے جو قریبی اعزہ، تلامذہ اور احبابِ خاص کی نظر میں قابلِ ذکر ہوں اور یہ مضمون ان سے عاری ہوگا، جب کہ بعض باتیں اہلِ تعلق کے لیے نئی ہوں گی یا اس کے برخلاف مسموع ہوں گی، اس لیے صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مضمون کا وہ حصہ جو مولانا محمد امام صاحبؒ تک ہے، یہ میں نے ہماری نانی صاحبہ، ماموجان اور محترم نور الدین صاحب رحمہم اللہ سے مل کر باقاعدہ انٹرویو لے کر آج سے کوئی ۱۳ رسال قبل لکھا تھا، اس کی ایک قسط ماہانہ اشرف العلوم اگست ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں چھپ بھی چکی تھی، اور جسے صاحبِ تذکرہ ملاحظہ فرما چکے تھے، اور وہ حصہ جو حضرت مولانا عبد العزیز صاحبؒ سے متعلق ہے اس میں ان کے بچپن کے متعلق واقعات انہی کے بتلائے ہوئے ہیں، شوال ۱۴۳۱ھ میں پرنام بٹ جاتے ہوئے میں نے از سر نو سننا چاہا تو پہلے تو فرمایا ''تم ایک دفعہ لکھ لیے تھے نا میاں'' پھر تھوڑی دیر کے بعد چیدہ چیدہ واقعات سناتے رہے۔ ان قدیم وجدید نوٹس کی بنیاد پر ابتدائی احوال لکھے ہیں، اور باقی جو کچھ ہے وہ اس عاجز کی برجستہ خامہ فرسائی ہے، میں نے احتیاط کو حتی المقدور ملحوظ رکھا ہے، زلات اور لغزشوں سے پیشگی رجوع کر لیتا ہوں، کسی بات پر اصرار نہیں ہے، البتہ ایسی باتوں سے مجھے تحریراً مطلع فرما دیا جائے تو احسان ہوگا۔ نیز مولانا حمید احمد صاحبؒ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے صاحبزادے حافظ عرفان احمد صاحب سے پوچھ کر لکھا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

باب سوم
بعض احباب واعزہ

جناب الحاج محمود بھائی مرحوم

۲۰/۲۱/اپریل کی درمیانی شب میں ادارۂ ہذا کے ٹرسٹی اور راقم الحروف کے قدیم مخلص کرم فرما جناب الحاج محمود علی صاحب مختصر سی علالت کے بعد اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

موصوف بہت سی خوبیوں کے حامل اور گوناگوں خصوصیات سے متصف تھے، آج سے ۲۴/سال قبل ادارہ اشرف العلوم کا قیام انہی کی ایماء اور ہمت افزائی سے عمل میں آیا تھا، ابتدائی دس مہینوں میں وہ خود ہی اس کے مصارف کا تحمل کرتے رہے، اور آخری دن تک اس ادارہ کے خیر خواہ اور معاون و مددگار رہے، میرے ساتھ انتہائی برادرانہ اور بے تکلفانہ تعلقات تھے، ہر وقت میرے حوالہ سے گھر میں اس قدر ذکر کرتے تھے کہ ان کے گھر کا بچہ بچہ میرے آنے کا اس قدر منتظر رہتا کہ چند دن کا ناغہ بھی گوارہ نہ تھا، وہ خود بھی کہتے کہ ہمارے گھر میں کسی کے آنے سے اتنی خوشی نظر نہیں آتی جتنی کہ آپ کے آنے سے نظر آتی ہے؛ مجھے خود بھی ان سے خاص لگاؤ تھا، اکثر اسفار میں وہ میرے رفیق ہوتے تھے، عمر میں زیادہ ہونے کے باوجود بڑی خدمت اور راحت وآرام کی فکر کرتے تھے، اخیر زمانہ میں تو یہ حال تھا کہ مدرسہ کے یا میری خدمات کے خلاف کسی سے کچھ سننا ہی نہیں چاہتے تھے، حتی کہ ان کے بعض دوست قصداً کچھ نہ کچھ کہہ کر ان کی خفگی کا لطف لیتے تھے۔

وہ انتہائی سادہ مزاج، انسانیت نواز اور ہر کسی شخص کے ہمدرد وغمگسار تھے، انتقال کے بعد ہر طبقہ اور ہر مسلک کے لوگ چلے آرہے تھے، جو ملا اس نے اپنے اوپر اُن کے کسی احسان وخیر خواہی کا ضرور تذکرہ کیا، ساری زندگی محنت وجفاکشی کی گذاری، وہ اپنے گھرانہ

کے ساتھ اپنے وطن ''کوہیر'' سے حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے، اکلِ حلال کے لیے کسی کام اور پیشہ سے پیچھے نہیں ہٹے، کیونکہ والد جز معاش اور کثیر العیال تھے؛ کاشت کاری کی، لکڑی کی ٹال چلائی، کپڑے کا کاروبار کیا، گرم مسالہ جات اور عطریات کا کاروبار کیا، رکشے اور ٹھیلے رکھے، آٹو چلایا، اِدھر آخری دس بارہ سال سے چاول اور دودھ کی تجارت کو مستقل ذریعہ بنالیا تھا؛ تمام کاروبار میں یہی مزاج رہا کہ خریدار جو دے سکا اس سے لے لیا اور جو نہیں دے سکا اس پر کوئی دباؤ نہ مطالبہ، بلکہ عفوودرگذر سے کام لیتے رہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا خوب شکر ادا کرتے تھے، اکثر کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ چلتے پھرتے مجھے روزی دے دیتا ہے، میں کسی کا محتاج نہیں ہوں، آرام سے بچے وقت پر کھا پی لیتے ہیں، کبھی کسی قسم کا شکوہ ان سے میں نے نہیں سنا۔

دین پھیلانے کا مزاج تھا، جمعہ میں یا سفر کے دوران جو بھی دین کی بات کان میں پڑتی اسی وقت سے اس کی تبلیغ شروع کر دیتے تھے، اکثر بیان کے بعد جیسے ہی فرصت ملتی خود ہی پوچھتے تھے کہ اجازت ہو تو ساتھیوں سے مذاکرہ کروں؟ اور پورے بیان کا خلاصہ اپنی فہم کے مطابق بیان کرتے، توثیق کرا لیتے پھر شہر میں خواہ وہ دیوبندی ہو یا بریلوی، مقلد ہو کہ غیر مقلد، اس کے مسلک سے انہیں کوئی مطلب نہ ہوتا، اپنی بات ضرور اس کو سنا دیتے، اس ملنے والے کا بھی اُن سے کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا اس لیے وہ سن ہی لیتا؛ ایک بریلوی مکتبِ فکر کے مدرسہ میں ادھار چاول سپلائی کرتے تھے اور بلا مبالغہ تین تین چار چار گھنٹے وہاں کے مہتمم صاحب کے سامنے اپنا لکچر دیتے رہتے تھے، سنتوں کے اتباع کی تلقین اور بدعات کے نقصانات اور طلبہ کی صحیح تربیت کا اپنے بزرگوں اور مدرسوں کے حوالہ سے طریقۂ کار بتلاتے اور قائل کرتے تھے، ایک مرتبہ انھیں اپنے مدارس بھی لے جا کر دکھائے، کہنے میں خیر خواہی اتنی ہوتی تھی کہ بھونڈے انداز کے باوجود لوگ خوش ہوتے تھے، انکار نہیں کرتے تھے، اگر کوئی اختلافِ رائے کرتا تو اس کا بالکل بُرا نہیں مانتے تھے، کہا کرتے تھے کہ کوئی آدمی عمل کرلے گا تو ہماری آخرت بن جائے گی، ہر ایک سے ملنے، اس کی مدد

کرنے کے باوجود اپنے مسلک کا سودا نہیں کرتے تھے، پختہ عقیدہ اور پختہ مشرب تھے۔

اس وقت میں سفر میں ہوں، لگے بندھے پروگرام ہیں، پرچہ چھپنے جارہا ہے، ذہن ان کی جدائی کے غم سے مغموم ہے، دل دماغ کو کچھ لکھنے کا یارا ابھی نہیں ہے، کچھ سوچتا ہوں بہت کچھ یاد آتا ہے، اس انتشار میں اسی پر اکتفا کرتے ہوئے مجبوراً قلم کو روکتا ہوں۔

ان چند سطروں کا مقصد بھی قارئین کرام سے دعائے مغفرت وایصالِ ثواب کی گذارش کرنا ہے۔اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَ عَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ ان کے پسماندگان کو بھی صبرِ جمیل اور اجرِ جزیل عطا فرمائے، بچوں میں اتحاد واتفاق قائم رکھے اور اپنے والد کے صفاتِ حسنہ سے متصف فرمائے۔ آمین

محترم الحاج رشید بھائی مرحوم

جس زمانے میں یہ عاجز مسجد نور العلاء، باغ قادر الدولہ رین بازار میں امامت کرتا تھا مسجد میں اچانک ایک مصلی کا اضافہ ہوا، اور وہ بہ پابندی نماز میں آنے لگے، قد بلند و بالا، سینہ کشادہ، چہرا وجیہہ، اعضاء مضبوط، رنگ گورا، دیڑھ مشت کے قریب داڑھی، مسنون زلف، لانبا کرتا اور دو پلی ٹوپی! یہ تھے جناب احمد رشید الدین صدیقی، جو بعد میں راقم عاجز کے نہایت مخلص دوستوں میں شامل ہو گئے اور جلد ہی داغ مفارقت دے گئے۔

رشید بھائی اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں کم تعلیم یافتہ تھے، مگر سرکاری ملازم تھے، ابتداءً بیدر ڈسٹرکٹ کورٹ میں منشی کی حیثیت سے کام کیا تھا پھر حیدرآباد کے محکمۂ ملازمین، (لیبر ڈپارٹمنٹ) میں یوڈی سی کی حیثیت سے ملازم رہے، اور وہیں سے بہ حیثیت سینئر اسسٹنٹ وظیفہ پایا، سن ۱۹۸۰ء میں سعودی عرب چلے گئے تھے، دوستوں نے انہیں وہاں پر سیٹ کرنے کی بہت کوشش کی مگر ان کی شرائط کچھ ایسی تھیں کہ وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، کوئی پانچ سال تک سعودی عرب میں رہ کر بجائے کچھ لانے کے اُلٹا مقروض ہو کر واپس ہوئے، چوں کہ رخصتِ طویلہ پر گئے تھے اس لئے واپسی کے بعد دوبارہ ملازمت پر رجوع ہو گئے، مگر سچ بتانے کی وجہ سے ترقی رُک گئی، بعض ساتھیوں نے ترقی بحال کرنے کی صورت نکالی بھی مگر اس میں رشوت دینا لازمی تھا، رشید بھائی جو کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے وہ رشوت کے لئے کب آمادہ ہوتے، ہرگز تیار نہ ہوئے، لوگوں نے بہت کچھ سمجھایا کہ آج کل سرکاری محکمات میں کوئی فائیل اس کے بغیر آگے نہیں بڑھتی، سب ہی لوگ اس کا سہارا لیتے ہیں یہ ملک کے دفاتر کی مجبوری ہے، وغیرہ مگر اس بندۂ خدا نے

سختی سے انکار کر دیا، آخر کار معمولی منصب اور معمولی تنخواہ پر اکتفا کرنا پڑا، جس سے نہ گھر کی ضروریات پوری ہوسکتی تھیں نہ قرضوں کی ادائیگی ممکن ہوسکتی تھی۔ اس راست بازی اور حرام سے اجتناب کی وجہ سے اگر چہ اُن کے منصب میں ترقی اور مشاہرہ میں اضافہ نہ ہوسکا مگر ان کے نسبتی بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے مُخلصانہ تعاون کی توفیق دی، وہ اپنی آمدنی سے بڑی پابندی اور اہتمام کے ساتھ اپنی بہن کی مدد کرتے رہے، بہنوئی کا بھی غایت درجہ احترام کرتے تھے؛ بلکہ ان کی رائے اور ہدایت پر خیر کے دیگر کاموں میں بھی حصہ لیتے اور خوب صرف کرتے تھے، اُن کے خسر صاحب کی فکر وسعی سے ذاتی مکان کا بھی انتظام ہو گیا تھا، جو بڑے شہروں میں کم از کم آدھی تنخواہ کے مساوی ہے، اس طرح اپنی جز معاشی کے باوجود اطمینان بخش طریقہ پر گھر کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، بچوں کی تعلیم وتربیت میں بھی کامیاب رہے اور بہت سے مالداروں سے زیادہ باعزت زندگی گذاری۔

چونکہ اس مسجد میں میری امامت کے آغاز کے وقت وہ سعودی عرب میں تھے اس لئے میں ان سے واقف نہ تھا، گھر ان کا اسی محلے میں تھا، یہ سن ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ وہ واپس ہوئے اور جلد ہی مجھ سے مانوس بھی ہوئے، اکثر ظہر بعد اپنے ساتھ لے جا کر ظہرانے میں شریک رکھتے تھے، پہلی مرتبہ جب لے گئے تو بالکل حیدر آبادی وضع کا دستر خوان تھا، گرم چاول، کھٹی دال، گوشت کا سالن اور ساتھ میں پاپڑ بڑیاں اور اچار وغیرہ سب لوازمات تھے، کھانے کے بعد کبھی کبھی بیٹھک بھی ہوجاتی تھی تو ان کے حالات کا علم انہی کی زبان سے سننے کو مل جاتا، چند دن ساتھ رہنے اور حالات سننے سے باخبر ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ رشید بھائی اگر چہ صدیقی کہلاتے ہیں مگر شان خالص فاروقی ہے، دین جس قدر وہ جانتے تھے اس میں خود تو کبھی کوئی کمی نہ کرتے دوسروں کو بھی کرنے نہیں دیتے تھے، خاندان میں محلے میں سب ہی لوگ ان کے اخلاص واستقامت کے قائل تھے، ساتھ ہی سب لوگ ان کی شدت طبع اور گرمیٔ گفتار سے نالاں وناراض بھی تھے۔

رشید بھائی کے دین کا سرچشمہ تبلیغی جماعت تھی، وہ بیدر کے زمانہ قیام میں ہی کھڑی

جوانی میں تبلیغی کام سے وابستہ ہو گئے تھے، بہت کام کیا اور مجاہدانہ اسفار کئے، بہت سوں کو کام سے لگایا، خود بھی بہت پابند تھے، ان کے گھر کا ماحول بھی نماز، حجاب، ذکر واذکار، اور تعلیم کی پابندی کے اعتبار سے قابلِ رشک تھا، خانگی ماحول میں خوش اعتقادی اور نیک عملی کا اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ ہم ان کے گھر مدعو تھے، ان کا ایک چھوٹا بچہ ذہنی معذور تھا، ماں نے اسے بھی صاف ستھرے کپڑے پہنا کر دسترخوان پر بٹھایا ہوا تھا، جب کھانا آیا تو اس نے میٹھے کی رغبت ظاہر کی لیکن رشید بھائی نے روٹی سالن نکالا، اس نے پھر میٹھے کا مطالبہ کیا، انہوں نے پھر ڈانٹ کر روٹی کھانے کا حکم دیا، ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کھانے میں مصروف تھے، میں نے دیکھا کہ بچہ دسترخوان سے دوسری طرف پلٹ گیا ہے، میں نے سوچا کہ شاید ناراں ہو گیا ہے مگر غور سے دیکھا تو اس منظر سے اتنی مسرت ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا، یہ بچہ دراصل قبلہ رو ہو کر دو ہاتھ اٹھائے اللہ تعالیٰ سے میٹھا طلب کر رہا تھا، میں نے فوراً پیالے میں میٹھا نکال کر اس کے آگے رکھ دیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرحوم نے گھر کا ماحول کیسا بنایا تھا۔

بات ہمیشہ حق کی کرتے تھے اور حق پر ہی کرتے تھے مگر انداز اس قدر خشک اور جابرانہ وحاکمانہ ہوتا تھا کہ قریب ترین دوست بھی کسی موقعہ پر ایسے روٹھتے کہ پھر بن نی مشکل ہو جاتی، جماعت کے ذمہ داروں سے بھی انہیں وجوہات سے اَن بَن ہو گئی تھی، سعودی عرب گئے وہاں سب دوست تبلیغی تھے، ایسی ہی وجوہات سے ان سے بھی کٹ گئے، مرکز نظام الدین کے ذمہ داروں کے سامنے بات گئی، مکہ مکرمہ میں انہیں طلب کر کے باز پُرس کی گئی، ان کے سامنے بھی اپنی شکایت کی حقّیت تسلیم کروانے پر مُصر رہے، وہ حضرات بھی خفا ہوئے، پھر کام سے بھی کٹ گئے لیکن کام کی مخالفت کبھی نہ کی، وہ کہتے تھے مجھے کام سے کبھی شکایت نہیں کام کرنے والوں سے ہے، ہمیشہ ایک ہی اصرار کہ میں جسے غلط کہہ رہا ہوں اس کو غلط مان لیا جائے، اس اصرار پر انہیں اس لئے بھی اطمینان تھا کہ یہ باتیں اُن ہی لوگوں کی سکھائی ہوئی ہیں، اُنہوں نے تبلیغ کے علاوہ کہیں اور سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ خیر! میرے خیال

میں گو ان کی سب باتیں صحیح نہ سہی مگر اکثر باتوں میں وہ حق بجانب ہوتے تھے، ان کی اصلی کمزوری نکیر میں عجلت اور انداز میں نکرت تھی۔ مثلاً عید کی نماز کے بعد ان کے ایک محسن و مخلص دوست بغل گیر ہونا چاہتے تھے، وہ ملنے کے بعد بھی مسئلہ بتا سکتے تھے مگر انہوں نے دوست کو یہ کہتے ہوئے علاحدہ کر دیا کہ عید کے بعد گلے ملنا بدعت ہے۔ ان صاحب نے قسم کھالی کہ اب کبھی سلام بھی نہیں کروں گا، اور کوئی سال بھر تک قطع تعلق بھی کر لیا، دستِ کرم بھی روک لیا، پھر دھیرے دھیرے دونوں ہی نرم پڑے۔

مسجد میں بھی آئے دن کسی نہ کسی سے جھڑپ ہو ہی جاتی تھی، پرانے لوگ تو مزاج شناس تھے، نئے لوگ بھی محتاط رہنے لگے، یہ عاجز بھی بڑی احتیاط سے دوستی نباہتا رہا کہ گو اُن کا انداز نکیر صحیح نہیں مگر بات جو وہ کہنا چاہتے تھے اکثر وہ غلط نہیں ہوتی تھی، ایک آدھ مرتبہ ان کی غلطی پر تنبیہ کی کوشش کی مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا اور میں عمر میں ان سے خاصا کم تھا، اس لئے صبر وحلم سے کام لیتا رہا، یہاں تک کہ وہ دن بھی آیا جب کہ وہ میری کسی بات کو نہیں ٹالتے تھے، حد یہ ہے کہ میرے کہنے پر متعدد لوگوں سے معافی بھی مانگ لی، بڑوں سے اور دوستوں ہی سے نہیں چھوٹوں سے بھی معافی مانگی، جماعت کے لوگوں نے تک مانا کہ یہ شخص سوائے آپ کے کسی کے آگے نہیں جھکا، رشتہ داروں نے بھی تسلیم کیا، بلکہ گھر والوں نے بعض باتیں منوانے کے لئے میرا سہارا بھی لینا شروع کیا، بفضلہٖ تعالیٰ ناکامی نہیں ہوئی، میرے کہنے سے نزاع سے بچنے کی خاطر اپنے بعض قیمتی حقوق بھی چھوڑ دئے، شاید ہی کوئی اور اتنا ایثار کر سکتا ہو۔ اس عاجز کے سامنے مرحوم کی اس عاجزی و دین پسندی میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بس ایک سنت کا کمال ہے کہ میں ان کی ناگوار باتوں اور ناروا اداؤں کے جواب میں کبھی بے صبری و عدم تحمل کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا، وہ کبھی مجھے بھی ڈانٹ دیتے تھے مگر میں اُن کی عمر اور خلوص وللّٰہیت پر نظر کر لیتا اور احترام میں کوئی کمی نہ آنے دیتا، تا آنکہ کوئی آٹھ دس سال کی مجاہدانہ دوستی اور صبر وشکیب نے وہ دن لایا کہ بے چارے مکمل رام ہو گئے، پھر ایسی نوبت بھی آئی کہ میں انہیں ڈانتا ہوتا اور وہ معذرت

واعتراف کے ساتھ ندامت کا اظہار کرتے ہوتے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔آمین

اللہ تعالیٰ نے رشید بھائی کو چار بیٹے اور تین بیٹیاں عطا فرمائی تھیں، ان سب کی پرورش کسبِ حلال اور صدقِ مقال سے کی، سب کو دینی تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا، بیٹیاں تو سب ان کی زندگی ہی میں اچھے خاندانوں میں بیاہ کر گئیں اور ماشاء اللہ خوش حال وخوش عیش ہیں ،تینوں داماد مسنون الہیئت، پابند سنت وشریعت اور پابندِ کسبِ طیب ہیں، بیٹے سب ماشاء اللہ حافظِ قرآن اور عالمِ دین ہیں، بڑے بیٹے عزیزم مفتی عرفان احمد مظاہری سلمہٗ (استاذ اشرف العلوم) کی وجہ سے ان سے تعلقات میں اضافہ ہوا، کیوں کہ انہوں نے اشرف العلوم کے قیام کے بعد عزیز موصوف کو کسی اور مدرسہ سے نکال کر یہاں لے آئے تھے، اس کے بعد دیگر تمام بچوں کو میرے ہاں ہی تعلیم دلائی، آگے کی تعلیم کے لئے دارالعلوم اور مظاہر علوم میرے ہی مشورے سے روانہ کیا، دوسرے فرزند عزیزم مولانا احسان احمد قاسمی سلمہٗ ہیں، یہ بھی اشرف العلوم میں عربی کے استاذ ہیں، تیسرے فرزند عزیزم مولانا محمد سلمان قاسمی ہیں، چھوٹا بیٹا ذہنی معذور ہے معالجین نے عمر بھی مختصر بتائی تھی مگر تاہنوز بقید حیات ہے اور ذہنی معذوری کے باوجود تھوڑا تھوڑا قرآن مجید حفظ بھی کر رہا ہے، اور شاید یہ قرآن کا پڑھنا ہی اس کی عمر میں برکت کا سبب بنا ہوا ہے۔

میرے ساتھ ان کا سلوک مخلص دوست ہی کا نہ تھا، شفیق ومہربان بھائی کا سا تھا، وہ میری راحت وتکلیف میں برابر شریک رہتے تھے، ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ اخراجات کی پابجائی کے لئے بعض شوروس پر اکاؤنٹ دیکھنے کا کام کر رہے ہیں، میں نے سوچا کہ خود ادارے میں مستقل محاسب کی ضرورت ہے کیوں نہ ان کو یہیں کام پر لگا دیا جائے کہ دین پسند آدمی کے لئے دینی ماحول میں کام آسان رہے گا اور ہم اُن کی عمر اور صحت کا خیال بھی رکھ سکیں گے، مگر اس عاجز کو بہت پہلے مدارس کے مزاج ومصالح سے بے خبر مخلص سے کام لینے کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس لئے مزید تجربے کی ہمت نہ ہوئی، پھر بھی اُنہیں مدرسے پر کام میں لگا لینے کا داعیہ قائم ہی رہا تو ان کے سامنے تذکرہ کر کے ان کا عندیہ معلوم

کیا، وہ بخوشی آمادہ ہو گئے اور ماشاء اللہ اچھی طرح کام کیا، انہی کے ذریعے حسابات کا سارا نظام سرکاری مطالبات کے مطابق بنایا گیا، بنک کی انٹریز میں باقاعدگی پیدا کی گئی، اور آڈیٹ کا کام بھی بہت سہل ہوا۔

اللہ جزائے خیر دے، موصوف باہر آزادانہ طور پر اس سے زیادہ کما سکتے تھے مگر انہوں نے دین کی خدمت کو ترجیح دی، روزانہ پابندی سے حاضر ہوتے، ساتھ میں دوپہر کا کھانا گھر ہی سے لے آتے تھے، کبھی میرے ہمراہ کبھی تنہا کھالیتے اور شام تک مدرسہ ہی میں رہ کر مغرب بعد واپس ہو جاتے تھے، ایک مخلص و معمر آدمی کی موجودگی سے مجھے بڑی ہمت رہتی تھی۔

میری بچی کا رشتہ طے ہوا تو بہت خوش ہوئے، چھٹی لے کر گھر گئے، شام کو اہلیہ کے ساتھ میرے گھر پہونچ کر نہ صرف شیرینی اور پھول بلکہ کچھ زیور بھی ہدیہ کیا، پھر دوسرے دن مدرسہ آئے تو ستر ہزار روپئے جوان کے وظیفے کی بچی ہوئی کُل پونجی تھی، میرے سامنے لاکر رکھدی، میں نے قبول کرنے سے یہ کہتے ہوئے معذرت کردی کہ "میں آپ کے حالات سے واقف ہوں، یہ آپ کے بچوں کا حق ہے اُسے بنک میں جمع رہنے دیجئے" مگر انہوں نے اصرار کیا کہ اگر ہدیۃً قبول نہیں کرنا ہے تب بھی اس وقت تو شادی میں استعمال کر لیجئے، مجھے خوشی ہوگی پھر جب مجھے ضرورت ہوگی تو دیدینا، اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ ان کی تنگدستی و جز معاشی کے باوجود یہ فیاضی و سخاوت کہیں اس رقم کو کسی دوسری جگہ صرف نہ کرادے اس لئے مصلحتاً قبول کر کے اپنے پاس محفوظ کر لینا چاہیئے، اللہ تعالیٰ کا کرنا کہ تھوڑی ہی مدت میں ان کے بڑے بیٹے اور چھوٹی بیٹی کے رشتے طے پاگئے، میں نے انتظامات کی ذمہ داری لی اور خدا گواہ ہے کہ اس اللہ کے بندے کی اس پاک کمائی میں جس کے لئے نہ کبھی جھوٹ بولا تھا نہ رشوت دی تھی ایسی برکت ہوئی کہ ستر ہزار روپئے میں بیٹی کا جہیز اور بیٹے کا ولیمہ وہ بھی متوسط معیار کا بہ سہولت انجام پا گیا؛ طرفین کے رشتہ دار سمجھتے رہے کہ قرض اُدھار کیا ہوگا مگر یہ کسبِ حلال اور صدق و دیانت کی وہ برکت تھی جس کی یقین دہانی سے کتاب وسنت معمور ہیں؛ **ولقد صدق اللہ و رسولہ**

میرا وہ کیس جس کے تحت گجرات کی کرائم برانچ نے اب مجھے حراست میں لیا ہوا ہے، گیارہ سال قبل کا بنا ہوا ہے بعض دیگر شرکاء کیس گرفتار ہوئے تو اخبارات کے ذریعہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرا نام بھی اس میں شامل ہے، اس خبر سے اہل تعلق فکر منداور پریشان تھے، ان دنوں رشید بھائی مرحوم کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے دفتر میں مشغول رہنے کے باوجود میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوتے تھے، میں مدرسے سے باہر نکلتا تو فوراً اُٹھ کر میرے پیچھے چلے آتے، اگر گھر کی طرف جاتا تو واپس ہو جاتے اور اگر کار کی طرف بڑھتا تو کہتے "ٹھیریئے میں ابھی دفتر بند کر کے آرہا ہوں" منع کرنے کے باوجود کار میں بیٹھ جاتے اور کہتے کہ خدانخواستہ کوئی بات پیش آجائے تو کوئی تو ساتھ ہونا چاہیئے، اس طرح دھیرے دھیرے وہ مستقل رفیقِ سفر بن گئے، حالانکہ معمر تھے اور کچھ نہ کچھ عوارض لگے رہتے تھے مگر ان دنوں برابر دور نزدیک کے تمام اسفار میں رفاقت کا حق ادا کرتے رہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اسباب کی اس دنیا میں سفر جیسا کٹھن کام میرے لئے رشید بھائی مرحوم اور محمود بھائی مرحوم کی وجہ سے آسان بلکہ دلچسپ ہو گیا تھا۔

جس وقت ان کی دوسری بچی کا نکاح طئے ہوا تھا اور وہ اس کی تیاری کررہے تھے، لڑکا میرے اہلِ تعلق میں تھا، مجھ سے کہنے لگے کہ سب بچے آپ ہی کی زیر تربیت ہیں کپڑوں کی خریدی کے لئے آپ ساتھ چلئے، میں ان کے ساتھ ہولیا، اپنے ایک دوست کی دوکان پر گئے اور بہت اہتمام اور کفایت کے ساتھ خریداری کی، جب سب کام ہو گیا تو پھر مجھ سے بچتے ہوئے مزید کپڑے تلاش کررہے تھے، اس سلسلے میں بڑی دیر لگائی، کوئی کپڑا پسند نہ کرتے اور بڑھیا لاؤ اور اچھا بتاؤ کی فرمائش چل رہی تھی، میں نے ایک آدھ مرتبہ مداخلت کر کے جلدی فارغ ہونے کی رائے دی مگر انہوں نے پروانہ کی، مجھے بہت تعجب ہوتا رہا کہ اب تک کفایت ملحوظ تھی اور اب معیار ملحوظ ہو گیا ہے، مگر زیادہ کُریدنا مناسب نہ سمجھ کر خاموش ہو گیا، خیر! ایک کپڑا پسند آیا اور اس کا بھی آرڈر کر دیا، بل بنا تو سب سے قیمتی یہی آخری کپڑا تھا، انہوں نے اسے علاحدہ پیاک کرواکے مجھے دیا، میں نے ہر چند منع کیا اور کہا اتنا قیمتی کپڑا

میں نہیں لوں گا، مرحوم نے برجستہ کہا ''مولوی صاحب! یہ آپ کے مقام سے بہت کم ہے اگر میری سکت ہوتی تو میں اس سے بہتر خریدتا، آپ قبول کریں گے اور اپنے لئے ہی سلوائیں گے، ورنہ میری خوشی سب ختم ہوجائے گی''۔ چاروناچار ان کی دل داری کو اپنی ناگواری پر ترجیح دی اور سلوا کر اسی میں ملبوس ہوکر عقد نکاح پڑھایا تاکہ ان کا دل خوش ہوجائے؛ میرے اس ہدیے کو قبول کر لینے اور شادی کے دن استعمال کرنے سے بہت مسرور ہوئے۔

یہ جبہ نوشہ کے ایک دوست کو اتنا پسند آیا کہ اس نے مجھ سے باصرار وعدہ لیا کہ جب اس کا نکاح ہوگا تو میں یہ جبہ اس کو دیدوں گا، چنانچہ وہ اپنے نکاح میں یاددہانی کرا کے لے گیا، یہی پہن کر اور عمامہ باندھ کر محفل عقد میں آیا، اس کے بعد سے یہ نوجوان مسنون لباس کا عادی ہوگیا، مزید یہ کہ جزاء الاحسان کے طور پر وہ جب بھی دبئی سے حیدرآباد آتا تو میرے لئے ایک دو جوڑ کپڑے ضرور لاتا، پھر میں نے سختی سے روکدیا، بتانا یہ ہے کہ یہ مرحوم کے خلوص وللہیت کی برکت تھی۔

ایک دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ کسی قریبی عزیز سے مرحوم کی ان بن ہوگئی ہے، فریقین چوں کہ اپنے کو بے قصور سمجھتے ہیں، اس لئے قطع تعلق کی نوبت آگئی ہے، اس سے اُن کے گھر والوں کو بھی تشویش تھی، چاہتے تھے کہ یہ نزاع رفع ہر کر تعلقات بحال ہوجائیں مگر رشید بھائی کو اس کے لئے تیار کون کرسکتا تھا؟۔ میں نے مناسب موقع سے ان سے کہا: آج آپ کو میرے ساتھ سفر پر چلنا ہے، بہ خوشی تیار ہوگئے، راستے میں میں نے بتلایا کہ ''فلاں جگہ جارہے ہیں اور وہاں بات میں کروں گا آپ دخل نہیں دیں گے اور جب میرا اشارہ ہوگا آپ صرف میرے بتلائے ہوئے الفاظِ معذرت ان کے سامنے ظاہر کردیں گے''، پہلے تو وہ مجھ پر خفا ہوئے اور جتنا نزلہ گرا سکتے تھے گراتے رہے، کافی دیر کے بعد میں نے کہا'' یہ سب باتیں اپنی جگہ درست! آپ بے قصور ہی سہی! مگر اپنے نفس کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کی خاطر آج وہی ہوگا جو میں کہوں گا، کہنے لگے آپ مجھے ذلیل وبے عزت ہی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی

مرضی! میں نے ادب سے کہا کہ نہ دنیا میں ذلت ہوگی نہ آخرت میں، دونوں جگہ ان شاء اللہ آج کا دن کام آئے گا؛ خیر! ہم لوگ ان صاحب کے گھر پہونچے جو اگرچہ ان کے عزیز تھے مگر عمر میں بہت چھوٹے تھے، انہوں نے ابتداءً مرحوم کو نظر انداز کرتے ہوئے میرا استقبال کیا، تاہم جیسے جیسے وہ اپنا شکوہ سناتے گئے خود ہی ٹھنڈے بھی ہوتے گئے، ایک موقعہ پر میں نے رشید بھائی کو اشارہ کیا تو —— اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے —— مرحوم نے اتنی ہی بات کہی جتنی میں نے بتائی تھی، اس کے جواب میں فریقِ ثانی کا خون اور بھڑک اُٹھا، میں نے انہیں بھی سنبھالا، انہوں نے شرط رکھی کہ میری والدہ سے معذرت چاہنے کی صورت میں یہ معاملہ ختم ہوجائے گا؛ پس پردہ انہیں بلا کر ان سے معذرت کرلی گئی، اس پر بات ختم ہوئی اور قلوب صاف ہوگئے، ہم نے اجازت طلب کی مگر میزبان نے عشائیہ کا اہتمام کروادیا تھا، مرحوم کو وہاں کھانا کھانے پر شرح صدر نہیں تھا مگر میں نے بتلایا کہ صفائے قلب کی تکمیل ہم طعامی سے ہی ہوگی، چنانچہ سب مل کر کھانا کھائے، پھر نہ صرف یہ کہ تعلقات بحال وخوشگوار ہوگئے، بلکہ مرحوم کے آخری ایام میں ان کے علاج ومعالجے، آپریشن وغیرہ تمام امور میں اسی نوجوان عزیز نے سرگرم حصہ لیا اور خدمت کا حق ادا کیا۔

انہوں نے جس جگہ اپنا مکان بنایا تھا یہ زمین باقاعدہ معاملت کرکے مکمل رقم ادا کرکے خریدی تھی، خرید کردہ جگہ میں ناحق اضافہ کرنے کی ان سے قطعاً امید نہیں کی جاسکتی تھی، لیکن خریدی کے برسوں بعد محلے کے بعض لوگوں نے مسئلہ اٹھایا کہ مرحوم نے قبرستان کی زمین اپنی باؤنڈری میں شامل کرلی ہے، متولی نے آکر بتلایا کہ میں نے خود ناپ کی دی ہے اس میں قبرستان کا کوئی حصہ نہیں ہے، اس کے باوجود اڑوس پڑوس کے چند آدمیوں نے بیٹھ کر یہ ناحق فیصلہ کیا کہ وہ اپنے صحن کا اچھا خاصا حصہ قبرستان کی جانب والا باؤنڈری کے باہر کردیں یعنی مفت میں چھوڑ دیں، مرحوم نے رفع نزاع کی خاطر اتنی زمین ناحق دیدی جس کو ان لوگوں نے اپنی گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے استعمال کرلیا کچھ دن بعد پھر جھگڑا کھڑا کرکے دوسری جانب سے بھی زبردستی کچھ زمین حاصل کرنی چاہی، بعض مخلص ہمسایوں نے بیچ بچاؤ

کیاتواس ظلم سے بچے؛اس موقع پر میں نے مشورہ دیا کہ یہ گھر بیچ کر کسی اور محلے میں چلے جائیے ایسے پڑوسیوں میں گھٹ گھٹ کر رہنے کا کیا فائدہ؟ تو انہوں نے مجھے بتلایا کہ مولوی صاحب! جب میں نے یہ زمین خریدی تھی مجھے صحیح صورتحال معلوم نہ تھی، بعد میں معلوم ہوا کہ پورا باغ وقف ہے جسے متولی صاحب نے بیچ بیچ کر اچھا خاصا محلہ بنا دیا ہے، جب سے یہ بات معلوم ہوئی ہے میں نے طئے کرلیا ہے کہ میں اس کو فروخت کر کے اپنی جائداد نہیں بناؤں گا، جب تک میرے بچے بڑے ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوجاتے میں اسے استعمال کرتا رہوں گا، اس کے بعد تو میں اس گھر کو کسی دینی کام کے لئے وقف کردوں گا؛ اس محلے کی اب شرعی حیثیت کیا ہے اور متولی صاحب کے اختیارات کس قسم کے تھے ان سے صرف نظر مجھے یہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ حلال وحرام اور دینی احکام کے معاملے میں بہت مضبوط ومحتاط آدمی تھے، دوسروں سے اختلاف ونزاع بھی صرف دینی امور کے استخفاف اور احکام سے پہلوتہی پر ہی ہوتا تھا، ذاتی امور میں بلند حوصلہ وسیع القلب اور کریم وفیاض آدمی تھے۔

ان کے بڑے لڑکے جب مظاہر علوم سہارن پور سے فارغ ہوکر آئے تو وہ اس سعادت پر بہت مسرور ہوئے، بڑے اہتمام سے اہلِ خاندان کی اپنے گھر پر دعوت کی، احباب اور اساتذہ کو بھی مدعو کیا، انہیں بڑی امید تھی کہ اس سعادتِ عظمیٰ کے حصول پر اہلِ خاندان کی طرف سے بھی پذیرائی وہمت افزائی کی جائیگی مگر جب انہوں نے دیکھا کہ کسی کی طرف سے بھی اس طرف توجہ نہیں دی گئی اور کوئی اقدام نہ ہوا تو اس ناقدری پر بہت ملول اور افسردہ ہوئے، ایک عرصے تک کہتے رہے کہ افسوس! ہمارے خاندان میں معمولی معمولی کامیابیوں اور چھوٹی چھوٹی ڈگریوں کے حصول پر بڑی بڑی دعوتیں ہوتی ہیں اور فخر وانبساط کا اظہار ہوتا ہے، تحائف ولطائف سے سرفراز کیا جاتا ہے، مگر حافظ قرآن اور عالم دین بننے کو کوئی بات ہی نہ سمجھا گیا، کسی کو تہنیت وتبریک کے اظہار کی توفیق نہ ہوئی، اس سے مرحوم کے جذبات اور فکر کی صلابت وسلامت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مئی ۲۰۰۸ء کو وہ سخت بیمار ہوئے، ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف بڑھتی چلی گئی، یوں کافی

عرصے سے مختلف عوارض کے شکار تھے مگر فریش ہونے کی نوبت کبھی نہ آئی تھی، دواخانے میں شریک کیا گیا تو آپریشن تجویز ہوا، آپریشن سے قبل ڈاکٹر نے داڑھی نکالنے کا مطالبہ کیا، بہت ناراض ہوئے، ڈاکٹر مسلمان تھے انہوں نے تاویل کی کوشش کی تو اور برھم ہو گئے صاف کہد یا کہ یہ میری جمال داڑھی ہے، یعنی شروع سے رکھی ہوئی ہے، میں مرجانا پسند کروں گا لیکن داڑھی کے بغیر قبر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا نہیں کرسکوں گا؛ ان کے جاہ وجلال اور عزم واستقلال کو دیکھ کر ڈاکٹر نے خاموشی اختیار کرلی اسی طرح آپریشن ہوا، تیزی سے رو بہ صحت بھی ہونے لگے تھے۔

میں ایک دن عیادت کے لئے گیا تو کسی تیاردار سے میرے لئے موسمی کا جوس منگوایا، وہ پالی تھین میں لے کر آیا تو سخت ڈانٹ پلائی کہ بدتمیز آدمی! ایک عالم کے لئے اس طرح لاتے ہو؟ اس نے کہا بھی کہ گلاس میں ڈال کر دوں گا مگر رشید بھائی نے اس کو باہر نکلوادیا کہ باہر ہی سے گلاس میں ڈال کر کشتی میں رکھ کر لاؤ؛ میں نے انہیں بھی اپنے ساتھ شربت نوشی میں شریک کرنا چاہا تو بڑی مایوسی سے کہنے لگے: مولوی صاحب! اب میرا وقت قریب ہے، بس مجھے معاف کردیجئے اور مغفرت کی دعا کیجئے، میں نے صورتحال کی بہتری کا اطمینان دلاتے ہوئے بتلایا کہ ڈاکٹر بھی مطمئن ہیں مگر وہ مطمئن نہ ہوئے؛ چند دن بعد دواخانے سے ڈسچارج ہو گئے تھے، گھر پہونچ کر بھی کچھ مایوسی ہی کا اظہار کرتے تھے؛ ۲۲/جولائی کو آپریشن ہوا تھا، کوئی دو ہفتہ بعد ڈسچارج ہوئے، گھر آنے کے چوتھے روز طبیعت بحال اور ہشاش بشاش ہی تھی، ۱۳/اگست ۲۰۰۸ء کو دوپہر سے کہنے لگے ''مہمان بیٹھے ہوئے ہیں ، ان کا اکرام اور مہمان نوازی کرو" سہ پہر کو سوا تین بجے ڈریسنگ کے دوران جان جان آفریں کے سپرد کردی؛ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں اسی دن مولانا تصور صاحب زید مجدہ کی دعوت پر اندور گیا ہوا تھا، ایر پورٹ سے ان کے مدرسہ پہونچتے ہی عزیزم عرفان میاں کا فون آیا کہ ابا کا انتقال ہو گیا ہے آپ فوراً واپس آجایئے مگر ایک تو جلسہ اگلی صبح کو تھا دوسرے ہوائی جہاز کے اوقات سے بھی کوئی جوڑ

نہیں لگ رہا تھا، کوشش کے باوجود کوئی صورت حیدرآباد پہونچنے کی نہ بن سکی، تقدیرِ الٰہی سے میں اپنے اس کرم فرما اور مخلص و مشفق دوست کے حق آخرین میں شرکت سے معذور رہا، ادارہ اشرف العلوم کے صحن میں حضرت مفتی محمد عبدالمغنی صاحب مدظلہٗ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، طلبہ واساتذہ کے علاوہ اعزہ واقرباء کی بڑی تعداد شریک تھی، جسدِ خاکی دائرہ سلطان نزد مسجد معراج میں سپرد خاک کردیا گیا، اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور درجات کو بلند تر فرمائے۔ آمین

عزیزم مولوی طیب مرحوم

گذشتہ مہینے میں سفر کے لئے پا بہ رکاب اور قلم برداشتہ چند حدیث العہد مرحومین کے سلسلہ میں اپنا حق سمجھ کر فوری طور پر جو ذہن میں آیا لکھ دیا تھا، دو مرحوموں کا اور تذکرہ کرنا چاہتا تھا مگر اس کا وقت نہ مل سکا، قارئین سے دعائے مغفرت اور حسبِ مقدرت ایصالِ ثواب کی امید پر آج ان کا بھی ذکر خیر کر رہا ہوں۔

احقر جب مدرسہ سراج العلوم گنگوہ کی سرپرستی ونگرانی کر رہا تھا محمد طیب نامی ایک کمسن طالب علم کاشتکار گھرانے سے تعلق رکھنے والے کسی دیہات سے آکر اس مدرسہ میں داخل ہوئے تھے، بالکل ابتداء سے تعلیم شروع کی گئی، چند دن ہی پڑھ پائے تھے کہ احقر نے اس مدرسہ سے نگرانی وسرپرستی کا تعلق بوجوہ ختم کرلیا؛ طلبہ واساتذہ کو اختیار دیدیا گیا تھا کہ چاہیں تو علی حالہٖ کام کرتے رہیں نہ رہنا چاہیں تو مرکز رجوع ہوجائیں، اس وقت جو طلبہ وہاں سے اشرف العلوم منتقل ہوگئے تھے انہی میں یہ طالب علم بھی تھے؛ کمزور ونحیف مگر محنتی طالب علم تھے، کئی برس تک یہاں پڑھتے رہے مگر قوتِ حافظہ نے ساتھ نہ دیا بالآخر یہی طئے پایا کہ تدریس کی ٹریننگ کراکے قاعدہ ناظرہ پڑھانے کے کام پر کہیں لگادیا جائے، تصحیح کے بعد انہوں نے یہیں مدرسہ میں کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو شعبہ تجوید وناظرہ میں تقرر کرلیا گیا، ۱۲ ربرس تک مدرسہ میں استقلال وعزم سے کام کرتے رہے۔

عمر کے تقاضے سے نکاح کا مسئلہ آیا تو ان کی فکر یہ رہی کہ دیہات میں چونکہ دین کا معاملہ بہت کمزور ہے، نہ عقیدے صحیح نہ اعمال واخلاقِ اسلامی کا کچھ پتہ! خانگی زندگی میں دینی دشواری سے بچنے کے لئے شہر ہی میں نکاح کا ارادہ ظاہر کیا، پھر احقر ہی کی خواہرزادی

کے ساتھ سادگی وسنت کے مطابق ان کا نکاح عمل میں آ گیا؛ازدواجی زندگی سمجھداری کے ساتھ گذارتے رہے، بچے ہوئے اور ضروریات بڑھ گئیں تو ایک مسجد میں موذنی کی ذمہ داری بھی بڑھالی تھی، وطن جاتے آتے رہتے تھے، والدین اور اعزہ کو دین سے جوڑنے کی سعی بھی کرتے رہتے تھے،سب سے خوشگوار تعلقات، بڑوں کا احترام اور ساتھیوں سے بے تکلفی کا مزاج تھا،مسجد میں مصلیوں اور محلے والوں سے برادرانہ تعلقات تھے۔

اللہ تعالیٰ نے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا عطافرمایا تھامگر تقدیرالٰہی سے بیٹے کا کم سنی میں انتقال ہوگیا،نہایت ہی صحتمند اور حسین وجمیل بچہ ماں کی آنکھوں کے سامنے کھیلتے کھیلتے اچانک خاموش ہوگیا، اٹھا کر دیکھا گیا تو موت کا سکوت تھا،اس صدمے نے ماں باپ کا حوصلہ توڑ دیا،لیکن صابر وصامت اور قضاءوقدر سے راضی رہے؛ کئی برس کے بعداللہ تعالیٰ نے پھر بیٹا عطافرمایا،اسی رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں لڑکے کی ولادت ہوئی تو عید سے قبل عید ہوگئی، بہت ہی مسرور ومگن تھے،میرے پاس اعتکاف میں پہونچے ،نام دریافت کیا اور بہت خوشی کا اظہار کیا، میں نے مٹھائی طلب کی تو کہا کہ مٹھائی کیا؟ اعتکاف ختم ہونے کے بعد اہتمام سے دعوت کروں گا!اس خوشی کا اظہار بھی کیا کہ اس سال آپ کی دعا سے مدرسہ کا کام پہلے سے زیادہ کیا ہوں۔

ہر سال رمضان کی عید وطن جاکر مناتے تھے،اس مرتبہ گھر میں ولادت کے مسئلے کی وجہ سے تنہا گئے بال بچوں کو نہ لے جاسکے،شب عید ہی میں چلے گئے تھے، اسلئے ملاقات بھی نہ ہوسکی، دن میں فون کیا کہ جلدی میں آ گیا تھا ملاقات نہ کرسکا،سب ٹھیک ہے،عید کی نماز میں نے ہی پڑھائی اور گاؤں والوں کو کچھ دین کی ترغیب بھی دیا ہوں ؛کل واپسی ہوجائے گی ؛ اگلے دن جمعہ تھا انہیں بھی مسجد کی ذمہ داری کی وجہ سے صبح پہونچنا ضروری تھا،صبح فجر سے بہت پہلے مسجد کے ذمہ دار کا فون آیا کہ طیب صاحب راستے میں کسی حادثے کا شکار ہوگئے ہیں، فلاں مقام پر پڑے ہوئے ہیں ،فوری طور پر اہل خاندان حرکت میں آئے ایمبولینس کے ذریعے وہاں سے دواخانہ منتقل کیا گیا، زندگی تو تھی مگر ہوش ختم ہوچکا تھا، حادثے کے

اسباب کا اور حقیقت کا پتہ اب تک بھی نہ چل سکا۔

گاؤں سے نہادھوکر اور بہن کو یہ بتا کر کہ جمعہ کی وجہ سے رک نہیں سکتا، مسجد کی صفائی کرنی ہوتی ہے، دو رکعت نفل پڑھ کے گھر سے نکل گئے، ہمیشہ گھر کے سامنے ہی سے ڈائریکٹ بس میں سوار ہوا کرتے تھے، لیکن جلدی کی وجہ سے بس ڈپو چلے گئے، وہاں سے کونسی بس ملی یا کس صورت کو انہوں نے اختیار کیا اسکا کچھ علم نہ ہوسکا البتہ حیدرآباد سے پچاس کلومیٹر قبل ایک قصبے کے قریب شاہراہ پر پڑے ہوئے پائے گئے، جیب میں سل فون اور رقم اسی طرح موجود تھی، قریب میں ان کا بیاگ پڑا ہوا تھا جس کا سامان جوں کا توں رکھا ہوا تھا؛ کپڑوں پر سڑک کی سیاہی کے چند داغ اور سر پر انتہائی گہرا سوراخ پایا گیا، کسی پولیس والے نے انہی کے سل فون سے متعدد لوگوں کو کال کر کے اطلاع دی، وہ رات ا ربجے کے بعد سے مختلف نمبروں پر اطلاع دیتا رہا مگر فوری طور پر دواخانہ منتقل نہیں کروایا، یہ پولس والوں کی انسانی ہمدردی اور احساس ذمہ داری کا حال ہے، ادھر جن لوگوں کو اطلاع کیا وہ کچھ زیادہ قریبی لوگ نہ تھے، بات سمجھ نہیں پائے، حالانکہ اہلیہ دیر سے فون نہ آنیکی وجہ سے بے چین ومنتظر تھیں مگر ان کو نہ لگ سکا، صبح جب ہاسپٹل میں ایڈمیٹ کیا گیا تو ڈاکٹرز نے بتلایا کہ دماغ کا پانی بہہ چکا ہے، اسلئے علاج بے سود ہے، پھر بھی سرکاری دواخانے میں منتقل کر کے علاج کی ہر ممکن کوشش کی گئی، دماغ کے دو آپریشن ہوئے مگر افاقہ نہ ہونا تھا نہ ہوا، دس دن تک موت وحیات کی کشمکش میں رہ کر بالآخر ۱۱ رشوال ۳۳ھ کو جمعہ کی اولین ساعتوں میں انتقال کر گئے؛ ۱۱ رشوال مدرسہ حاضری کا دن تھا آئے مگر حلہ کفن میں ملبوس اور سفر آخرت کیلئے پا بہ رکاب آئے، بعد نمازِ جمعہ جنازہ ادا کر کے دائرہ سلطان نامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹیاں اور ایک نومولود بچہ شامل ہیں، حق تعالیٰ مغفرت فرمائے اور حسنات کو قبول فرمائے سیئات سے درگذر فرمائے۔ آمین

جناب مصطفیٰ شریف مرحوم

رمضان المبارک سے قبل ایک اجنبی صاحب مصطفیٰ شریف نامی نظام آباد کے چند معروف احباب کو لے کر میرے پاس پہونچے، ایک درخواست لکھ کر لائے جس میں یہ صراحت تھی کہ انہوں نے نظام آباد سے قریب ''نوی پیٹ'' نامی قصبے میں ایک مدرسہ کے قیام کے لئے عمارت تعمیر کروائی ہے اور اب وہ تعلیمی کام کا آغاز کرنا چاہتے ہیں اور اس کی ذمہ داری مجھے دینا چاہتے ہیں؛ تفصیل سننے سے معلوم ہوا کہ وہ اگرچہ اس علاقے کے ہی متوطن ہیں مگر کافی عرصے سے اپنے بھائیوں سمیت ممبئی میں مقیم ہیں، ان کے دادا کہا کرتے تھے کہ علاقے میں دینی سرگرمیوں کا کوئی مرکز ہونا چاہیے مگر وہ یہ کام نہ کر سکے، والد بھی اپنے والد کی اس آرزو کو پورا نہ کر سکے، پوترے کو اس کا خیال آیا اور اللہ پاک نے اسباب بھی عطا فرمائے تو اس جگہ پر کافی وسیع منصوبہ بنا کر مدرسہ قائم کرنے کے لئے اپنے اور اپنے اعزہ واحباب کے سرمائے سے انہوں نے تعمیر کا فی الحال ایک حصہ تیار کر لیا تھا، مگر چونکہ تعلیم وتربیت کا نظم ان کے بس کا نہیں تھا اسلئے انہوں نے متعدد علماء سے مشورہ کیا، اتفاق سے ان سب ہی نے اس عاجز کے پاس جانے کا مشورہ دیا، ان کا کہنا تھا کہ بڑی توقع اور بھرپور امید کے ساتھ آیا ہوں۔

مدارس کی نگرانی وسرپرستی کے سلسلہ میں بڑے تلخ وناقابلِ بیان تجربات کے بعد اس عاجز نے اس شرف سے اپنے کو محروم اور سبکدوش رکھنا ہی پسند کر لیا ہے؛ لوگ حُسنِ ظن کی وجہ سے اب بھی آتے ہیں، لیکن میں یہی کہتا ہوں کہ مجھ سے جو مشورہ کرنا ہے جب کرنا ہے کر لیں، باقی مدرسہ کا نہ سرپرست بنائیں نہ ہی نام کا استعمال کریں، وجہ یہی ہے کہ لوگ آج

کسی کا کہنا ماننا نہیں چاہتے، حسبِ منشا کام کرتے ہیں، اور صرف سرپرستی کے خانے میں کسی کا نام چھاپ لینا چاہتے ہیں۔

خیر! میں نے ان صاحب سے بھی یہی عرض کیا کہ میرے موجودہ کام ہی ہو نہیں پا رہے ہیں مزید کسی کام کی ذمہ داری لینے کے موقف میں نہیں ہوں، آپ کسی اور کے سپرد یہ کام کردیں؛ تاہم ان کا بڑی عاجزی اور لجاجت سے اصرار بڑھتا گیا، ساتھ میں جن لوگوں کو لائے تھے وہ ان کے مخلصانہ جذبے کے حوالے سے برابر سفارش کرتے رہے، میں نے ضلع کے ایک دو علماء سے مشورہ کیا ادھر ان صاحب کو ہمارے دیہی محنتوں کے مرکز نارائن کھیڑ جا کر ایک دن رہنے اور کام کو سمجھنے کا مشورہ دیا۔

غور وخوض اور احباب سے مشورہ کے بعد یہ طئے پایا کہ علاقے کے چند علماء کی مجلسِ شوریٰ بنا کر یہ عاجز بنام خدا وہاں کام کا آغاز کردے، شاید اللہ پاک اپنی قدرت سے اسے علاقہ کے دیہاتوں کیلئے مرکزِ علم وہدایت بنادے، چنانچہ تاریخ دن طئے کر کے احقر اس مقام پر پہونچا، جو انتظامی کمیاں نظر آئیں، ان کی تکمیل کا مشورہ دیا، نیز شوال میں داخلوں اور تعلیم کا آغاز کرنے کا وعدہ کر کے واپس ہوگیا۔

شوال میں آٹھ دس دن تو یہ عاجز ادارہ اشرف العلوم کے آغاز کی تیاریوں میں مصروف رہا پھر گیارہ شوال سے داخلوں کا آغاز ہوگیا، انہی دنوں مولوی طیب مرحوم کا حادثہ بھی پیش آگیا جو ذہن پر ایک بارِ گراں بنا ہوا تھا؛ اِدھر مصطفےٰ شریف صاحب عید کے بعد ہی ممبئی سے نوی پیٹ پہونچ کر تعمیری کاموں کی تکمیل اور آغازِ مدرسہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے، مجھے بار بار یاددہانی کراتے رہے کہ کب آئیں گے؟ اس موقعہ پر مدرسہ سے ہٹنا میرے لئے بہت مشکل مسئلہ تھا، میں ٹالتا رہا، وقت بڑھانے کے لئے میں نے یہ بھی کہا کہ اطراف واکناف میں کوشش کر کے کم از کم پندرہ بچوں کو تو جمع کیجئے، طلبہ ہوں گے تب ہی مدرسہ شروع ہو سکے گا نا؟ دو تین دن بعد ہی انہوں نے اطلاع کی کہ بارہ بچے جمع ہو گئے ہیں اور بہت ہی عاجزی کے ساتھ کہنے لگے، ”صاحب! مجھے شدت سے انتظار ہے میں بس آپ کے لئے ٹھیرا

ہوا ہوں، یہ کام ہو جائے تو واپس ہونا چاہتا ہوں، ذرا مہربانی کیجئے''۔

مجھے بھی مزید اہمال اچھا نہیں لگا، ۲۰ رشوال کو صبح ۱۰ ربجے پہونچنے کا ان سے وعدہ کر کے مولانا ولی اللہ صاحب ناظم مدرسہ مظہر العلوم نظام آباد، مولانا خضر احمد صاحب ناظم مدرسہ انوار المدراس نظام آباد، اور مولانا انصار صاحب امام وخطیب جامع مسجد نوی پیٹ، جناب الطاف صاحب کونسلر نوی پیٹ سے بھی وقت حاصل کر لیا گیا؛ چنانچہ ۲۰ رشوال سنیچر کے دن ۱۰ ربجے مدرسہ پہونچے، موصوف موجود تھے، انہوں نے ہی استقبال کیا اور پورے مدرسہ کا معائنہ کرایا، جو جو کام بتایئے گئے تھے، انہوں نے نہ صرف ان کی تکمیل کر دی تھی بلکہ صفائی ستھرائی بھی عمدہ کرائی تھی، صحن میں درخت لگوائے راستے ہموار کر رکھے تھے؛ مقامی چند احباب کے ساتھ ایک مختصر سی تقریب میں تھوڑی دیر بچوں کو نصیحت کر کے نورانی قاعدہ کا آغاز کر دیا گیا، قریب ہی کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والے مفتی کلیم عادل سلمہ کو نائب ناظم اور مولوی یونس قاسمی سلمہٗ کو مدرس مقرر کر دیا گیا، دعا ہوئی شیرینی تقسیم کی گئی اور مجلسِ افتتاح برخاست ہوئی۔

ظہرانے کے بعد مصطفیٰ شریف صاحب کے ایک عزیز کے مکان پر اس نو قائم مدرسہ کی پہلی مشاورتی نشست منعقد ہوئی، مجلسِ شوریٰ کے لئے علاقے کے چند علماء اور چند مخلصین کے نام طئے پائے، ایک ٹرسٹ بنانا اور اس کے انتظام وانصرام کا اس عاجز کے ہاتھ میں ہونا بالاتفاق طئے پایا؛ مصطفیٰ شریف صاحب میرے بازو ہی بیٹھے ہوئے تھے، میں نے کہا کہ ٹرسٹ اور شوریٰ میں آپ بھی شریک رہیں گے، انہوں نے برجستہ کہا ''اب ہم کو چھٹی دیدیں ہم کو جو کام کرنا تھا وہ ہو گیا'' میں نے کہا نہیں! آپ کو تو رہنا ہی ہوگا، یہ چمن اصلاً آپ ہی کا لگایا ہوا ہے، گو کام ہم کریں گے لیکن آپ سے بھی رائے مشورہ لیتے رہیں گے، اس پر وہ خاموش ہو گئے کچھ جواب نہ دیا؛ میں نے یہ بھی کہا کہ مصطفیٰ شریف صاحب! چونکہ چھوٹے بچوں کا مسئلہ ہے، اس لئے مدرسہ کی باؤنڈری یا فیسنگ کروانا ضروری ہے، کہنے لگے ''اب تک کے کام میں کچھ مقروض بھی ہو گیا ہوں، آگے میں چاہتا ہوں کہ سب ذمہ داری آپ ہی

لوگ لے لیں، مجھ سے جو ہو سکے گا ضرور تعاون کروں گا"۔ اس مجلس کے اختتام پر انہوں نے اپنا فون نمبر لکھوایا اور کہا "ممبئی آنا ہو تو بس ایک فون کر لیں، سواری ایر پورٹ پر پہونچ جائے گی اور میرا گھر میزبانی کے لئے تیار رہے گا"۔ بعد ازاں میں ان سے اجازت لے کر واپس ہو گیا۔

اس رات معلوم ہوا کہ سکون سے آرام کیا، اگلا دن پورا مدرسہ میں گذارا، جن لوگوں سے کام کروایا تھا ان کے حساب کتاب کئے، تمام ذمہ داریوں سے یکسو ہو گئے، معلوم ہوا کہ بہت مسرور و مگن نظر آ رہے تھے، بچوں کے ساتھ ـــــ اگر چہ صحیح نہیں ـــــ گروپ فوٹو کھنچوایا، نائب ناظم، استاذ، باورچی سب سے بغلگیر ہو کر خوب روئے، شام کو واپسی کی تیاری کر کے نوی پیٹ سے نظام آباد بس ڈپو پہونچے، نظام آباد سے حیدر آباد کیلئے روانہ ہو گئے، حیدر آباد سے قریب پہونچنے کے بعد اپنے رشتے کے بھائی کو فون کیا کہ میں آدھے گھنٹے بعد پہونچ رہا ہوں، چوارہے پر آجائیں؛ اس کے چند ہی منٹ بعد بس ڈرائیور نے انہیں فون کیا کہ جن صاحب نے ابھی بات کی تھی ان کی طبیعت بگڑ رہی ہے، بتایا گیا کہ بس اسی طرف آ رہی ہے، آتے رہیں، فوری طور پر ایمبولینس کا انتظام کر کے ان کے بھائی صاحب راستے پر آ گئے، بس رک گئی وہ اپنے بھائی کو لینے کے لئے بس میں چڑھے تو دیکھا کہ ان کی روح پرواز کر چکی ہے، سیدھے دواخانے لے گئے اور دواخانے میں موت کا اطمینان کر کے گھر لے آئے؛ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

معلوم ہوتے ہی احقر بعد نماز فجر ان کے بھائی کے ہاں حاضر ہوا، مصطفیٰ شریف صاحب اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے رب کے حضور حاضر تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ تھک کر سو گئے ہیں، مجھے بار بار ان کا جملہ یاد آ رہا تھا "اب ہماری چھٹی کر دیجئے ہمارا کام ہو چکا" ان کے صاحبزادہ کے ممبئی سے آنے کی اطلاع ملی تو تعزیت کے لئے ٹھہر گیا؛ تھوڑی دیر میں ایر پورٹ سے کار آ کر رکی تو ایک نوجوان بلند قامت و خوبرو نمودار ہوئے، بظاہر عصری تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل معلوم ہوتے تھے مگر کوئی جزع فزع نہیں، جو ملتا وہ انہیں دیکھ کے

رونے لگتا، اعزہ کی چیخیں نکل جاتیں مگر وہ اللہ کا بندہ سب کو ایک ہی جواب دیتا ''ابا کیلئے مغفرت کی دعا کیجئے'' میت کے پاس پہونچے تو بے ساختہ آنسو نکل گئے، چند لمحے ٹھیر کے پلٹے تو حاضرین سے کہا ''ابا کیلئے مغفرت کی دعا کر دیجئے، صبر کیجئے، ہمارا کام صبر کرنا اور اللہ سے راضی رہنا ہے''۔ کسی نے ان سے میرا تعارف کرایا، میں نے کچھ تعزیتی کلمات کہنے چاہے تو اس سے قبل ہی انہوں نے کہا ''مولانا! ابا کو اس مدرسہ کی بہت فکر تھی، بس آپ اس کو جاری رکھئے اور مغفرت کی دعا کرتے رہیے''۔ حیرت ہوئی کہ مصطفیٰ شریف صاحب کے دینی خیالات اور مذہبی احساسات اس قدر پختہ تھے، جس کا اثر ان کے بچے میں جذبات و احساسات کو بے قابو کر دینے والے ایسے مواقع پر بھی صاف نظر آرہے تھے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔

ان کا قائم کردہ مدرسہ ـــــ جس کا نام احسن المدارس تجویز ہوا، اور جس میں اب پینتیس[۱] طلبہ اور دو اساتذہ دن رات قرآن مجید سیکھنے سکھانے میں لگے ہوئے ہیں اور پنجوقتہ اذانیں اور نمازیں ہو رہی ہیں ـــــ انشاء اللہ ان کیلئے صدقۂ جاریہ ثابت ہوگا۔ آمین

قارئین سے بھی گذارش ہے کہ ان کیلئے دعائے مغفرت ورفع درجات وعفوِ سیئات کر دیں اور جو ہو سکے ایصال ثواب بھی! ساتھ ہی اس مدرسہ کے استحکام وترقی کیلئے خاص دعاؤں سے اس عاجز کی مدد فرمائیں کہ بڑی امانت ہے جو اللہ کے اُس بندے نے مرتے مرتے اس عاجز کے حوالے کی ہے؛ واللہ المستعان وعلیہ التکلان

---

[۱] اور اس وقت ماشاء اللہ سے اسّی طلبہ زیر تعلیم ہیں؛ ان کے علاوہ مکاتب میں کوئی ڈھائی سو طلبہ وطالبات اس مدرسے سے استفادہ کر رہے ہیں؛ الحمد للہ شاندار مسجد بھی تعمیر ہو چکی ہے۔